

خطبہ

حضرت فاطمہ زہراء (سلام اللہ علیہا)

اور

واقعہ فدک

فقیہ عابد القدر

حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری دامت برکاتہ

297.38015

UN



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

خطبہ
حضرت فاطمہ زہراء (سلام اللہ علیہا)
اور
واقعہ فدک

فقیہ عالمی
حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری دامت برکاتہ

● خطبہ

حضرت زہراء (سلام اللہ علیہا)

○ ناشر: م۔ ف۔ ا۔ خ۔ (C.C.I.K.)

○ تاریخ اشاعت: ۱۹۹۶

○ قیمت: - / ۱۲۵ روپے

انتساب

اس ناچیز خدمت کو
اسلام کی واحد عظیم الشان خاتون صدیقہ طاہرہ
حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا
کی بارگاہ مقدس میں پیش کرتا ہوں۔

فہرست

پیش لفظ

○ حصہ اول

مسجد نبوی (ص) میں مسلمانوں سے حضرت زہراء (ع) کا خطاب

○ پہلا درس

خطبے کی سند

فاطمہ (ع) کس شان سے مسجد گئیں

خطبہ کے لئے تیاری

حضرت زہراء (ع) اور حاضرین کا شدید گریہ

○ دوسرا درس

گزشتہ درس کا خلاصہ

شکر الہی کے ساتھ کا آغاز

خدا کی بے شمار نعمتیں

شکر نعمت اور نعمتوں کی بقاء اور فراوانی

اخلاص، توحید کا ثمر ہے

۳۳
۳۶
۳۸
۳۹
۵۱/
۵۷
۵۸
۵۹
۶۱
۶۲
۶۳
۶۷
۷۰
۷۱
۷۲
۷۵
۷۶

توحید کے ادراک میں افراد کا اختلاف

خدا، ایک ناشناختہ حقیقت

کائنات کی خلقت

ہدف خلقت

فلسفہ ثواب و عقاب

✽ تیسرا درس:

مقام بندگی، مقام رسالت کا سبب ہے

رسالت سے قبل کے مقامات

تورات اور انجیل کی پیشین گوئی

خلقت کائنات سے قبل، پیغمبر اکرم (س) کا انتخاب

کائنات کے بارے میں خدا کا علم ازلی

رسالت پیغمبر (س) کے مقاصد

عصر بعثت کی معاشرتی اور مذہبی صورت حال

انسانوں کی ہدایت کے لئے پیغمبر (س) کا قیام

رسول خدا (س) کی رحلت

سامعین سے خطاب

قرآن اور سنت پیغمبر (س) کی دو یادگار چیزیں

ہدایت کرنے والی قرآنی خصوصیات

✽ چوتھا درس:

فلسفہ احکام الہی

ایمان اور نماز

۸۷	۲۔ زکات
۸۸	۳۔ روزہ
۸۹	۴۔ حج
۹۰	۵۔ عدالت
۹۰	۶۔ اہل بیت (ع) کی امانت
۹۱	۷۔ جہاد اور صبر
۹۳	۸۔ امر بالمعروف
۹۳	۹۔ والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحم
۹۶	۱۰۔ قصاص
۹۶	۱۱۔ نذر پوری کرنا
۹۷	۱۲۔ معاملات میں عدل و انصاف
۹۸	۱۳۔ شراب کی حرمت
۹۸	۱۴۔ قذف کی حرمت
۹۹	۱۵۔ چوری کی حرمت
۱۰۰	۱۶۔ شرک کی حرمت
۱۰۱	تقویٰ کی وصیت
۱۰۲	خدا کی معرفت اور علم کا رابطہ
۱۰۳	اپنی اور اپنے پدر بزرگوار کی شخصیت کا تعارف
۱۰۵	پیغمبر اسلام (ص) اور حضرت علی (ع) کی اخوت اور ہمبستگی
۱۰۶	آغاز رسالت کی کیفیت
۱۰۸	دعوت کے تین مراحل

۱۰۹

پنجمبر اس کی بت شکنی

۱۱۰

توحید کا پرچار اور کفر کا خاتمہ

۱۱۱

مناقت اور کفر کی شکست

○ پانچواں درس :

زمانہ جاہلیت میں جزیرۃ العرب میں انحطاط و پستی کے چند نمونے :

۱۱۷

۱۔ معنوی کمزوری

۱۱۸

۲۔ سیاسی اور معاشرتی کمزوریاں

۱۲۰

۳۔ معاشی کمزوری

۱۲۱

۴۔ نفسیاتی کمزوری

۱۲۲

پنجمبر (س) کے ذریعے انسانیت کی نجات

۱۲۵

اسلام کی ترویج میں حضرت علی (ع) کا کردار

۱۲۶

مختلف جنگی محاذوں میں حضرت علی (ع) کی دلیری اور شجاعت کے نمونے

۱۲۷

امیر المؤمنین (ع) کی چند خصوصیات

۱۲۹

کل کے گوشہ نشین، آج کے مفاد پرست

۱۳۱

مفاد پرستوں کی خصوصیات

۱۳۳

رحلت پنجمبر (س) اور اس کے اثرات

۱۳۷

گھات میں بیٹھے ہوئے شیطان صفت لوگ

۱۳۸

بے وقوف تابعدار

○ چھٹا درس :

۱۳۳

گزشتہ درس کا خلاصہ

۱۳۶

سقیفہ کی واقعی صورت حال

۱۳۸

سقیفہ کے دوران حقائق کی تبدیلی

۱۵۰

عوام، سیاسی کھلونے

۱۵۰

قرآن میں رہبر کے شرائط

۱۵۲

قرآن کی چند خصوصیات

۱۵۳

قرآن، راہنمائے فکر و عمل

○ ساتواں درس :

۱۵۹

خلیفہ تراشی اور اقدار کی تبدیلی

۱۶۱

مکر و فریب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ

۱۶۲

دوستی کے انداز میں دشمنی

۱۶۳

سختیوں پر صبر

۱۶۵

فدک، میراث پیغمبر (م)

۱۶۸

آیات ارث اور انبیاء (ع)

۱۶۱

آیات ارث کے سمجھنے میں غلط فہمی کی وجوہات

۱۶۳

ارث کے مسئلے پر اتنی تاکید کیوں؟

۱۶۳

ارث سے آپ (ع) کی مراد کیا ہے؟

۱۶۶

حضرت زہراء (ع) کی ابو بکر کو دارنگ

○ آٹھواں درس :

۱۸۵

انصار سے کچھ باتیں

۱۸۸

سیاست اور موقف میں تبدیلی

۱۹۱

رحلت رسول (م) کے معاشرتی اثرات

۱۹۳

قرآن میں رحلت رسول (م) کی پیش گوئی

۱۹۷

خدا کا قانون موت اور انبیاء (ع)

۲۰۰

انصار سے حضرت زہراء (ع) کا شکوہ

۲۰۲

انصار کی مجاہدانہ خدمات

✽ نواں درس :

۲۰۷

اسلام کی کامیابی میں اہل بیت (ع) کا کردار

۲۱۰

انقلاب کے بعد رجعت پسندی کے آثار

۲۱۲

اعتدال پسند اور عسکری شکن افراد کا انجام

۲۱۳

خاموشی کی وجہ دنیا پرستی اور راحت طلبی ہے

۲۱۵

جاہلیت کی طرف بازگشت

۲۱۷

سوز دل اور اتمام حجت

۲۲۱

سازش کے خاتمے کی تصویر کشی

✽ دسواں درس :

۲۲۷

گزشتہ بحث کا خلاصہ

۲۲۸

ابوبکر کی ریاکارانہ باتیں

۲۳۰

ابوبکر کی زبانی، عترت رسول (ص) کا مقام

۲۳۳

غضب فدک کی عوام فریبانہ توجیہ

۲۳۶

ملت کا ارادہ یا پانچ آدمیوں کی ذاتی خواہش؟

۲۳۸

ابوبکر کو حضرت فاطمہ (ع) کا جواب

۲۴۰

سقیفہ کے سرداروں کی خیانت

۲۴۱

دشمنوں کے شبہات اور قرآن

۲۴۳

ابوبکر کا نیا حربہ

○ گیارہواں درس :

۲۳۹

گزشتہ درس کا خلاصہ

۲۳۹

لوگوں کی دوبارہ مذمت

۲۵۲

امامت کی راہ میں تحریف اور اس کا مستقبل

۲۵۶

بابا کے روضے پر درد دل کا بیان

○ بارہواں درس :

۲۶۵

حضرت علی (ع) حضرت زہراء (ع) کے انتظار میں

۲۶۶

حضرت علی (ع) کے حضور سوز دل کا بیان

۲۶۸

حکومت کے حضرت زہراء (ع) کے ساتھ عناد اور دشمنی کی تصویر کشی

۲۷۰

عام لوگوں کی بے توجہی کو مجسم کرنا

۲۷۲

جہاد کی سی خاموشی

۲۷۳

حضرت علی (ع) کی مظلومیت اور اسلام کی مصلحت

۲۷۶

اہل بیت (ع) کی مظلومیت اور بے کسی کی انتہاء

۲۷۷

بابا کے حضور شکایت اور بارگاہ خداوندی میں مناجات

۲۷۸

حضرت علی (ع) کا حضرت زہراء (ع) کو تسلی دینا

۲۸۱

حضرت علی (ع) کے حضور حضرت زہراء (ع) کے درد دل کا ایک تجزیہ

۲۸۳

فدک کے بارے میں حضرت زہراء (ع) کے اصرار کا فلسفہ

۲۸۵

ایک عرب شاعر کی زبانی، انصار اور مہاجرین کے سکوت کی تصویر کشی

○ حصہ دوئم :

✓ بستر شہادت پر انصار و مہاجرین کی عورتوں سے حضرت زہراء (ع) کا خطاب

○ تیرہواں درس :

۲۹۱	خطبے کی سند
۲۹۲	انصار اور مہاجرین کی عورتوں کا حضرت زہراء (ع) کی عیادت کرنا
۲۹۳	لوگوں کی بے وفائی کی ایک جھلک
۲۹۵	مذہب اور سیاست کے کھلاڑی
۲۹۷	فکری کمزوری اور آراء کا اختلاف
۲۹۸	حکومت کی بد عنوانی کے مقابلے میں عوام کی ذمہ داری
۳۰۱	شاہراہ امامت سے انحراف کا آغاز
۳۰۳	اصحاب سقیفہ کے سیاسی مقاصد
	○ چودھواں درس
۳۰۹	گزشتہ درس کا خلاصہ
۳۰۹	حضرت علی (ع) کی برحق حکومت کی چند خصوصیات
۳۱۲	عوام کے لئے حکومت کے چند مفید پروگرام
۳۱۳	بیت المال مسلمین اور حکومت
۳۱۵	اقتدار کے بھوکے اور خدمت کے شیدائی
۳۱۶	ظلم اور کفران نعمت
۳۱۹	اصحاب سقیفہ کی پھر مذمت
۳۲۲	سقیفہ کی کاروائی کی ایک جھلک
۳۲۳	مستقبل کے انحرافات کی پیش گوئی
۳۲۵	سقیفہ کے بعد لوگوں کی بد حالی کی پیش گوئی
۳۲۶	سقیفہ کے بعد رونما ہونے والے فتنوں کی خبر
۳۲۸	انصار و مہاجرین کی حضرت زہراء (ع) سے عذر خواہی

○ حصہ سوئم ،

حضرت امام جعفر صادق (ع) کی زبانی غصب فدک کی کہانی

○ پندرہواں درس ،

روایت کی سند

۳۳۷

۳۳۰

۳۳۲

۳۳۳

۳۳۸

۳۵۲

۳۵۵

صادق آل محمد (ع) فرماتے ہیں

ابو بکر سے حضرت زہراء (ع) کا احتجاج

فدک امامت کی نشانی

فدک اور ام ایمن کی گواہی

فدک اور حضرت علی (ع) کا ابو بکر کی سرزنش کرنا

ابو بکر کے مقابلے میں حضرت علی (ع) کا استدلال

○ سولہواں درس :

گزشتہ درس پر ایک نظر

۳۶۳

۳۶۳

۳۶۷

۳۶۸

۳۷۰

۳۷۲

۳۷۳

۳۷۵

حضرت امیر المؤمنین (ع) کی ابو بکر سے وضاحت طلبی

لوگوں میں فکری اعتبار سے تبدیلی

حضرت فاطمہ زہراء (ع) کا اپنے بابا (ص) کے مزار پر سوز اور گریہ

حضرت امیر المؤمنین (ع) کے قتل کی سازش

سازش قتل کا انکشاف

نماز کی حالت میں ابو بکر کا تردد اور پشیمانی

حضرت امیر المؤمنین (ع) کی عمر کو دھمکی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

فاطمۃ الزہراء علیہا السلام ایک ایسی خاتون تھیں
کہ جنہوں نے ایک سادہ گھر اور چھوٹے سے کمرے
میں ایسی ہستیوں کی تربیت کی کہ جن کا نور ارض
خاک سے افلاک تک اور عالم ملک سے لے کر عالم
ملکوت تک چمک اٹھا۔

امام خمینی (قدس اللہ سرہ)

تاریخ بشریت اس حقیقت کی گواہ ہے کہ "حق و باطل"، "مؤمن اور مشرک" اور "ظالم و مظلوم" کے یہ دو گروہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے مقابلے میں رہے ہیں، اس باہمی کشمکش میں اہل حق، "ایمان، حقیقت اور سچائی" کے ہتھیار سے مسلح رہے تو باطل گروہ "ڈراؤ دھمکاؤ، لالچ اور مکر و فریب" سے کام لیتے رہے۔

تاریخ اسلام کے چودہ سو سالہ عرصے میں بھی ان دو گروہوں کے درمیان معرکہ آرائی کے نمایاں نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ قارون صفت دنیا کے دلدادہ افراد نے جب دیکھا کہ اسلام ان کے مفادات کے لئے خطرے کا موجب بن رہا ہے تو اپنی تمام تر طاقت اور فریب کاری کے ساتھ ایک ایسے گروہ کے مقابلے میں اتر آئے جو خدا پرست تھا اور خدا کے علاوہ کسی کے سامنے جھکنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ لہذا مسلمانوں بلکہ خود پیغمبر اسلام (ص) کو بھی آزار و اذیت اور شکنجوں کے ذریعے اپنے ہدف سے دور رکھنے کی کوشش کی لیکن خداوند، یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ان کی کوئی نہ چلے اور حق والے کامیاب و کامران ہو جائیں۔

صدر اسلام کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ وہی لوگ جو پیغمبر اسلام (ص) سے دیرینہ دشمنی رکھتے تھے اور اسلام کی ترویج اور گسترش کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتے تھے، جلدی سے رنگ بدلنے لگے اور ایک نیا محاذ کھول کر اسلام کے حقیقی مجاہدوں کے خلاف مبارزہ شروع کرنے لگے۔ اس دفعہ یہ لوگ اسلام اور رسول خدا (ص) کا نام لے کر اسلام کو سرے سے ہی ختم کرنا چاہتے تھے لہذا انحراف اور گمراہی کی ایسی بنیاد رکھی کہ آج تک مسلمان اس انحراف کا خمیازہ بھگت رہے ہیں اور اس چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلمان جتنی مشکلات اور بحرانوں کا شکار ہوئے ہیں وہ انہی واقعات کا کڑوا پھل تھا جو پیغمبر اسلام (ص) کی رحلت کے بعد رونما ہوئے ہیں۔

(انحراف اور گمراہی کی) اس جدید محاذ آرائی میں مؤمنین اور مخلص مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق لوگوں کو آگاہ کریں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں اور امامت و ولایت کی حمایت اور اس کا دفاع کریں اور اس فریضہ کی ادائیگی میں حضرت فاطمہ الزہراء علیہا السلام نے

نمایاں، کردار ادا کیا ہے۔

رحلت رسول (ص) کے بعد رونما ہونے والے اس عظیم انحراف کے مقابلے میں اسلام کی اس عظیم خاتون نے جو کوششیں کیں (ان میں سے اہم ترین اقدامات) یہ ہیں:

حساس موقعوں پر حضرت امیر المؤمنین (ع) کی حمایت کرنا، آتشیں اور روشنگر خطبات

بیان فرمانا، منافقت اور دوروی کے چہرے کو بے نقاب کرنا، مسلمانوں کو قرآن کی

آیات اور رسول خدا (ص) کی فرمائشات سے آگاہ کرنا اور یاد دلانا وغیرہ وغیرہ۔

اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام کی سیرت و کردار سے آگاہی اور انسانیت کو اس سے آگاہ

کرنا ایک ایسی ذمہ داری ہے کہ جسے علماء اور اہل تحقیق کو سونپا گیا ہے لہذا ان پر فرض ہے کہ ان عظیم ہستیوں کے پیغام حق خواہی کو تمام انسانوں تک پہنچانے کے لئے انتھک کوشش کریں۔

اسی ذمہ داری کی بنا پر حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری مدظلہ العالی بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ حوزہ

علمیہ کے دوسرے (مروجہ) دروس کے ساتھ ساتھ، نبج البلاغہ، اصول کافی اور حضرت زہراء سلام اللہ

علیہا کے خطبہ کا بھی درس دیا جائے۔ لہذا وہ اپنے قیمتی وقت میں سے روزانہ کچھ وقت، ان زرین اقوال

کی تدریس اور تشریح کے لئے مختص کرتے ہیں تاکہ ہر انسان اس سے استفادہ کر سکے۔

عام فہم اور سلیس و آسان بیان نیز غیر مائوس الفاظ کے استعمال سے اجتناب آپ کے دروس کی

خصوصیات میں سے ہیں۔

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے دراصل ان دروسوں کا مجموعہ ہے جسے جناب استاد محترم

حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری دام ظلہ (۱۳۷۲ھ ش / ۱۹۹۳ء) کے ایام فاطمیہ میں حضرت فاطمہ

زہراء (ع) کے خطبے کی تشریح اور وضاحت میں بیان فرمایا۔

یہ کتاب سولہ دروس پر مشتمل ہے جو تین حصوں میں پیش کی جاتی ہے:

پہلا حصہ: مسجد نبوی میں حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کا خطبہ۔

دوسرا حصہ: بستر شہادت پر انصار و مہاجرین کی عورتوں سے آپ کا خطاب۔

تیسرا حصہ: امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبانی، غصب فدک کا واقعہ۔

جیسا کہ کہا گیا ہے، یہاں جو توضیح اور تشریح دی گئی ہے وہ وسیع تحقیق اور مکمل شرح نہیں بلکہ (ایام فاطمیہ میں) عام استفادہ کے لئے عام سامعین کو مد نظر رکھ کر بیان کیا گیا ہے۔ اسی لئے (فقہ عالیقدر حضرت آیت اللہ العظمیٰ منتظری) ابتداء میں اس کے چھاپنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے لیکن چند جمید علماء کے اصرار پر آپ نے چھاپنے کی اجازت دیدی تاکہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد، حضرت زہراء (ع) کے بیانات سے آگاہ ہو سکیں اور رسول خدا (ص) کے بعد معاشرے میں اہل بیت (ع) کی مظلومیت اور اجتماعی مقام کا ادراک کر سکیں۔

آپ کی تقاریر کو کتابی شکل میں اس امید کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے کہ یہ حقیر سی خدمت درگاہ خداوندی میں مورد قبول واقع ہو اور اہل بیت عصمت و طہارت (ع) کی تعلیمات کی روشنی میں ہمارا یہ اسلامی معاشرہ خوشنختی اور کمال کی راہ پر گامزن ہو۔

ناشر

حصہ اول

① مسجد نبوی (ص) میں

موجود مسلمانوں سے

حضرت زہراء علیہا السلام کا خطاب

پہلا درس:

- خطبے کی سند
- حضرت فاطمہ (ع) کس شان سے مسجد گئیں
- خطبہ کے لئے تیاری
- حضرت زہراء (ع) اور حاضرین کا شدید گریہ

رَوَى عَبْدُ اللَّهِ بْنُ الْحَسَنِ بِإِسْنَادِهِ عَنْ آبَائِهِ عليهم السلام:

أَنَّهُ لَمَّا أَجْمَعَ [إِجْتَمَعَ] أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ عَلَى مَنَعِ فَاطِمَةَ عليها السلام فَذَكَأَ، وَبَلَّغَهَا ذَلِكَ، لَأْتُتْ خِمَارَهَا عَلَى رَأْسِهَا وَاشْتَمَلَتْ بِجِلْبَابِهَا، وَاقْبَلَتْ فِي لُحْمَةٍ مِنْ حَقْدَتَيْهَا وَنِسَاءِ قَوْمِهَا، تَطَأُ ذُبُولَهَا، مَا تَحْرُمُ مِشْيَتَهَا مِشْيَةُ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وآله، حَتَّى دَخَلَتْ عَلَى أَبِي بَكْرٍ وَهُوَ فِي حَشْدٍ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَغَيْرِهِمْ، فَنِيطَتْ دُونَهَا مَلَأَةٌ، فَجَلَسَتْ؛ ثُمَّ أَتَتْ أَنَّهُ أَجْهَشَ الْقَوْمُ لَهَا بِالْبُكَاءِ، فَارْتَجَّ الْمَجْلِسُ؛ ثُمَّ أَمْهَلَتْ هُنَيْئَةً، حَتَّى إِذَا سَكَنَ نَشِيجُ الْقَوْمِ وَهَدَأَتْ فُورَتَهُمْ؛ فَتَشَحَّتِ الْكَلَامَ بِحَمْدِ اللَّهِ تَعَالَى وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ وَالصَّلَاةِ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وآله؛ فَعَاذَ الْقَوْمُ فِي بُكَائِهِمْ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم
وبہ نستعین

خطبے کی سند:

حضرت زہراء (ع) نے مسجد نبوی میں جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ مختلف کتابوں میں کئی اسناد کے ساتھ نقل ہوا ہے، جسے ہم مختصراً ذکر کرتے ہیں:

۱۔ بحار الانوار (تالیف) علامہ مجلسی قدس سرہ،

بحار الانوار میں علامہ مجلسی قدس سرہ نے فدک سے مربوط باب میں اس خطبہ کے لئے ایک مستقل فصل لکھی ہے اور فرماتے ہیں کہ:

”یہ خطبہ ان مشہور اور معروف خطبات میں سے ایک ہے جسے شیعہ و سنی دونوں نے مختلف اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے (۱)“ علامہ مجلسی فرماتے ہیں کہ یہ خطبہ معمولی سے فرق کے ساتھ احمد بن ابی طاہر کی کتاب ”بلاغات النساء“ میں ذکر ہوا ہے اور احمد بن ابی طاہر نے اس خطبہ کی سند میں شک و شبہ کرنے والوں کو جواب دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

”خاندان ابوطالب کی بزرگ ہستیوں نے اپنے آباء و اجداد سے اس خطبہ کو نقل کیا ہے اور وہ اپنی اولاد کو اس کی تعلیم دیتے تھے (۲)“

۱۔ ۲۔ بحار الانوار طبع قدیم ج ۸ ص ۱۰۸ اور اس کے بعد۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ (تالیف ابن ابی الحدید)

ابن ابی الحدید نے نہج البلاغہ کی اپنی شرح میں عثمان بن حنیف کے نام حضرت علی (ع) کے مکتوب جس میں فدک کا ذکر ہوا ہے، کے ضمن میں اس خطبے کو "ثقیفہ وفدک" نامی کتاب (۱) سے نقل کیا ہے جہاں اس خطبے کی کئی اسناد ذکر کی گئی ہیں (۲) ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ میں نے اس خطبہ کی سند کو شیعوں کی کتب سے نقل نہیں کیا بلکہ اہل سنت کی کتابوں سے ہی نقل کیا ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ فدک صرف شیعوں سے مربوط نہیں بلکہ ایک مسلم اور حقیقی واقعہ ہے جو تمام مسلمانوں کے ساتھ مربوط ہے۔

"ثقیفہ وفدک" کا مؤلف ابوبکر احمد بن عبدالعزیز (جوہری) بھی اس خطبہ کے لئے بہت ساری اسناد نقل کرتا ہے اور ان میں سے ایک سند "عبداللہ بن حسن" کی سند ہے اور یہ (عبداللہ بن حسن) عبداللہ محض کے نام سے مشہور ہے۔

عبداللہ محض چونکہ خود والد گرامی اور والدہ ماجدہ دونوں طرف سے سید تھے، آپ حسن ثنی کے فرزند تھے اور حسن ثنی بھی حضرت امام حسن مجتبیٰ (ع) کے فرزند ہیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت امام حسین (ع) کی صاحبزادی تھیں لہذا آپ امام حسن (ع) کے پوتے اور امام حسین (ع) کے نواسے تھے۔ اسی بنا پر آپ عبداللہ محض کے نام سے مشہور و معروف تھے۔

آپ منصور (دوانیقی) کے دور میں زندان میں مقید ہوئے اور اسی زندان میں آپ نے وفات پائی۔

محمد نفس زکیہ اور ابراہیم آپ کے فرزند تھے جنہوں نے منصور کے دور خلافت میں قیام کیا اور اس کے حکم سے شہید کیے گئے۔

۳۔ احتجاج طبرسی (رحمۃ اللہ علیہ)

جن کتابوں میں حضرت زہراء (ع) کے خطاب کا ذکر ہوا ہے ان میں سے ایک مرحوم طبرسی (۷)۔

۱۔ یہ کتاب ابوبکر احمد بن عبدالعزیز جوہری کی ہے اور وہ خود اہل سنت کے بزرگ علماء میں سے ہیں۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۱، ص ۲۱۱۔

کی کتاب احتجاج ہے (۱) انہوں نے بھی اس خطبہ کو عبد اللہ محض سے نقل کیا ہے۔
 یہاں پر ہم (یہ خطبہ) کتاب احتجاج کے نقل کے مطابق ذکر کریں گے۔
 احتجاج میں ذکر ہے کہ:

”روى عبد الله بن الحسن باسناد لا عن آباءه عليهم السلام،

انه لما جمع اجتمع (۲) ابو بكر وعمر علي منع فاطمة عليها السلام فدكاً، وبلغها ذلك...”

فاطمہ (ع) کس شان سے مسجد گئیں:

عبد اللہ بن حسن اپنے آباء سے نقل کرتے ہیں کہ جب ابو بکر اور عمر نے فیصلہ کیا کہ حضرت
 زہراء (ع) سے فدک چھینا جائے تو اس کی اطلاع جب حضرت زہراء (ع) کو ملی (اور آپ نے فیصلہ کیا کہ
 صدائے احتجاج بلند کی جائے لہذا مسجد میں تشریف لے جانے کے لئے آمادہ ہوئیں اور)

”لائت خمارها على راسها“

(آپ نے سر پر چادر رکھی)

”خمار“ ایسی چادر ہے جس سے عورتیں اپنے سر، گردن اور سینے کا پردہ کرتی ہیں اور خمار معمولی
 چادر سے جو صرف سر کو چھپاتی ہے کسی حد تک بڑی ہوتی ہے۔ سورۃ نور کی آیت ۳۱ میں بھی یہی مراد
 ہے۔ جہاں پر ارشاد خداوندی ہے کہ: ”وليضربن بخمرهن على جيوبهن“ (یعنی اپنی چادروں کو
 اس طرح پھینکیں کہ گردن اور سینے کا بھی پردہ ہو جائے) اور خمر لفظ خمار کی جمع ہے۔

۱۔ کتاب احتجاج طبری ج ۱ ص ۲۵۳ (اسوہ پبلیکیشنز) بعض بزرگ اس کتاب کو مرحوم شیخ ابی علی طبریؒ مؤلف تفسیر مجمع البیان کی
 طرف نسبت دیتے ہیں لیکن علامہ مجلسیؒ بحار الانوار کے مقدمات (۹/۱) میں فرماتے ہیں کہ یہ کتاب ابو منصور احمد بن علی بن ابی طالب
 الطبریؒ کی تالیف ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب احتجاج کو مجمع البیان کے مؤلف کی طرف منسوب کرنا غلطی کی وجہ سے ہوا ہے جو
 حضرات مزید تحقیق کے خواہاں ہوں تو وہ اسوہ پبلیکیشنز کی طبع کردہ کتاب احتجاج کے مقدمہ کی طرف رجوع کریں وہاں پر حضرت آیت
 اللہ جعفر سبحانی کی اس سلسلے میں تحقیق بھی موجود ہے۔

۲۔ بعض نسخوں میں جمع کے بجائے اجتماع آیا ہے لیکن ظاہراً جمع صحیح ہے۔

”خمر“ اصل میں لباس اور ڈھانپنے والی چیز کو کہا جاتا ہے۔ شراب کو بھی خمر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے پینے سے انسان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جنگل کے درختوں کو بھی خمر کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سطح زمین کو ڈھانپ لیتے ہیں اور چھپا دیتے ہیں (۱)۔

”لاٹ“ اور ”لوٹ“ کے معنی ہیں باندھنا، پہننا۔ ”لاٹ العمامہ علی راسہ“ یعنی اس نے اپنے سر پر عمامہ باندھا۔ چونکہ اس عبارت میں ”خمار“ کا بھی ذکر ہوا ہے ”لاٹت خمارھا علی راسھا“ کے معنی یہ ہوں گے کہ آپؐ نے مقعدہ پہنا۔ یعنی ایک ایسی چادر پہن لی جو آپؐ کے سر، گردن اور سینے کو مکمل طور پر ڈھانپ لیتی تھی۔

”واشتملت بجلبابھا“

(آپؐ نے اپنے برقعہ کو زیب تن فرمایا)

”جلباب“ جس کی جمع ”جلباب“ ہے، عربی میں ایسے لباس کو کہا جاتا ہے جو عربوں کی لمبی قمیص یا عبا کی طرح پورے بدن کو ڈھانپ لے۔ بنا بریں ”واشتملت بجلبابھا“ کے یہ معنی ہوں گے کہ آپؐ نے ایک ایسی چادر زیب تن فرمائی جو پورے بدن کو سر سے پاؤں تک چھپا لیتی تھی۔

”واقبلت فی لمة“

(اور آپؐ اپنے سے ہم آہنگ گروہ کے ساتھ مسجد میں تشریف لائیں)

اہل لغت نے ”لمۃ“ کو دو طریقے سے پڑھا ہے۔ کتاب قاموس میں تشدید کے ساتھ ”لمۃ“ ذکر ہوا ہے جو ہم عمر جماعت یا گروہ کو کہا جاتا ہے اور دوسروں نے ”لمۃ“ تشدید کے بغیر نقل کیا ہے۔ اس صورت میں یہ لفظ ”لومۃ“ اور ”لام“ سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں ”ملائم“ اور یہ ایسے افراد کو کہا جاتا ہے جو ایک دوسرے سے ہم فکر، ہم آہنگ اور ایک ہی نظریہ کے حامل ہوں۔

اہل لغت کی اس توضیح کے مطابق مذکورہ جملے کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت زہراء (ع) ایسی

۱۔ لسان العرب ج ۴ ص ۲۵۶، ۲۵۷ اور راغب اصفہانی اپنی کتاب مفردات ص ۲۹۸ میں کہتے ہیں کہ: خمر کا اصل معنی کسی چیز کو چھپانا ہے اور چھپانے والی چیز کو خمار کہا جاتا ہے لیکن عرف میں خمار اس چادر کا نام ہے جس سے عورتیں اپنے سر کو چھپاتی ہیں۔ اس لفظ کی جمع خمر ہے۔

حالت میں مسجد کی طرف روانہ ہونیں کہ ہم عمر مستورات یا ہم فکر اور نظریاتی طور پر ہم آہنگ خواتین کی ایک جماعت آپ کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھیں۔

”من حفتہا ونساء قومہا“

(اپنے مددگاروں اور خاندان کی خواتین کی ایک جماعت کے ہمراہ آپ مسجد کی طرف روانہ ہونیں)
(من حفتہا لفظ لہ کی توضیح اور تشریح کے لئے بیان ہوا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی ہمفکر اور نظریاتی طور پر موافق خواتین کے ہمراہ مسجد میں گئیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آپ کی ظاہری شخصیت محفوظ رہے اور آپ کا ظاہری مقام و منزلت بھی محفوظ رہے (۱)۔

”تطا ذیولہا“

(برقعے کے دامن پر قدم مبارک رکھتے جا رہی تھیں)
یعنی چلتے وقت آپ کی چادر کا نچلا حصہ آپ کے قدموں کے نیچے آ رہا تھا اور آپ اس پر جلدی یا چادر کے لمبے ہونے کی وجہ سے قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔
یہاں دو احتمال پائے جاتے ہیں:

۱۔ چونکہ آپ (ابوبکر و عمر کے اقدام سے) پریشان اور مضطرب تھیں اور آپ جلدی اور شتاب زدہ مسجد کی طرف جا رہی تھیں لہذا عجلت کی وجہ سے آپ چادر پر قدم رکھتے ہوئے جا رہی تھیں چونکہ عموماً عورتوں کو جب کسی کام میں جلدی ہوتی ہے تو وہ اپنی چادر اور قمیص کو گھسیٹتے ہوئے اور اس پر قدم رکھتے ہوئے چلی جاتی ہیں۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ (چونکہ عفت و حجاب کے پیش نظر) آپ کا لباس کافی بلند اور لمبا تھا جس کی وجہ سے کبھی کبھار چلتے ہوئے آپ کا قدم مبارک برقعے پر پڑتا تھا۔

۱۔ اگرچہ اولیاء اور بزرگان دین کی شخصیت، مال اور دنیوی مقام سے بے نیاز اور بلند و بالا ہے لیکن جب فردی مسائل سے متاثر ہو کر حق و باطل کے مقابلے میں مبارزے کا مسئلہ ہو تو وہاں حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ بزرگان دین بھی ظاہری امور پر توجہ دیں اور یہ توجہ صرف حق و عدالت کے احترام کے لئے ہوتی ہے ورنہ اولیاء کا مقام ایسی ظاہری چیزوں سے پاک و منزہ ہے۔

بہر صورت جب آپؐ مسجد کی طرف تشریف لے جا رہی تھیں تو جلدی یا چادر لمبے ہونے کی وجہ سے چادر آپؐ کے قدموں کے نیچے آ رہی تھی اور آپؐ اس پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھیں۔

”ما تخرم مشیتہا مشیۃ رسول اللہ (ص)“

(آپؐ کے چلنے کا انداز رسول خدا (ص) کے چلنے کے انداز اور طریقے سے کسی طرح کم نہ تھا) ”خرم“ کم کرنا، چھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور ”مشیتہ“ فعلہ کے وزن پر (مصدر نوعی) ہے جو کسی کام کی حالت یا ہیئت کو بیان کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور فعلہ کا وزن کسی کام کی تعداد اور مقدار کو بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ ”جلسہ“ بیٹھنے کے مخصوص انداز اور ”جلسہ“ بیٹھنے کی تعداد اور دفعات کو بیان کرتا ہے۔

بنابریں یہاں پر بھی ”مشیتہ“ آپؐ کے چلنے کے مخصوص انداز اور شکل کو بیان کرتا ہے کہ وقار و عظمت اور متانت کے لحاظ سے آپؐ کے چلنے کے انداز اور رسول خدا (ص) کے چلنے کے انداز میں کوئی فرق نہ تھا اور آپؐ رسول خدا (ص) سے مکمل شباهت رکھتی تھیں (۱)۔

خطاب کے لئے تیاری:

”حتی دخلت علی ابی بکر و هو فی حشد من المهاجرین والانصار و غیرہم“

(یہاں تک کہ آپؐ اس حالت میں ابو بکر پر وارد ہوئیں کہ وہ

بہت سے مہاجرین و انصار اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا)

”حشد“ بڑے مجمع کو کہا جاتا ہے۔ یعنی مہاجرین و انصار اور دوسرے مسلمانوں کے بہت سے لوگ

اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے چونکہ اب وہ ”خلیفہ“ بن چکا تھا اور اب وہ ایک شخصیت بن چکا تھا۔

۱۔ دوسرا احتمال صحیح نظر آتا ہے چونکہ جلدی اور عجلت آپؐ کی عظمت اور وقار کے منافی ہے علاوہ ازیں عرب کی صاحب حمیت اور عقیف خواہن کا برقع لمبا ہوتا تھا کہ اسے زمین پر گھسٹتے جاتی تھیں۔ نیز پیغمبر اکرمؐ بھی آہستہ آہستہ چلتے تھے نہ کہ عجلت اور جلدی میں۔

”فنیطت دونہا ملاءة“

(آپؐ اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک پردہ نصب کیا گیا)

جب لوگوں نے دیکھا کہ حضرت زہراء (ع) اپنی ہم فکر اور مددگار خواتین کے ساتھ مسجد میں تشریف لائی ہیں تو ان کے احترام کے لئے ان کے اور مردوں کے درمیان ایک پردہ لگا دیا گیا۔
البتہ بعض دوسری کتابوں میں ”ملاءة“ کے بجائے ”قبطیة“ یا ”قبطیة“ ذکر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پردے کے کپڑے مصر سے لائے جاتے تھے اسی لئے اسے قبطیہ بھی کہتے تھے یعنی وہ پردہ جو ”قبط“ یعنی مصر سے لایا گیا ہو۔

حضرت زہراء (ع) اور حاضرین کا شدید گریہ،

”فجلست، ثم انت انه اجبش القوم لها بالبكاء“

(پھر آپؐ بیٹھ گئیں اور گریہ کیا اور ایسی جانسوز فریاد لگائی کہ مہاجرین و انصار کو رلا دیا)

”انت“ انہی سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں نالہ و فریاد۔

”اجبش...“ سے مراد یہ ہے کہ کبھی انسان کسی حادثہ سے پریشان اور غمگین ہوتا ہے کہ خوب روتا ہے اپنے آپ کو بے اختیار اس طرف اس طرف گراتا ہے اور کبھی اپنے پہلو کے بل گر پڑتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کا رونا ایک حرکت اور ہلنے کے ساتھ ہے۔ یہاں پر حضرت زہراء (ع) کا گریہ اور نالہ بھی اتنا جانسوز تھا کہ وہاں پر موجود مہاجرین و انصار کے رونے کی آواز بلند ہوئی اور وہ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر روتے تھے۔ حضرت زہراء (ع) کے گریہ نے اس طرح مجمع کو متاثر کیا تھا۔

”فارتج المجلس، ثم امهلت هنیئة“

(مجمع میں کھلبلی مچ گئی تو آپؐ نے چند لمحے فرصت دی تاکہ وہ سنبھل جائیں)

”حتى اذا سكن نشيج القوم وهدات فورتهم“

(۔ چند لمحوں کے بعد۔ حاضرین کی ہچکیاں بند ہو گئیں اور ان کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا)

”افتتحت الکلام بحمد اللہ تعالیٰ والثناء علیہ والصلوة علیٰ رسول اللہ (ص)“

(آپؐ نے پہلے مجمع کے جذبات کو بیدار کیا اور اس کے بعد۔

خداوند بزرگ و برتر کی حمد و ثنا اور پیغمبر اکرم (ص) پر درود و صلوات کے ساتھ اپنے خطبے کا آغاز کیا)

”فعداد القوم فی بکائهم“

(اس وقت۔ حضور (ص) کی بیٹی (ع) کی مظلومیت کو دیکھ کر مسجد میں موجود۔ لوگ دوبارہ رونے لگے)

اب جب دوسری مرتبہ لوگوں کا رونا بند ہوتا ہے تو آپؐ نے دوبارہ حمد و ثنا الہی پڑھی۔ فلسفہ

شکر اور شکر کرنے کی وجہ سے نعمت کی فرادانی کی یاد دہانی کی، انشاء اللہ ہم دوسرے درس میں اس کی وضاحت کریں گے۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

دوسرا درس:

- گزشتہ درس کا خلاصہ
- شکر الہی کے ساتھ خطبہ کا آغاز
- خدا کی بے شمار نعمتیں
- شکر نعمت اور نعمتوں کی بقاء اور فراوانی
- اخلاص، توحید کا ثمر ہے
- توحید کے ادراک میں افراد کا اختلاف
- خدا، ایک ناشناختہ حقیقت
- کائنات کی خلقت
- ہدف خلقت
- فلسفہ ثواب و عقاب

فَلَمَّا أَمْسَكُوا غَادَتْ فِي كَلَامِهَا، فَقَالَتْ ﷺ:

الْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى مَا أَنْعَمَ، وَلَهُ الشُّكْرُ عَلَى مَا أَلْهَمَ، وَالشُّنَاءُ بِمَا قَدَّمَ، مِنْ
عُمومِ نِعَمٍ ابْتَدَأَهَا، وَشُبوغِ آلاءِ أَسْذَاهَا، وَتَمَامِ مَنَنِ أَوْلَاهَا، جَمَّ عَنِ الْإِخْصَاءِ
عَدْدُهَا، وَنَأَى عَنِ الْجَزَاءِ أَمْدُهَا، وَتَفَاوَتْ عَنِ الْإِذْرَاكِ أَبَدُهَا، وَنَدَبَهُمْ
لِاسْتِزَادَتِهَا بِالشُّكْرِ لِاتِّصَالِهَا، وَاسْتَحْصَدَ إِلَى الْخَلَائِقِ بِاجْزَائِهَا، وَثَنِي بِالنَّدْبِ
إِلَى أَمْثَالِهَا؛ وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، كَلِمَةً جَعَلَ الْإِخْلَاصَ
تَأْوِيلَهَا، وَضَمَّنَ الْقُلُوبَ مَوْصُولَهَا، وَأَنَارَ فِي التَّفَكُّرِ مَعْقُولَهَا، أَلْمَمْتَنَعَ مِنْ
الْأَبْصَارِ رُؤْيَتَهُ، وَ مِنْ الْأَلْسُنِ صِفَتَهُ، وَ مِنْ الْأَوْهَامِ كَيْفِيَّتَهُ، ابْتَدَعَ الْأَشْيَاءَ لِأَمِنْ
شَيْءٍ كَانَ قَبْلَهَا وَأَنْشَأَهَا بِلاَ إِخْتِدَاءٍ أَمْثَلَهُ إِمْتَثَلَهَا، كَوَّنَهَا بِقُدْرَتِهِ وَذَرَأَهَا
بِمَشِيَّتِهِ، مِنْ غَيْرِ حَاجَةٍ مِنْهُ إِلَى تَكْوِينِهَا، وَلَا فَائِدَةٍ لَهُ فِي تَصْوِيرِهَا، إِلَّا تَثْبِيثًا
لِحِكْمَتِهِ، وَتَنْبِيهًا عَلَى طَاعَتِهِ، وَإِظْهَارًا لِقُدْرَتِهِ، وَتَعَبُّدًا لِبَرِّيَّتِهِ، وَإِعْزَازًا لِدَعْوَتِهِ؛
ثُمَّ جَعَلَ الثَّوَابَ عَلَى طَاعَتِهِ، وَوَضَعَ الْعِقَابَ عَلَى مَعْصِيَتِهِ، ذِيَادَةً لِعِبَادِهِ عَنْ
نَقِمَتِهِ وَحِيَاشَةَ لَهُمْ إِلَى جَنَّتِهِ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم
وبہ نستعین

گزشتہ درس کا خلاصہ:

ہم نے گزشتہ درس میں یہ کہا کہ جب ابو بکر اور عمر نے حضرت زہراء (ع) سے فدک غصب کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ خبر آپؐ تک پہنچی تو آپؐ اپنے حق کے دفاع کی خاطر اپنی چند مددگار و مفکر اور رشتہ داروں کو لے کر مسجد نبوی (س) کی طرف روانہ ہوئیں۔ وہاں ابو بکر اصحاب کے ایک بڑے مجمع میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب حضرت زہراء (ع) اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچیں تو آپؐ کے اور مردوں کے درمیان ایک پردہ لگایا گیا۔ اس وقت آپؐ نے ایک جانسوز گریہ کیا جس کی وجہ سے تمام حاضرین بلک کر رو پڑے۔ آپؐ نے چند لمحہ مہلت دی تاکہ وہ خاموش ہو جائیں۔ پھر آپؐ نے حمد و ثناء الہی اور رسول خدا (س) پر درود و صلوات کے ساتھ اپنے سخن کا آغاز فرمایا تو مجمع ایک بار پھر بے اختیار رونے لگا۔

کتاب احتجاج میں روایت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”فلما امسکوا عادت فی کلامہا“

(جب حاضرین خاموش ہوئے تو آپؐ نے اپنا خطبہ شروع کر دیا)

شکر الہی کے ساتھ خطبہ کا آغاز:

”فَقَالَتْ عَلَيْهَا السَّلَامُ، الْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى مَا أَنْعَمَ وَلَهُ الشُّكْرُ عَلَى مَا أَلْهِمَ“

(پھر حضرت زہراء (ع) نے فرمایا: نعمتوں سے نوازنے کے لئے تمام تعریفیں اللہ کے لئے مخصوص ہیں

اور الہام بحثنے کی بنا پر شکر بھی اسی ذات کے ساتھ مختص ہے)

جیسا کہ آپ آگاہ ہیں کہ ہر سطح کے افراد کو مد نظر رکھتے ہوئے خطبہ کا ترجمہ اور مختصر سی وضاحت پیش کرنا مقصود ہے اگر ہم خطبہ کی مکمل تشریح کرنا چاہیں (مثلاً یہ کہ ”حمد“ اور ”شکر“ کے درمیان فرق، ”ما انعم“ میں جو ”ما“ ہے اس کے موصول حرفی یا اسمی (۱) ہونے کا تعین وغیرہ) تو یہ بحث کافی طویل ہو جائیگی جو ہمارے مقصود کے خلاف ہے۔

حضرت زہراء (ع) کے خطبہ کا یہ جملہ ”وله الشکر علی ما الہم“ اچھائیوں اور برائیوں کے الہام (۲) کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے ”فالمہم فجو رہا وتقواہا (۳)“ نیز (اس حقیقت کی یاد دہانی کہ) یہ (الہام) ایک ایسی عظیم نعمت ہے جس کی خاطر شکر بجالانا لازم ہے۔

جس نکتہ کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ سوال ہے کہ کیا الہام اور وحی صرف انبیاء و اولیاء کے ساتھ مختص ہے یا نہیں بلکہ عام افراد پر بھی وحی اور الہام ہو سکتے ہیں؟
اس سوال کے جواب میں یوں کہنا چاہئے کہ:

۱۔ موصول حرفی وہ ہے جو اپنے صلہ کے ساتھ مصدر کا معنی و مفہوم دیتا ہے اور وہ پانچ ہیں ”ان۔ ان۔ کی۔ لو۔ ما“ جبکہ موصول اسمی مصدر کی ترویج میں جاتا ہے بلکہ ”الذی“ وغیرہ کی طرح اپنے مدخول کو معرفہ بناتا ہے۔

۲۔ لغت میں خدا یا مجموعی طور پر ملا اعلیٰ کی طرف سے انسان کو القاء کی جانے والی بات کو الہام کہا جاتا ہے جبکہ وحی نیز اشارے کا نام ہے اور یہ الہام کے مقابلے میں وسیع تر مفہوم رکھتی ہے کیونکہ وحی کبھی دل میں کسی بات کے القاء کے ذریعے ہوتی ہے جیسا کہ ”فالمہم فجو رہا وتقواہا“ میں ذکر ہوا ہے، کبھی مرموز اور ناشاختہ شعور اور فطرت کے ذریعے ہوتی ہے جیسا کہ شہد کی مکھی اور کبھی کسی موجود کی خلقت کی شکل میں جیسے زمین و آسمان پر وحی کہ جو قرآن میں ذکر ہوئی ہے، کبھی فرشتہ، غیبی آواز، درخت، خواب وغیرہ کے ذریعے خدا کے انبیاء سے گفتگو کرنے کے معنی میں استعمال ہوئی ہے علاوہ ازیں وحی انسان کے علاوہ دوسرے موجودات پر بھی نازل ہو سکتی ہے اور خدا کے علاوہ شیطان کی طرف سے بھی وحی ہوتی ہے جیسا کہ سورہ النعام کی آیت ۱۲۱ سے نمایاں ہے، درحالاتکہ الہام صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔

۳۔ سورہ شمس آیت ۸۔ پس خداوند اچھائیاں اور برائیاں کو انسان الہام کرتا ہے۔

انبیاء و اولیاء کے علاوہ دوسرے انسانوں خصوصاً متقی اور پرہیزگار انسانوں پر بھی الہام اور وحی ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی مذکورہ (بالا) آیت بھی اس بات کی تائید کرتی ہے، اسی طرح سورہ نحل کی آیت ۶۸ میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ”واوحینا الی ام موسیٰ ان ارضعہ (۱۱)“ (ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ وہی موسیٰ کو دودھ پلائے)۔

ان آیات اور حضرت زہراء (ع) کے فرمان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ”وحی والہام“ انبیاء و اولیاء کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دوسرے انسانوں پر بھی اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

حقیقت میں الہام (اور وحی) انسان کے رموز شعور اور اندرونی معرفت کی ایک قسم ہے کہ خداوند (جل جلالہ) نے انسانوں کے علاوہ دوسرے بعض حیوانوں کو بھی اس نعمت سے نوازا ہے۔ مثال کے طور پر شہد کی مکھی (جس کے بارے میں ارشاد ربانی ہے کہ): ”واوحی ربک الی النحل“ (تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی فرمائی)

البتہ اس فرق کے ساتھ کہ انبیاء و اولیاء پر جو الہام اور وحی ہوتے ہیں وہ نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف اور انتہائی قوی ہوتے ہیں اور ہم اس کی حقیقت کو درک نہیں کر سکتے ہیں۔

”والثناء بما قدم“

(تعریف و حمد۔ بھی اسی سے مخصوص ہے ان نعمتوں کی خاطر۔ جو اس نے ہماری خلقت سے۔ قبل پیدا کی ہیں) یہ اشارہ ہے آسمان و زمین کی خلقت کی طرف جو خدا نے ہماری خلقت سے پہلے پیدا کیے اور ہم اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

”من عموم نعم ابتداھا“

(ان تمام نعمتوں کی وجہ سے جنہیں۔ خدا نے بنیر کسی درخواست اور التجاء کے۔ اپنی طرف سے ہی بخشا ہے)

۱۔ اس آیت میں مسئلہ حسن و قبح عقلی کی طرف اشارہ ہے کہ قدیم و جدید علم کلام میں جس سے بحث ہوتی ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان الہام فطرت الہی خلقت کے ذریعے اس بات پر قادر ہے کہ اچھائیوں اور برائیوں کو درک کر سکے، فجور اور تقویٰ اور عدالت و ظلم کو تشخیص دے سکے۔ لہذا افراد اور انسانی معاشرہ کا عدالت و ظلم اور اچھائیوں اور برائیوں میں اختلاف اکثر اوقات عدل و ظلم کے مصداق کے اعتبار سے ہے نہ کہ اصل کے اعتبار سے۔

اس جملے کی ابتداء میں جو "من" (۱) کا لفظ ہے وہ بیانیہ ہے جو پہلے جملہ میں مذکور "بما قدم" کی توضیح اور تشریح کر رہا ہے۔ "بما قدم" سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو بغیر کسی سوال کے خدا نے بندوں کو بخشی ہیں۔ بنیادی طور پر نعمتوں کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ نعمتیں جو بندہ خدا سے مانگتا ہے، سوال کرتا ہے تو خدا اس سوال کے جواب میں عنایت فرماتا ہے۔ دوسری وہ نعمتیں ہیں جو بندے کے سوال کرنے سے قبل یا اس کی خلقت سے پہلے خدا نے فضل و کرم سے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں۔

حضرت زہراء (ع) کے اس جملہ سے دوسری قسم کی نعمتیں مقصود ہیں جو خدا نے اپنی بے پایان رحمت کی بنا پر بغیر مانگے بندوں کو عنایت فرمائی ہیں۔

"وسبوح آلاء اشداھا"

(اور نعمت کی فراوانی جو اس نے بخشی ہے)

"سبوح" یعنی فراوانی، "آلاء" کا مفرد "الی" ہے اور یہ لفظ ہمزہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور اس کے معنی ہیں نعمت۔ "الی" کی جمع "الاء" ہے اور علم صرف کے قاعدہ مذ (۲) کے مطابق دوسرا ہمزہ مذ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لہذا آلاء کے معنی ہوں گے نعمتیں۔ "اشدی" کے معنی ہیں کسی نعمت کا بخشا جانا۔

یہ جملہ پہلے جملے پر عطف ہے (اور خداوند تبارک و تعالیٰ کے حمد و ثناء اور شکر کی علت بیان کر رہا ہے) لہذا جملہ کا مقصود یہ ہو گا کہ تعریفیں اس خدائے ذوالجلال کے لئے ہیں جس نے خلقت سے پہلے ہی انسانوں کو نعمتیں عنایت کیں (خلقت کے بعد بھی) بغیر سوال کے اپنی رحمت سے نوازا اور فراوانی کے ساتھ نعمتیں بخشیں۔

۱۔ "من" کے کئی معانی ہیں، ان میں سے ایک بیانیہ ہے اور وہ اس وقت استعمال ہوتا ہے کہ جب "من" سے پہلے کوئی مبہم حرف یا جملہ موجود ہو کہ جس کی تشریح اور توضیح کی ضرورت ہو جیسے "بما قدم"۔

۲۔ عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر دو ہمزے کسی ایک لفظ میں جمع ہو جائیں اور دوسرا ہمزہ ساکن ہو تو دوسرا ہمزہ پہلے حرف میں بدل دیتے ہیں جو پہلے ہمزہ کی حرکت سے موافق ہو اس طرح پہلے ہمزہ پر فتح ہو تو دوسرے ہمزہ کو الف میں، اگر زیر ہو تو دوسرے ہمزہ کو یاء میں اور اگر پہلے ہمزہ پر پیش ہو تو دوسرے ہمزہ کو واو میں بدل دیتے ہیں۔

”وتمام منن اولاہا“

(۔ شکر و سپاس اس خالق کے لئے۔ جس نے جب نعمتیں بخشیں تو مکمل کر کے بخشیں)
 ”منن“ سے مراد وہ تمام نعمتیں ہیں جو خدا نے بطور احسان، بندوں کو بخشیں اور اس پر ان
 جملایا (۱)۔

خدا کی بے شمار نعمتیں:

”جسم عن الاحصاء عددہا“

(یہ نعمتیں شمارش سے باہر ہیں)

”جسم“ کثرت اور فراوانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں ”عن“ کے ذریعے متعدی ہوا
 ہے لہذا کثرت اور فراوانی کے بے انتہاء اور بے حساب ہونے پر دلالت رکھتا ہے۔ یعنی خدا کی نعمتیں
 اس قدر زیادہ اور فراوان ہیں کہ ہم انہیں شمار نہیں کر سکتے۔ آپؐ کا یہ کلام، قرآن کے اس ارشاد
 خداوندی کی طرف اشارہ ہے کہ: ”وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها (۲)“ (اور اگر تم خدا کی نعمتوں کو
 شمار کرنا چاہو تو اس کا حساب نہ کر سکو گے)۔

”ونافی عن الجزاء امدہا“

(خدا کی نعمتوں کی ابتداء اور ان کا آغاز ہی۔ اتنا عظیم ہے کہ۔ اس کا عوض اور بدلہ ہمارے بس سے باہر ہے)

”امد“ لغت میں کسی چیز کی ابتداء یا اس کی مکمل مدت کو کہا جاتا ہے۔

حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: خدا کی نعمتوں اور احسانات کی ابتداء یا مدت اس قدر زیادہ اور

۱۔ من لفظ منہ کی جمع ہے اور قرآن میں سورہ ۳ آیت ۱۲۴ میں نبوت، ہدایت اور رسول خداؐ کی ذات گرامی کو بہترین نعمت اور
 مومنین پر منت قرار دیا گیا ہے جو انسانوں کے نہ چاہتے ہوئے بھی خدا نے اپنی طرف سے عنایت فرمائی۔
 لہذا اس جملے میں لفظ تمام کو منن کی طرف اضافہ کیا گیا ہے اس سے یہ سمجھ آتا ہے کہ اس جملے کا مقصد نعمت و ولایت ہے جس کے
 ذریعے نعمت ہدایت تکمیل ہوئی اور ارشاد ہوا کہ الیوم... وامت علیکم نعمتی۔

۲۔ سورہ ابراہیم / ۳۴۔

ہماری قدرت سے باہر ہے کہ ہم اس نعمت کے ابتدائی حصے کا یا مکمل مدت کا عوض (شکر و عبادت وغیرہ) کے ذریعے ادا نہیں کر سکتے اور ہمارے بس سے باہر ہے۔

اگر خداوند جل جلالہ کسی خاص دن یا معینہ وقت کے لئے بندوں کو اپنے لطف و کرم سے نوازنا تو کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم بھی ایک خاص مدت کے اندر اس نعمت کا بدلہ اور عوض (عبادات) کی شکل میں ادا کر سکتے ہیں، لیکن خدا کی نعمتیں (اور رحمتیں) روز و سال تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کی رحمتوں کی بارش کئی ملین سال پہلے سے برس رہی ہے لہذا اس وقت ہم اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ اس کی نعمتوں کا بدلہ اتار سکیں۔

اس نظام ہستی میں ہم ایک ذرے اور تنکے کی حیثیت رکھتے ہیں اور نظام خلقت کا ہر ذرہ اسی تنکے کی پیدائش اور بقاء و دوام میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ یعنی یہ نظام ہستی ہم آہنگ اور ایک دوسرے سے مربوط ہے ایسا ہرگز نہیں کہ اس نظام سے ہٹ کر ہم کوئی الگ وجود یا تشخص رکھتے ہوں۔

ہمارا وجود ماں باپ، آباء و اجداد کے وجود سے وابستہ ہے اس کے علاوہ ماحول، طبیعت، آب و ہوا، سورج اور زمین وغیرہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر کام کر رہے ہیں تاکہ نتیجتاً ایک انسان دنیا میں قدم رکھ سکے۔

لہذا ایک چیز کی خلقت کا آغاز شاید کروڑوں سال پہلے سے ہو چکا ہو اور یہ نظام اس قدر تبدیلیوں اور تغیرات کا شکار ہو چکا ہو اور اسی تغیر کے تسلسل میں اس قدر چکر کاٹے ہوں کہ آخر میں ایک نئی شے وجود میں آتی ہو۔

علم و سائنس نے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ ایک خاص چیز کی پیدائش میں مکمل نظام ہستی دخالت رکھتی ہے (اور اسی کی خاطر فعالیت کرتی ہے)۔

حضرت زہراء (ع) بھی انہیں حقائق کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ: "دناى عن الجزاء ادھا" یعنی اگر کوئی خدا کی نعمتوں کی ابتداء یا پوری مدت کا عوض دینا چاہے تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

”وتفاوت عن الادراك ابدھا“

(ان نعمتوں کے آخر اور انجام کے لحاظ سے انسانوں کے ادراک اور احساس مختلف ہیں)
 ”ابد“ یعنی انجام اور کسی چیز کی نہایت اور آخر۔ اس جملہ میں ”ابد“ کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ
 اس سے پہلے والے جملے میں ”ابد“ کا معنی ابتداء ہے۔ یعنی خدا کی نعمتیں اپنی ابتداء اور انتہاء دونوں کے
 اعتبار سے بہت دور ہیں (آغاز کا علم نہ انجام کا) لہذا ان نعمتوں کا کماحقہ شکر ادا کرنا انسان کے بس کا
 کام نہیں ہے۔

شکر نعمت اور نعمتوں کی بقاء اور فراوانی:

”وندبہم لاستزاد تھا بالشکر لاتصالھا“

(اور اس۔ خدا۔ نے اپنے بندوں کو دعوت دی کہ:

نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اس میں تسلسل کے ذریعے نعمتوں کی فراوانی اور دوام کا باعث بنیں۔
 ”ندب الیہ“ یعنی اس کی طرف بلایا اور دعوت دی۔ مستحبات کو مندوبات اسی لئے کہا جاتا ہے کہ
 ان کو بجالانے کی دعوت دی گئی ہے۔

”ندبہم لاستزاد تھا...“ یعنی خداوند (جل جلالہ) نے اپنے بندوں کو دعوت دی کہ وہ نعمتوں کا شکر
 ادا کریں اور اس طریقے سے درگاہ خداوندی سے نعمتوں کی زیادتی اور فراوانی طلب کریں (دوسرے الفاظ
 میں یوں عرض کر دوں کہ) خداوند فرماتا ہے کہ انسان شکر گزار بندہ بنے تاکہ خداوند اپنی نعمتوں میں اضافہ
 کرے۔

”لاتصالھا“ کے بارے میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ ”لاتصالھا“ کا لفظ شکر سے مربوط ہے اور اس

لفظ کے ابتداء میں جو لام ہے وہ لام صلہ (ا) ہے۔

۱۔ عربی زبان میں ”ل“ کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے ان میں سے ایک اپنے مدخول اور اس سے پہلے کسی دوسرے لفظ یا جملے کے
 درمیان ربط پیدا کرنا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ: ”لا تصالھا“ کا لفظ ”ندبہم“ کے لئے علت ہو، یعنی گویا کوئی سوال کرے کہ نعمتوں کی فراوانی اور کثرت کی خاطر خداوند بندوں کو شکر کی طرف کیوں بلاتا ہے؟ (شکر اور نعمت میں اضافہ کے درمیان کیا رابطہ ہے؟) تو اس کا جواب یہ ہے کہ: ”لا تصالھا“ یعنی شکر نعمتوں کے مسلسل اور پے در پے نازل ہونے اور بقاء کا سبب بنتا ہے۔

ان دو احتمالات میں سے پہلا احتمال بہتر نظر آتا ہے لہذا اس جملے کا معنی یہ ہو گا کہ نعمتوں کے پے در پے نازل ہونے پر شکر گزار رہو تاکہ خداوند اس کے نتیجے میں تمہیں مزید نعمتوں سے نوازے۔

بہر صورت حضرت زہراء (ع) کا یہ جملہ سورۃ ابراہیم کی آیت نمبر ۷ کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: ”لئن شکرتکم لازیدنکم“ (اگر تم شکر کرو گے تو تحقیق میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کروں گا) البتہ شکر نعمت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس نعمت کو اسی کام اور مقصد کے لئے استعمال کریں جس کا خدا نے حکم دیا ہے۔

”واستحمد الى الخلاق باجزالھا“

(نعمتوں کی کثرت کے مقابلے میں خدا نے بندوں سے چاہا کہ اس کی حمد و ثنا کریں)

”اجزال“ کسی چیز کو زیادہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہذا ”اجزال نعمت“ کا معنی نعمتوں کو زیادہ اور فراوان کرنا ہے، آپؐ فرماتی ہیں کہ: خدا نے اپنے بندوں سے یہ چاہا کہ وہ اسی کی نعمتوں پر حمد و ثنا کریں تاکہ اس کے مقابلے میں خداوند عالم بھی بندوں کو مزید نعمتوں اور رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

”وثنی بالنذب الى امثالھا“

(ایسی نعمتوں کی طرف خدا نے تمہیں بار بار دعوت دی ہے)

یہاں پر دو احتمال ہیں، جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے بھی فرمایا ہے، ممکن ہے ”امثالھا“ کا مقصد اخروی نعمتیں ہوں، پس جملہ کا معنی یہ ہو گا کہ جہاں انسان دنیوی نعمتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں وہاں خداوند اسے دعوت دیتا ہے کہ نماز پڑھیں، فقراء کی مدد کریں، مسجد و مدرسہ تعمیر کریں اور دوسرے نیک کاموں

کو انجام دیں تاکہ آخرت میں بھی خدا کی بے حد و حساب نعمتوں سے بہرہ مند ہو سکیں۔

جیسا کہ پہلے فرمایا کہ: ”فدبہم لاستزادتها بالشکر“ (یعنی خدا نے بندوں کو شکر بجالانے کی دعوت دی تاکہ اس کے ذریعے نعمتوں میں اضافہ کیا جائے) یہاں پر بھی فرمایا کہ: ”وثنی بالندب الی امثالہا“ یعنی خدا نے تمہیں دوبارہ دعوت دی ہے کہ اچھے کام کریں تاکہ دنیوی نعمتوں کی طرح اور ان سے ملتی جلتی نعمتیں تمہیں آخرت میں بھی دی جائیں، اگر اس دنیا میں تمہیں ایک گھر دیا گیا ہے تو آخرت میں نیک اعمال کی بدلے محلات دے گا، یہاں کے ایک باغ کی جگہ پر وہاں جنت کے باغات سے نوازے جاؤ گے۔ شاید ”امثالہا“ سے یہی دنیوی نعمتیں مقصود ہوں جو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں اور مختلف انداز اور طریقوں سے بندگان خدا اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اخلاص، توحید کا ثمر ہے:

”واشہدان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ“

(گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں)

”کلمۃ جعل (۱) الاخلاص تاویلہا“

(خدا کی وحدانیت کی یہ گواہی ایک ایسا کلمہ ہے جس کی تاویل اور نتیجہ اخلاص عمل ہے)

اگر کوئی انسان دل کی گہرائیوں سے یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ خدائے یکتا کے علاوہ کوئی شی موجود ہے ہی نہیں اور خدا کے مقابلے میں تمام کائنات ہیچ اور پوچ ہے صرف اس کی ذات ہے جو عبادت کے لائق ہے اور وہی ذات تمام موجودات کی خالق اور رازق ہے اور صرف وہی بندوں کی ضروریات اور حوائج کو پورا کرتی ہے، اگر کوئی انسان اس مسئلے کو دل سے قبول کر لے تو اس کے تمام اعمال میں خلوص نیت پیدا ہوگا اور وہ اپنی عبادات کو خلوص نیت (اور صدق دل) سے بجالائے گا۔

۱۔ ”جعل“ مجہول کی صورت میں بھی پڑھا گیا ہے کہ جس کے معنی یوں بنیں گے، شہادت دیتی ہوں خدا کی وحدانیت کی، یہ ایک کلمہ ہے کہ اخلاص کو اس کا نتیجہ اور تاویل قرار دیا گیا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے اندر خلوص کا فقدان ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم غیر اللہ کی بھی اہمیت کے قائل ہیں اگر ہم یہ جان لیں کہ صرف خدا پرستش کے لائق ہے اور جتنے بھی کمالات ہیں وہ خدا کے ساتھ مخصوص ہیں تو ہمارے اعمال میں خود بخود خلوص آجائے گا۔

اسی وجہ سے آپؐ نے فرمایا کہ: ”کلمۃ جعل الاخلاص تاویلہا“ کہ خدا نے اخلاص عمل کو کلمہ توحید (کلمہ اخلاص) کا باطن اور تاویل قرار دیا ہے۔ یعنی کلمہ توحید ”لا الہ الا اللہ“ کا نتیجہ اور مرجع عمل میں خلوص نیت ہے۔ اگر (خدا نخواستہ) ہم اپنے اعمال میں مخلص نہیں ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری توحید (خدا کی وحدانیت پر ایمان) میں خلل اور نقص ہے۔

توحید کے ادراک میں افراد کا اختلاف،

”وَضَمَنَ الْقُلُوبَ مَوْصُولَهَا“

(اور خدا نے کلمہ توحید کے مفہوم اور اس سے حاصل شدہ ادراک کو دلوں میں جگہ دی ہے)

لفظ ”موصولہا“ کے بارے میں کئی احتمال دئے جاتے ہیں، لیکن وہ معنی جو میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ کلمہ توحید اور ”لا الہ الا اللہ“ کی پہچان کے لحاظ سے افراد کے درمیان کافی اختلاف اور فرق موجود ہے۔ ”لا الہ الا اللہ“ سے جو معنی و مفہوم اور حقیقت، پیغمبر اکرم (ص) درک فرماتے تھے وہ یقیناً ہماری پہچان اور معرفت سے مختلف ہے۔ اسی طرح خدا کی معرفت کے حوالے سے حضرت موسیٰؑ اور اس چرواہے کے درمیان (زمین سے آسمان تک کا) فرق موجود ہے۔ وہ چرواہا جو خدا کو اپنے جیسا ایک جسم اور انسان سمجھتا ہے (۱)۔

۱۔ اس سلسلے میں شہنوی مولوی کے اشعار قابل ذکر ہیں،

دید موسیٰ یک شبانی را بہ راہ کوہی گفت ای خدا وای الہ

(موسیٰ نے راستے میں ایک چرواہے کو دیکھا جو ہمیشہ خدا خدا کیا کرتا تھا)

تو کجائی تا شوم من چاکرت چارقت دوزم کنم شانہ سرت

(اے خدا! تم کہاں ہو بتاؤ تاکہ میں تجھ پر قربان جاؤں اور تیرے جوئے کو سی دوں اور تیرے بالوں کو لنگھی کروں) ==

”ضمن القلوب“ یعنی دلوں میں جگہ دی ہے، دلوں میں رکھی ہے، ”موصولہا“ کلمہ توحید کے معنی و مفہوم کو ہر انسان اپنی مخصوص استعداد کے مطابق، کلمہ توحید سے ایک مخصوص معنی سمجھتا ہے۔ اس لفظ سے آپ جو درک کرتے ہیں اور خدا کی جو معرفت آپ کو حاصل ہوتی ہے وہ دوسرے شخص کے اس لفظ کی معرفت اور شناخت سے یقیناً مختلف ہے، لہذا اس کلمہ کے بارے میں ہر انسان کے درک اور شناخت کو خداوند نے اس کے دل میں رکھ دیا ہے۔ (یعنی وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور اس کے ساتھ عشق رکھتا ہے) کیونکہ ہر انسان معانی کو درک کرنے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

”وانار فی التفکر معقولہا“

(اور جس قدر اس کلمہ کے معانی درک کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں اسی قدر انسان کی فکر و تعقل کو روشنی بخشتا ہے) اس جملے میں لفظ ”معقولہا“ مفہوم کے اعتبار سے لفظ ”موصولہا“ کی مانند ہے جو پہلے جملے میں گزر چکا ہے۔ ہر انسان کا غور و فکر اور تعقل اس کی استعداد کے مطابق ہی ہو گا اور خداوند اسی قدر انسان کے دل کو نورانیت بخشتا ہے جس قدر اس نے کلمہ توحید کو سمجھنے کے سلسلے میں غور و فکر کیا ہو۔

آنحضرت (س) سے منسوب ایک دعا میں یہ جملہ ہے کہ آپ (س) نے فرمایا: ”اللہم ادفی الاشیاء کما ہی“ خداوند ا! اشیاء جیسا کہ وہ ہیں ویسے ہی مجھے دکھا دے۔ (یعنی ہر چیز کو اس کی اپنی اصلی حالت اور حقیقت میں مجھے دکھا)۔

اس کا مطلب کیا ہے؟ ہم تو ہر چیز کے لئے ایک قسم کا وجود، قدر و قیمت اور شخصیت کے قائل ہیں،

== پھر کہتا ہے کہ: تو کجائی تا سرت شانہ کنم جامہ ات دوزم و خنیہ زخم

(تم کہاں ہو؟ تاکہ تیرے بالوں کنگھی اور لباس کے پھٹے ہوئے حصوں کو سی دوں)

جامہ ات شویم شہایت کشم شیر پیش آورم ای بخشم

(تیرے کپڑوں کو دھوؤں اور تیری جوؤں کو نکالوں نیز تیرے سامنے دودھ پیش کر سکوں ای صاحب عزت)

آخر میں کہتا ہے کہ: ای فدای تو ہمہ بزہای من ای بہ یادت ہی ای و میہای من

(مجھ پر میری تمام بکریاں قربان ہوں، ای وہ ہستی کہ میری زندگی کے سارے زمرے تیری ہی یاد ہے)۔

لیکن پنمیر اکرم (س) اشیاء کی طرف رابطے اور غیر مستقل نگاہ سے دیکھتے ہیں، جیسا کہ ربلی معانی (۱۱) اپنی جگہ پر غیر مستقل اور اسی معانی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ پنمیر اکرم (س) بھی تمام چیزوں کو خدا کے ساتھ وابستہ اور ذات حق تعالیٰ کی جھلک میں ہی دیکھتے تھے (یعنی آپ (س) کی نظر میں ہر چیز خداوند کا جلوہ اور کرشمہ ہے اور یہ اشیاء ایسی کوئی الگ حقیقت اور وجود نہیں رکھتیں)۔ مولا علی (ع) سے بھی نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ”ما رایت شیئاً الا و رایت اللہ قبلہ وفیہ ومعہ (۱۲)“ یعنی میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا مگر یہ کہ اس چیز سے پہلے اسی چیز کے اندر اور اس کے ساتھ خدا کو بھی دیکھا ہے۔

پس (معلوم ہوا) کہ خدا کے برگزیدہ بندے اشیاء کو عارضی اور غیر مستقل نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو ان چیزوں میں ذات حق کی تجلی اور جلوہ نظر آتا ہے۔ حالانکہ ہم ان اشیاء کے لئے استقلال اور مستقل حیثیت کے قائل ہیں۔ بنا بریں (یہ ایک واقعیت ہے کہ) ہر شخص خدا، توحید اور موجودات کے بارے میں اپنا مخصوص فکر اور نظریہ رکھتا ہے۔

حضرت زہراء (ع) بھی یہاں یہ فرماتی ہیں کہ توحید کے بارے میں انسان کا درک اور فہم، جتنا عمیق اور صحیح ہوگا اسی قدر اور مناسبت سے خداوند دلوں کو نورانیت بخشتا ہے۔

خدا، ایک ناشناختہ حقیقت،

”الممتنع من الابصار رؤیتہ، ومن الالسن صفتہ“

(اللہ وہ ذات ہے جسے نہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی زبان سے اس کی وصف بیاں ہو سکتی ہے) چونکہ خداوند (سبحان) جسم نہیں رکھتا اور جسم سے پاک و منزہ ہے لہذا اسے آنکھوں یا دوسرے

۱۔ وہ معنی جو قطع نظر کسی دوسرے معنی کے، بذات خود قابل تصور ہو، اسے درک اور تصور کیا جاسکتا ہو اسے اسی معنی کہا جاتا ہے جیسے چیزوں کے نام وغیرہ۔ اور وہ معانی جو مستقل طور پر قابل فہم نہ ہوں اور اس کا تصور ہمیشہ کسی دوسرے معنی کے ضمن ممکن ہو تو اسے حریفی یا ربلی معانی کہا جاتا ہے جیسے (ہر۔ کو۔ سے وغیرہ) کے معانی۔

۲۔ اسی مطلب کی طرف حضرت علیؑ سے منسوب یہ جملہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ ”ما عرفناک حق معرفتک“ یعنی اے خداوند! جس طرح تجھے پہچاننے کا حق تھا ہم نے تجھے نہیں پہچانا۔

وسائل کے ذریعے دیکھا نہیں جاسکتا اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس کے وجود اور وجودی کمالات نامتناہی اور نامحدود ہیں۔ زبان اور دوسرے وسائل اظہار سے اس کی توصیف ممکن نہیں۔ اسی بنا پر ذات خداوندی کی حقیقت سوائے خدا کے کسی مخلوق کے لئے قابل درک نہیں، یعنی ذات خداوندی کی حقیقت کو صرف خدا ہی جانتا ہے کسی اور کے لئے اس کی حقیقت کا صحیح ادراک اور معرفت ممکن ہی نہیں ہے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام نے بھی نبج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں دقیق اور مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ خدا کی ذات، لامتناہی اور اس کی توصیف، ناممکن ہے (۱)۔

”وَمِنَ الْاَوْهَامِ كَيْفِيَّتُهُ“

(اس کی کیفیت کو قوتِ داہمہ کے لطیف خیالات۔ بھی درک نہیں کر سکتے)

قوتِ داہمہ کے ذریعے بھی خدا کی کیفیت کا ادراک محال ہے۔ چونکہ خدا، کیفیت سے برتر و منزہ ہے۔ البتہ کیفیت اپنے عمومی معنی کے اعتبار سے، یہاں خدا کی اصلی ذات اور حقیقت حق مراد ہے اور یہ کہ خدا کی واقعیت اور حقیقت کیا ہے؟ اور کیسی ہے؟ یہ ایسی چیز ہے جسے انسان نہیں سمجھ سکتا، البتہ (لوگوں میں) ایک یہ خیال کرتا ہے کہ خدا، نور کا گنبد ہے تو دوسرا یہ تصور کرتا ہے کہ خدا دنیا کے بادشاہوں کی طرح تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہے اور حکمرانی فرما رہا ہے، لیکن حقیقت میں قوتِ داہمہ اور لطیف خیالات کے بل بوتے پر خدا کا تصور ممکن نہیں۔ کیونکہ کمیت اور کیفیت ممکنات کی صفات اور خصوصیات میں سے ہیں اور خدا، چونکہ ہر لحاظ سے واجب الوجود ہے، لہذا تمام مادی صفات اور خصوصیات سے بھی برتر و منزہ ہے۔

۱۔ نبج البلاغہ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں: ”الحمد لله الذي لا يبلغ مدحه القائلون... ولا يودی حقه المجتهدون، الذي لا يدركه بعد العلم ولا يناله غوص الغطن...“۔ حمد و ثنا اس اللہ کے لئے ہے کہ تعریف کرنے والے جس کی تعریف سے عاجز ہیں اور اس کی معرفت و مدح کی راہ میں جانفشانی کرنے والے اس کی معرفت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں، ایسا خدا کہ عظیم ہمت اور عزم راسخ رکھنے والے نیز دریائے (معرفت کے) بہر وزیرک (غوامس بھی جس کی اصلی حقیقت تک پہنچنے میں بے بس ہیں۔

کائنات کی خلقت

”ابتدع الاشياء لامن شي كان قبلها“

(اور خداوند (جل جلالہ) نے اشیاء کو خلق کیا ہے حالانکہ اس خلقت سے پہلے کوئی چیز تھی ہی نہیں) بغیر نمونے کے کسی چیز کے ایجاد کرنے کو ”ابداع“ کہا جاتا ہے، در حالانکہ ”اختراع“ کسی نمونے کو دیکھ کر ایک نئی چیز ایجاد کرنے کا نام ہے۔ لہذا ابداع اور اختراع میں بڑا فرق ہے، جہاز کا مخترع کسی چیز کو خلق نہیں کرتا بلکہ دنیا میں موجود میٹرل اور پرندوں (کی اڑان) کو دیکھ کر جہاز بناتا ہے اور پھر ایک اور شخص آکر پرانے نمونوں کو دیکھ کر نیا ماڈل اور نیا جہاز بنا لیتا ہے۔ حالانکہ خداوند عالم نے کائنات کی خلقت میں کسی چیز سے کوئی استفادہ نہیں کیا، حقیقت میں کسی چیز کا وجود ہی نہیں تھا تاکہ یہ کہا جاسکے کہ خدا نے کائنات کی خلقت میں ان سے نمونہ اور نقشہ لیا ہے۔ لہذا ابتدا سے ہی بغیر کسی نمونے کے نیز کسی چیز سے مدد لئے بغیر اگر کوئی چیز بنالی جائے تو اسے ابداع کہا جاتا ہے۔

حضرت زہراء (ع) یہاں ارشاد فرماتی ہیں کہ: ”ابتدع الاشياء“ یعنی خدا نے اشیاء کو ابداع فرمایا ہے اور وہ بھی ”لامن شي كان قبلها“ کسی ایسی چیز سے نہیں کہ جو اس کی خلقت سے پہلے موجود ہو بلکہ ابتدا سے ہی کسی نقشے اور میٹرل کی مدد کے بغیر، اس کائنات کو پیدا کیا۔

”وانشاها بلا احتذاء امثلة امثلها“

(خدا نے اشیاء کو ایجاد کیا ہے بغیر اس کے کہ پہلے سے موجود کسی نقشے اور نمونے کی تقلید کی ہو)

”كونها بقدرته وذراها بمشيته“

(خدا نے اپنی قدرت اور مشیت دارادے سے کائنات کو وجود بخشا)

اگرچہ ظاہری اسباب و علل، موجودات کی پیدائش میں تاثیر رکھتے ہیں لیکن یہ تمام علل و اسباب اپنے وجود اور تاثیر میں قدرت اور ارادۂ خداوندی کے تابع ہیں اور ان سب کی (علۃ العلل) بازگشت خدا کی قدرت اور اس کے ارادے کی طرف ہے۔

”من غیر حاجۃ منہ الیٰ تکوینہا، ولا فائدۃ لہ فی تصویرہا“

(نہ خدا کائنات کی خلقت کی طرف محتاج تھا اور نہ ہی اس کی تصویر کشی میں اس کا کوئی فائدہ تھا)
خدا نے موجودات عالم کو مختلف شکلوں اور صورتوں میں پیدا کیا ہے تو اس میں خدا کا کوئی فائدہ ہے اور نہ خدا کو اس کی ضرورت، بلکہ یہ خدا کی بے پایان رحمت کا تقاضا تھا کہ مخلوقات کو مختلف شکلوں اور صورتوں میں پیدا کرے۔

خلاصہ یہ کہ کائنات کی خلقت کی خدا کو ضرورت تھی اور نہ ہی اس میں خدا کا کوئی فائدہ۔

هدف خلقت:

(۱) ”الاتشیتا لحکمتہ“

(مگر یہ کہ کائنات کو پیدا کیا تاکہ اپنی حکمت کو ثابت کرے)
”حکمت“ یعنی مصلحت کے مطابق کسی چیز پر قدرت رکھنا، چونکہ کائنات کی خلقت میں مصلحت ہے اور عقل و منطق کے بھی موافق ہے لہذا خالق کائنات نے اسے خلق فرمایا ہے، چونکہ فیاضیت (جود و سخا) خدا کے کمالات و جود یہ میں شمار ہوتی ہے (اور اس کمال کا تقاضا یہ ہے کہ ممکنات کو زیور و جود سے آراستہ کیا جائے) لہذا خداوند حکیم نے موجودات کو پیدا کیا اور اپنی حکمت کو اسی راہ سے ثابت اور ظاہر کیا ہے۔

(۲) ”وتنبیہا علیٰ طاعتہ“

(نیز اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی طرف آپ کو متوجہ کرے)
یعنی خداوند دنیا کو خلق کر کے تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہے کہ تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کرو، جب یہ دیکھتے ہو کہ خود تمہاری ہستی اور یہ سارے موجودات، خدا نے ہی پیدا کیے ہیں اور اسی کی خلق کردہ ہیں تو لازمی طور پر اسی کی اطاعت کرنی چاہئے اور واجبات پر عمل کرنا چاہئے اور جن

امور سے تمہیں نہی کی گئی ہے اور رد کا گیا ہے، اس کے ارتکاب سے باز رہیں اور خدا کی مخالفت نہ کریں۔

(۳) ”واظہاراً لقدرته“

(اور اپنی قدرت اور طاقت کو ظاہر کرے)

خداوند عالم نے یہ ارادہ فرمایا کہ اپنی قدرت کی بزرگی اور عظمت کو آشکار کرے۔ حدیث قدسی میں بھی آیا ہے کہ: ”كنت كنزاً مخفياً فاحببت ان اعرف“ (میں ایک مخفی خزانہ تھا چاہا کہ پہچانا جاؤں) لہذا کائنات کی خلقت کا ہدف اور مقصد پروردگار کی معرفت اور نتیجتاً جن دانس کی معنوی ترقی اور ان کا تکامل ہے۔

(۴) ”وتعبداً لبريته“

(بندوں کے ضمیروں میں عبادت و بندگی کی روح پر دان پڑھے)

جب لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک خالق ہے جو ان تمام نعمتوں، رحمتوں اور کمالات کا سرچشمہ ہے تو ان کے دل میں خود بخود بندگی کا احساس پیدا ہو گا اور یہ احساس اور آگاہی، عبودیت اور بندگی کے مقام میں بندوں کے لئے ایک عظیم کمال شمار ہوں گے۔ قرآن میں بھی خداوند متعال ارشاد فرماتا ہے کہ: ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون (۱)“ (جن دانس کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں) عبادت و بندگی کو ہدف آفرینش اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ خدا کی عبادت اور اس کی پرستش انسان کے کمال اور خدا کے حضور میں اس کی قربت اور منزلت میں اضافہ کا سبب بنتی ہے اور جب انسان کے اندر بندگی اور تعبد کی روح بیدار ہو جائے تو خود بخود خدا کے سامنے جھک جاتا ہے اور غیر اللہ سے کٹ جاتا ہے۔

(۵) ”واعزّازاً لدعوته“

(اپنی دعوت اور دین کی تقویت اور استحکام کی خاطر۔ وہی دعوت جو انبیاء کے ذریعے انجام پائی۔)

”اعزاز“ کے معنی ہیں تقویت اور کسی چیز کو استحکام بخشنا۔ انبیاء و اولیاء جو لوگوں کو خدا کی جانب بلاتے ہیں، ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی دعوت کی سچائی پر دلیل اور برہان رکھتے ہوں، اس حوالے سے بہترین اور مستحکم ترین دلیل یہی نظام ہستی اور کائنات کی خلقت ہے (جو کہ یہ بتاتی ہے کہ) اس جہاں کا ایک خالق ہے اور تمام موجودات (اپنے وجود اور بقاء کے لحاظ سے) خدا کی طرف محتاج ہیں اور اس سے جدا ہو کر زندگی نہیں گزار سکتے۔ اسلامی روایات میں بھی خدائے واحد و حکیم کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے نظام ہستی میں موجود نظم و انضباط سے استدلال کیا گیا ہے۔ (۱) پس کائنات کی خلقت کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کی اس دعوت میں استحکام پیدا کیا جائے جو انبیاء و اولیاء کے ذریعے سے انجام پاتی ہے۔

فلسفہ ثواب و عقاب:

”ثم جعل الثواب على طاعته، ووضع العقاب على معصيته“

(پھر اس نے اپنی اطاعت کے لئے ثواب و جزا اور نافرمانی کے لئے عقاب و سزا مقرر فرمائی ہے)

”زيادة لعبادة عن نعمته“

(ایسے کام جو خدا کے قہر و غضب کا موجب بنتے ہیں ان سے اپنے بندوں کو دور رکھے)

لفظ ”زيادة“ زاد، يزداد کا مصدر اور یہ ”زد“ سے مشتق ہے اس کی اصل ”ذوادة“ تھی واد، الف میں بدل دی گئی ہے اور اس طرح ”زيادة“ ہو گیا۔ اس کے معنی روکنے اور منع کرنے کے ہیں۔ اس جملہ کا مقصد یہ ہے کہ خداوند چاہتا ہے کہ اپنے بندوں کو ایسے امور سے دور رکھے جو خدا کے غیظ و غضب اور قہر کا سبب بنتے ہیں (لہذا ان امور کو حرام قرار دے کر ان سے روکا گیا ہے) اطاعت پر ثواب اور معصیت

۱۔ اصول کافی کتاب التوحید باب حدوث العالم کی پانچویں روایت میں نقل ہوا ہے کہ: ”... فلما راينا الخلق منتظما والفلک جاريا والتدبير واحدا... دل ص ۱۸۰۔ علی ان المدبر واحد...“ یعنی جب کائنات میں ایک خاص نظم و ترتیب اور تدبیر کا مشاہدہ کرتے ہیں تو نظام کا صحیح ہونا اور اس کا استحکام، اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس نظام کو چلانے والا بھی صرف ایک ہی ہے، نیز روایت نمبر ۱ سے ۴ میں اسی مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پر عقاب و عذاب مقرر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عقاب کا باعث بننے والے کاموں سے انسان کو روکے اور اس طرح حضرت انسان کو جنت کی طرف لے چلے۔ بنا برائیں، ثواب و عقاب کے اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ بندگان خدا اس کی (ابدی) نعمتوں (اور نوازشوں) سے فائدہ اٹھائیں۔ پس اطاعت کرنے اور نافرمانی سے اجتناب کا فائدہ صرف انسان کو ملتا ہے، خدا کا اس میں کوئی فائدہ اور اس کی کوئی (ذاتی) غرض نہیں ہے کیونکہ یہ انسان ہیں جو اطاعت کے نتیجے میں ثواب اور کمال کے (درجات) پر فائز ہوں گے اور معصیت و گناہ سے دور رہنے کی وجہ سے خدا کے قہر و غضب اور عذاب سے محفوظ رہیں گے۔

”وحياشة لهم الى جنته“

(۔ ثواب و عقاب اس لئے کہ۔ بندوں کو جنت کی طرف جمع کرے)

”حیاشہ“ کا لفظ ”حاش یحوش“ کے مصدر سے ہے اور جمع کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جب مال مویشیوں کو کسی جگہ پر جمع کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ ”حاشم“ یعنی ان کو اکٹھا کیا گیا ہے۔

”حیاشتہ لهم الى جنته“ ”جمعاً لهم الى جنته“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے لہذا اس جملہ کا مقصد یہ ہو گا کہ : خدا چاہتا ہے کہ انسانوں کو اختلاف و تفرقے سے نجات دلائے اور ان کو (دین کے پلیٹ فارم پر) متحد کرے اور ان کو جمع کرے اور بہشت کا شوق دلا کر انہیں جنت کی راہ پر گامزن کرے۔

خلاصہ یہ کہ خدا کا مقصد یہ تھا کہ انسان (معنوی ترقی اور) تکامل پیدا کرے اور ایسے امور سے اجتناب کرے جو انسان کو خدا کے غیظ و غضب میں مبتلا کر دیتے ہیں (۱)۔ البتہ کمال کے درجات ہیں اور وہ بہشت جس کا وعدہ خدا نے اپنے نیک بندوں کو دے رہا ہے اس بہشت سے کہیں بلند و بالاتر ہے جس کے انتظار میں ہم بیٹھے ہوئے ہیں۔ قرآن اس بارے میں فرماتا ہے کہ : ”ورضوان من اللہ اکبر (۲)“ (رضائے خداوندی کا مقام بہت بالاتر ہے)۔

۱۔ اس جملے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بہشت اور جنت کسی قوم کے اختلاف و تفرقہ کے ساتھ سازگار نہیں کیونکہ اختلاف اور افتراق کی وجہ سے (افراد اور معاشرے کے) بہت سے جائز حقوق ضائع ہو جاتے ہیں۔

۲۔ سورہ توبہ / ۷۲۔

بہشت رضوان ایسی ہے جہاں بندہ اپنے بارے میں خدا کی رضا اور خوشنودی کا احساس کرتا ہے
 (کمال اور درجات کے اعتبار سے) اور یہ اس جنت کے مقابلے میں کہیں بلند و بالاتر ہے، جہاں مادی
 لذتوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا گیا ہے (۱۱) اور اس کی خصوصیات، حور و قصور اور باغ و بہستان کے
 ضمن میں بیان کی گئی ہیں۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

۱۔ اہل معرفت دو قسم کی بہشت کے قائل ہیں، ایک جنت محسوس جو آخرت میں حواس کے ذریعے احساس کی جاسکے گی، دوسری
 جنت معقول، جو جنت محسوس سے بالاتر ہے۔ ہر کیف دونوں جنتوں کے مراتب اور درجات ہیں۔ بہشت رضوان اور بہشت لقاء جو
 اولیاء اللہ کے ساتھ مخصوص ہے جنت معقول کے (عالی) درجات میں شمار ہوتی ہیں۔

تیسرا درس:

- ✽ مقام بندگی، مقام رسالت کا سبب ہے
- ✽ رسالت سے قبل کے مقامات
- ✽ تورات اور انجیل کی پیشین گوئی
- ✽ خلقت کائنات سے قبل، پیغمبر اکرم (ص) کا انتخاب
- ✽ کائنات کے بارے خدا کا علم ازلی
- ✽ رسالت پیغمبر (ص) کے مقاصد
- ✽ عصر بعثت کی معاشرتی اور مذہبی صورت حال
- ✽ انسانوں کی ہدایت کے لئے پیغمبر (ص) کا قیام
- ✽ رسول خدا (ص) کی رحلت
- ✽ سامعین سے خطاب
- ✽ قرآن اور عترت (ع)، پیغمبر (ص) کی دو یادگار چیزیں
- ✽ ہدایت کرنے والی، قرآن کی خصوصیات

وَأَشْهَدُ أَنَّ أَبِي مُحَمَّدًا عَلَيْهِ السَّلَامُ عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، اخْتَارَهُ وَانْتَجَبَهُ قَبْلَ أَنْ
 أَرْسَلَهُ، وَسَمَّاهُ قَبْلَ أَنْ اجْتَبَاهُ، وَاصْطَفَاهُ قَبْلَ أَنْ ابْتَعَثَهُ؛ إِذِ الْخَلَائِقُ بِالْغَيْبِ
 مَكْنُونَةٌ وَبِشْرِ الْأَهْوِيلِ مَصُونَةٌ وَبِنَهَايَةِ الْعَدَمِ مَقْرُونَةٌ، عِلْمًا مِنْ اللَّهِ تَعَالَى بِمَائِلِ
 الْأُمُورِ، وَإِحَاطَةً بِخَوَادِثِ الدُّهُورِ، وَمَعْرِفَةً بِمَوَاقِعِ الْمَقْدُورِ؛ ابْتَعَثَهُ اللَّهُ إِتْمَامًا
 لِأَمْرِهِ وَعَزِيمَةً عَلَى إِمْضَاءِ حُكْمِهِ وَإِنْفَاذًا لِمَقَادِيرِ حُكْمِهِ، فَرَأَى الْأُمَّمَ فِرْقًا فِي
 أَذْيَانِهَا، عُكْفًا عَلَى نِيرَانِهَا، غَابِدةً لِأَوْثَانِهَا، مُنْكَرَةً لِلَّهِ مَعَ عِرْفَانِهَا؛ فَأَنَارَ اللَّهُ بِأَبِي
 مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ ظُلْمَهَا، وَكَشَفَ عَنِ الْقُلُوبِ بُهْمَهَا، وَجَلَّى عَنِ الْأَبْصَارِ غُمَمَهَا؛ وَقَامَ
 فِي النَّاسِ بِالْهِدَايَةِ، فَأَنْقَذَهُمْ مِنَ الْغَوَايَةِ، وَبَصَّرَهُمْ مِنَ الْعِمَايَةِ، وَهَدَاهُمْ إِلَى
 الدِّينِ الْقَوِيمِ، وَدَعَاهُمْ إِلَى الصِّرَاطِ الْمُسْتَقِيمِ؛ ثُمَّ قَبَضَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ قَبْضَ رَأْفَةٍ وَ
 اخْتِيَارٍ، وَرَغْبَةٍ وَإِثَارٍ؛ فَمُحَمَّدٌ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنْ تَعَبِ هَذِهِ الدَّارِ فِي رَاحَةٍ، قَدْ حُفِّ
 بِالْمَلَائِكَةِ الْأَبْرَارِ، وَرِضْوَانِ الرَّبِّ الْغَفَّارِ، وَمُجَاوَرَةِ الْمَلِكِ الْجَبَّارِ؛ صَلَّى اللَّهُ عَلَى
 أَبِي نَبِيِّهِ وَآمِينَهِ عَلَى الْوَحْيِ وَصَفِيِّهِ وَخَيْرَتِهِ مِنَ الْخَلْقِ وَرَضِيِّهِ، وَالسَّلَامُ عَلَيْهِ
 وَرَحْمَةُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ.

ثُمَّ التَفَتَتْ إِلَى أَهْلِ الْمَجْلِسِ وَقَالَتْ:

أَنْتُمْ عِبَادُ اللَّهِ وَنَصَبَ أَمْرِهِ وَنَهْيِهِ، وَحَمَلَةَ دِينِهِ وَوَحْيِهِ، وَأُمْنَاءُ اللَّهِ عَلَى
 أَنْفُسِكُمْ وَبُلْغَائِهِ إِلَى الْأُمَّمِ، وَزَعَمْتُمْ حَقُّ لَكُمْ، لِلَّهِ فِيكُمْ عَهْدٌ قَدَمَهُ إِلَيْكُمْ وَبَقِيَّةُ
 اسْتَخْلَفَهَا عَلَيْكُمْ، كِتَابُ اللَّهِ النَّاطِقُ وَالْقُرْآنُ الصَّادِقُ وَالنُّورُ الشَّاطِعُ وَالضِّيَاءُ
 اللَّامِعُ، بَيِّنَةٌ بِضَائِرُهُ، مُنْكَشِفَةٌ سَرَائِرُهُ، مُنْجِلِيَّةٌ ظَوَاهِرُهُ، مُغْتَبِطَةٌ بِهِ أَشْيَائُهُ، قَائِدٌ
 إِلَى الرِّضْوَانِ اتِّبَاعِهِ، مُؤَدٍّ إِلَى النِّجَاةِ اسْتِمَاعِهِ، بِهِ تَنَالُ حُجُجُ اللَّهِ الْمُنَوَّرَةِ وَ
 عَزَائِمُهُ الْمُفَسَّرَةِ وَمَحَارِمُهُ الْمُحَذَّرَةِ، وَبَيِّنَاتُهُ الْجَالِيَةِ، وَبَرَاهِينُهُ الْكَافِيَةِ، وَ
 فُضَائِلُهُ الْمُنْدُوبَةِ، وَرُخْصَتُهُ الْمَوْهُوبَةِ، وَشَرَائِعُهُ الْمَكْتُوبَةُ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

مسجد نبوی میں حضرت زہراء (ع) کے خطبہ کو ہم عبد اللہ بن حسن (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ) کی روایت کے مطابق نقل کر رہے تھے (البتہ تفصیل اور زیادہ تشریح نہیں ہے بلکہ تحت اللفظی ترجمہ اور مختصر سی وضاحت ہے اور اس میں تمام طبقوں کو مد نظر رکھا گیا ہے)۔

گزشتہ درس میں حضرت زہراء (ع) کی خدا کی وحدانیت پر گواہی (پر مشتمل ابحاث) کو بیان کیا گیا ابھی انہی کی زبانی رسول خدا (ص) کی رسالت کی گواہی کو شروع کرتے ہیں۔

مقام بندگی، مقام رسالت کا سبب ہے،

”واشهد ان ابی محمداً عبداً ورسولہ“

(میں گواہی دیتی ہوں کہ میرے پدر بزرگوار محمد (ص) خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے)

یہاں پر حضرت (زہراء (ع)) نے ”عبدہ“ کے لفظ کو لفظ ”رسولہ“ سے پہلے ذکر کیا، تشہد میں بھی ہم کہتے ہیں کہ ”اشہدان محمداً عبداً ورسولہ“ یعنی ”عبدہ“ کو پہلے اور ”رسولہ“ کو بعد میں ذکر کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام (ص) خدا کا بندہ تھا اور آپ بندگی و عبودیت میں انتہائی بلند و بالا مقام پر فائز ہو چکے تھے (اور مقام بندگی میں اس حد تک مکمل کی وجہ سے) آپ کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ آپ خدا کے پیغمبر اور رسول بن سکیں اور نبوت و رسالت کی ذمہ داری آپ کو سونپی جائے۔

قرآن میں خداوند ”سبحان الذی اسرى برسوله“ کہنے کے بجائے یہ فرماتا ہے کہ: ”سبحان الذی اسرى بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ“ (۱) (پاک و منزہ ہے وہ خدا جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی جانب لے گیا)۔ یہاں پر بھی رسول کے بجائے لفظ عبد کو انتخاب کرنے کا سبب شاید یہی ہو سکتا ہے کہ: چونکہ آپ (ص) خدا کے ایک بندے ہونے کے اعتبار سے بندگی کے اعلیٰ ترین درجات پر فائز تھے تو خدا نے اس رات آپ (ص) کو معراج کا شرف بخشا، پس عبودیت رسالت کا سبب اور اس سے مقدم ہے (۲)۔

رسالت سے قبل کے مقامات

”اختارہ وانتخبہ قبل ان ارسلہ“

(خداوند (جل جلالہ) نے آپ (ص) کو رسول بنانے سے پہلے ہی آپ (ص) کو انتخاب کر لیا تھا) ”اختار“ باب افتعال سے مفرد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں انتخاب کیا۔ ”انتخب“ بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

خدا نے آپ (ص) کو رسول بنا کر بھیجنے سے پہلے ہی آپ (ص) کو انتخاب کیا تھا۔ اس اعتبار سے کہ رسالت کا منصب سنبھالنے سے قبل ہی خدا کی خصوصی توجہ اور عنایات آپ (ص) کے شامل حال تھیں۔ خدا نے آپ (ص) ہی کا انتخاب فرمایا تھا اور آپ (ص) کے اندر (رسالت کی ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے) کافی صلاحیت اور مکمل لیاقت موجود تھی۔ آپ (ص) مقام رسالت پر فائز ہوئے، کیونکہ ہر کوئی خدا کا رسول اور پیغمبر نہیں بن سکتا۔

۱۔ سورۃ اسراء / ۱۔

۲۔ یہ معروف حدیث کہ: ”العبودیۃ جوہرۃ کنہا الربوبیۃ“، یعنی مقام بندگی ایک ایسا گوہر ہے کہ جس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ہی خدا کے لئے بن جائے، یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ رسالت اور معراج انسان کا اصلی سبب چاہے جسمانی ہو یا روحانی، اور اسی طرح دیگر معنوی کمالات کے بالاترین درجات پر فائز ہونے کی بنیاد، عبودیت ہی ہے۔ (عبودیت یعنی انسان اپنی فکر و نظر، اپنے قلب و ضمیر اور اعضاء و جوارح کو خدا کی حاکمیت کے حوالے کر کے اس کے تقاضوں کو پورا کرے)۔

”وَسَمَّا قَبْلَ اِنْ اِجْتَبَا“

(اور خدا نے آپ (ص) کے انتخاب سے پہلے ہی آپ (ص) کے اسم مبارک کا ذکر فرمایا)

یہاں پر دو احتمال ہیں:

۱۔ شاید آپ (ع) کی مراد یہ ہو کہ پیغمبر اکرم (ص) کے اس دنیا میں مقام نبوت پر مبعوث ہونے سے پہلے ہی خدا نے حضرت آدم (ع) اور دوسرے انبیاء (ع) نیز فرشتوں کے سامنے آپ (ص) کا ذکر کیا ہو اور ان کو آپ (ص) کے نام مبارک سے آگاہ فرمایا ہو۔

۲۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ (ص) کے رسالت پر مبعوث ہونے سے قبل خدا نے آپ (ص) کا اسم مبارک ”محمد“ تعیین فرمایا ہو۔

تورات اور انجیل کی پیشین گوئی:

”وَاصْطَفَا قَبْلَ اِنْ اِبْتَعَثْهُ“

(رسالت پر مبعوث ہونے سے قبل ہی خدا نے آپ (ص) کا انتخاب کیا)

پیغمبر اکرم (ص) کی اوصاف (حمیدہ) میں سے ایک صفت مصطفیٰ (یعنی برگزیدہ) ہے۔ تورات میں آپ (ص) کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان میں سے ایک صفت ”برگزیدہ“ ہے۔ (آپ کو شش کریں کہ تورات اور انجیل کا مطالعہ کریں کیونکہ وہاں مفید مطالب بیان ہوئے ہیں۔)

تورات میں (اپنے عمامہ تر معنی کے مطابق) کتاب ”اشعیاء“ کے بتالیسویں باب میں بیان ہوا ہے کہ ”ابھی میرا برگزیدہ...“ میرا برگزیدہ کے اس لفظ کے بعد ایسی صفتیں بیان ہوئی ہیں جو پیغمبر اکرم (ص) پر مکمل صادق آتی ہیں لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ وہاں پر بھی لفظ مصطفیٰ ہی ذکر ہوا ہو، لیکن تورات کا ترجمہ کرنے والوں نے مصطفیٰ کے لفظ کو بعینہ ذکر کرنے کے بجائے اس کا بھی ترجمہ کر دیا ہو، کیونکہ تورات کے مترجمین کی ایک غلطی یہی تھی کہ وہ ناموں کا بھی ترجمہ کر دیتے تھے، مثلاً انجیل میں آنحضرت (ص) کے جو مختلف نام ذکر ہوئے ہیں ان میں سے ایک ”احمد“ ہے جیسا کہ قرآن کریم نے

بھی حضرت عیسیٰ (ع) کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ: ”و مبعثاً برسول یاق من بعدی اسمہ احمد (۱)“ لیکن ترجمہ کرنے والوں نے ”احمد“ کا ترجمہ کر کے تن میں ترجمے کو لکھ دیا۔ مثال کے طور پر فارسی میں ”بسیار ستودہ“ اور انگریزی میں ”پری کلیٹس“ لکھا ہے (۲) اور حالانکہ مناسب (بلکہ لازم) یہ تھا کہ تلفظ ”احمد“ ہی کو لکھ دیتے۔ لہذا ممکن ہے کہ تورات کی کتاب ”اشعیاء“ کے اصلی تن میں ”مصطفیٰ“ ہی ذکر ہوا ہو اور مترجمین نے اسے ”برگزیدہ“ کے لفظ سے ترجمہ کیا ہو۔ اس مطلب پر ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ وہاں ایسی صفات بیان ہوئی ہیں جو پیغمبر اکرم (م) اور ان کی امت پر مکمل صادق آتی ہیں (۳)۔

بہر صورت پیغمبر کے اوصاف میں سے ایک آپ (م) کا مصطفیٰ (خدا کی طرف سے برگزیدہ) ہونا ہے اور یہاں پر حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: ”خدا نے آپ (م) کو اس وقت چنا جب آپ (م) پیغمبر کی حیثیت سے مبعوث نہیں ہوئے تھے۔“

۱۔ سورہ صف ۶/ (میں تمہیں ایک ”رسول“ کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا)۔
 ۲۔ ”پری کلیٹس“ یعنی وہ شخص جس کی زیادہ تعریفیں کی جائیں۔ اس لفظ کا معرب ”فارقلیط“ ہے۔
 ۳۔ تورات، کتاب اشعیاء کے ۴۲ ویں باب میں آیا ہے کہ ”اس وقت میرا وہ بندہ جس کی میں نے دستگیری کی اور میرا وہ ”برگزیدہ“ بندہ“ کہ میری جان اس سے خوشنود ہے، میں اپنی جان (یعنی رحمت) کو اسے دوں گا تاکہ وہ ساری قوموں کے لئے انصاف فراہم کرے، وہ فریاد و نالہ نہیں کرے گا۔ وہ اپنی آواز کو اونچا نہیں کرے گا اور اسے گلی کو چوں میں نہیں سنوائے گا، ٹوٹی ہوئی نی کو نہیں توڑے گا۔ ٹٹھماتے ہوئے چراغوں کو خاموش نہیں کرے گا۔ یہاں تک کہ صحیح معنوں میں عدالت قائم کرے گا، وہ کمزور ہو کر شکست نہیں کھائے گا یہاں تک کہ زمین پر انصاف برقرار کرے گا اور (دنیا کے) جزیرے اس کی شریعت کے منتظر ہوں گے، یہ وہ خدا، جس نے آسمانوں کو پیدا کیا اور ان کو پھیلایا، زمین اور اس کی نعمتوں کو بھی پھیلایا اور ایسی قوم کو جس میں جان ہو ان کو جان دے گا اور سالکان راہ کو روح عنایت کرے گا اس طرح فرماتا ہے کہ میں جو یہ وہ ہوں تجھے عدالت کے ہمراہ پکارا ہے اور تیرے ہاتھ پکڑ کر تجھے برقرار اور قائم رکھوں گا اور تجھے امت کے لئے عہد و پیمان اور قوموں کے لئے نور قرار دوں گا تاکہ نابیناؤں کو بینائی دے، اسیروں کو زندان سے رہائی دے اور ظلمت کے باسیوں کو رہائی دلائے، میں یہ وہ ہوں اور میرا نام یہی ہے، میں اپنی عظمت و جلال کو کسی دوسرے کو نہیں دوں گا اور اپنی حمد تراشے ہوئے بتوں کو ہرگز نہیں دوں گا، ابھی ابتدائی واقعات پیش آئے ہیں اور نئی چیزوں کے بارے میں ان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی تمہیں آگاہ کرتا ہوں.....

خلقت کائنات سے قبل، پیغمبر اکرم (ص) کا انتخاب،

”اذا الخلاق بالغیب مکنونۃ“

(ایسے زمانے میں آپ (ص) کا انتخاب عمل میں آیا کہ

تمام موجودات عالم غیب کے پردوں میں پوشیدہ (معدوم) تھے)

حضرت محمد (مصطفیٰ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت خدا نے اپنی خصوصی توجہ اور لطف و کرم سے انتخاب کیا جب دوسرے تمام ممکنات عالم معدوم تھے اور بالفاظ دیگر ”عدمستان“ تھا۔ جیسا کہ انسان اپنی خیالی قوت کے ذریعے سوچتا ہے کہ ایک ایسا زمانہ بھی تھا جسے زمانہ عدم کہا جاتا تھا اور تمام موجودات اس تاریک ”عدمستان“ میں خاموش پڑے ہوئے تھے پھر وہاں وجود کی نورانی کرنیں پڑیں اور انہیں روشن کیا اس طرح موجودات نے عالم عدم سے عالم وجود میں قدم رکھا۔ گفتگو اور تلفظ کے مقام پر بھی کہا جاتا ہے کہ ”عالم عدم میں“ یعنی ایسے دور میں جبکہ کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ بہر حال چونکہ خدا کا علم ازل ہی ہے نظام وجود کی خلقت سے قبل ہی خدا کو معلوم تھا اور اس پر مکمل احاطہ کر رکھتا تھا کہ یہ نظام ہستی کب تحقق پذیر ہوگا اور کس مرتبہ اور مقام کا حامل ہوگا یہ سب خدا بہتر طور پر جانتا تھا۔ اسی مرتبہ میں جب کسی چیز کا کوئی وجود ہی نہیں تھا اور تمام خلائق معدوم اور پردہ غیب میں پھنساں تھے تو خداوند سبحان نے پیغمبر (ص) کو چنا اور اپنی ذات کے لئے آپ (ص) کو انتخاب فرمایا (۱)۔

”وبستر الاہاویل مصونۃ“

(اور اس وقت پیغمبر (ص) کو اپنے لئے چنا جب مخلوقات خوف و ہراس

اور وحشت و اضطراب کے پردوں میں محفوظ تھیں)

”اہاویل“ اہوال کی جمع اور اہوال، ہول کی جمع ہے۔ بنا بریں ”اہاویل“ جمع الجمع (۲) ہے اور ”ہول“

۱۔ رسول خداؐ چونکہ اشرف مخلوقات ہونے کی وجہ سے انسان کامل کا کاملترین مصداق ہیں اور یہی کائنات کا بنیادی مقصد بھی ہے اور حدیث قدسی: ”لولاک لما خلقت الافلاک“ بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ کائنات کی خلقت کا بنیادی مقصد اس کی تخلیق سے قبل ہی خدا کے علم میں تھا۔

۲۔ یعنی ایک لفظ جو کہ جمع ہے اس کی بھی جمع ہو جیسے اہاویل جمع ہے اہوال کی اور اہوال جمع ہے ہول کی۔

کے معنی ہیں، خوف و ہراس اور وحشت۔

حضرت زہراء (ؑ) یہ فرمانا پاہتی ہیں کہ خداوند عالم نے اس وقت پیغمبر اسلام (س) کا انتخاب فرمایا جب تمام موجودات، عالم عدم میں خوف و وحشت کی حالت میں (سرگردان اور پنهان) تھے البتہ تعبیریں مجازی ہیں اور تقریر اور خطاب کے مقام پر استعمال کی جاتی ہیں ورنہ موجود ہونے سے قبل، موجودات کی کوئی حیثیت ہی نہیں کہ جو عدستان نامی کسی عالم میں وحشت و اضطراب کی حالت میں پھسیتے پھریں۔

”وبنہایة العدم مقرونة“

(اور تمام موجودات عدم کی آخری سرحدوں کے قریب تھے)

عالم وجود میں کوئی موجود نامی شئی نہیں تھی، تمام موجودات معدوم محض تھے۔ ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ اس وقت جبکہ کچھ بھی نہ تھا تو خدا نے کس طرح اس وقت پیغمبر اکرم (س) کا انتخاب کیا؟ اس سوال کے جواب کو ذیل کے فقرہ میں خود حضرت زہراء (ؑ) نے بیان کر دیا ہے۔

کائنات کے بارے میں خدا کا علم ازلی،

”علماً من اللہ تعالیٰ بمایل (۱) الامور...“

(عدم محض کے دور میں پیغمبر کا انتخاب فرمایا کیونکہ خداوند ہر چیز کے انجام اور اس کی عاقبت سے آگاہ ہے) (یہاں پہلے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ) اگرچہ اس وقت کوئی چیز نہیں تھی لیکن خداوند تبارک و تعالیٰ مستقبل سے آگاہ اور مطلع تھا، وہ نظام ہستی کے بارے میں بخوبی علم رکھتا تھا کہ مستقبل میں کیسے کیسے واقعات رونما ہوں گے اور اس نظام ہستی کا نچوڑ اور خلاصہ، حضرت محمد مصطفیٰ (س) جیسے گل دستے کی شکل میں سامنے آئے گا۔

جب ایک کسان کوئی باغ لگاتا ہے تو پہلے دن سے ہی ان لذیذ میوہ بھات کی طرف اس کی نظر ہوتی ہے جو اس کی جدوجہد اور سعی و عمل کے نتیجے میں اس کو نصیب ہوتے ہیں اس مقصد کو علت غائی

۱۔ بعض دوسرے نسخوں میں ”بمایل الامور“ کے بجائے ”بمایل الامور“ ذکر ہوا ہے۔

سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (اس مثال سے واضح ہوا کہ) خداوند عالم نے جو کہ علام الغیوب ہے (کائنات کی علت غائی) حضرت پیغمبر اسلام (س) کو انزل سے ہی انتخاب کیا تھا اور آپ (س) پر ابتداء ہی سے خصوصی توجہ تھی۔

حضرت زہراء (ع) پیغمبر اکرم (س) کے کمال اور آپ (س) کی عظمت کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس سوال کا جواب بھی دینا چاہتی ہیں کہ جب کچھ بھی نہیں تھا تو کس طرح خدا نے آنحضرت کا انتخاب فرمایا؟ اس ممکنہ سوال کے جواب میں فرماتی ہیں کہ:

(۱) ”علماً من اللہ تعالیٰ بمایل الامور“

(خدا انزل سے ہی تمام امور کے انجام کو جانتا ہے)

بنابریں خداوند یہ بھی بخوبی جانتا ہے کہ کائنات وجود میں آئے گی اور اس نظام کی علت غائی اور ہدف و مقصود میرے حبیب محمد مصطفیٰ (س) ہوں گے۔

”مایل“ (اول) سے مشتق ہے اور ”اول“ کے معنی ہیں کسی چیز کا مستقبل اور آئندہ۔

(۲) ”واحاطة بحوادث الدهور“

(خداوند انزل سے حوادث روزگار پر مکمل علمی احاطہ رکھتا تھا اور بخوبی جانتا تھا)

ابتداء ہی سے خداوند جانتا تھا کہ یہ عالم، حوادث کا عالم ہو گا، اس میں مختلف حوادث اور گونا گوں واقعات رونما ہوں گے آخر کار (کائنات کے اس تکاملی سفر میں) ایک موڑ پر محمد مصطفیٰ (س) نامی وہ بزرگوار پیغمبر (اپنے وجود سے اس نظام کو زینت بخشنے گا) یہ پیغمبر اشرف مخلوقات اور انسانوں کا ایک مکمل نمونہ ہو گا۔

بعبارت دیگر: ابتداء ہی سے خداوند حوادث عالم سے آگاہ تھا لہذا رسول خدا (س) کی ذات کو اپنے لئے انتخاب کیا، چونکہ آپ (س) ایک انسان کامل کا مظہر اور خلقت کی علت غائی تھے اور (یہ واضح سی بات ہے کہ) مقصد اور علت غائی ابتداء ہی سے توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔

(۳) ”ومعرفة بمواقع المقدور“

(خداوند انزل سے مخلوقات کے۔ اس کائنات میں کسب کرنے والے۔ مقام اور ان کی حیثیت سے آگاہی رکھتا تھا)۔

”مقدور“ یعنی خدا کے مقدرات (موجودات عالم جن کی خلقت پر خدا قادر ہے اور خدا نے ان کی حیثیت، مقام و مرتبہ اور کردار و خصوصیات کو معین فرمایا ہے) ”بمواقع المقدور“ ممکنات عالم کی حیثیت اور مقام اور پر کے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ خداوند ازل سے جانتا تھا کہ کائنات کا ہر ذرہ موجود ہونے کے بعد اس کا کیا مقام اور مرتبہ ہوگا۔ بطور مثال، خدا ابتداء سے ہی آگاہی رکھتا تھا کہ (مخلوقات میں سے) ایک پیغمبر اکرم (ص) ہوگا تو دوسرا، اس کے مقابل میں ابوسفیان اور ابو جہل اور کوئی امام حسین (ع) ہوگا تو کوئی دوسرا شمر۔ پس حضرت آدم (ع) کی خلقت سے قبل پیغمبر اکرم (ص) کے انتخاب اور چناؤ کے معنی یہ ہیں کہ عالم طبیعت کا یہ نطفہ اور یہ (آب و) خاک تکامل کے مراحل طے کرتے ہوئے اپنی آخری منزل پر جب پہنچے گا تو اس کا لذیذ پھل، حضرت محمد (ص) کی مقدس ذات کی شکل میں نمودار ہوگا (۱)۔

رسالت پیغمبر (ص) کے مقاصد،

(۱) اس بارے میں چار امور کا ذکر خطبہ میں ہوا ہے: (۱) کائنات کی تکمیل (۲) حکم ازل کا جاری ہونا (۳) حتمی فیصلوں کا نفاذ (۴) انسانوں کی روشنیوں کی طرف ہدایت

(۱) ”ابتعثہ اللہ اتماماً لامرہ“

(خدا نے رسول خدا (ص) کو مبعوث فرمایا تاکہ اپنے امر۔ کائنات کی تکمیل کرے)

وہ کمالات جن کا کائنات میں موجود ہونا ضروری تھا، خدا نے چاہا کہ ان کمالات کو آنحضرت (ص) کو مبعوث کرنے کے ذریعے سے مستحق کیا جائے، یعنی آپ (ص) تشریف لائیں، دوسروں کو ہدایت اور ان کی رہبری کریں اور جس کام کی تکمیل کا خدا خواہاں تھا اسے تکمیل اور تمام کریں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ خدا نے بشر کی ہدایت کے لئے بہت سے پیغمبروں کو مختلف دینوں کے ساتھ بھیجا، چونکہ وہ

۱۔ البتہ یہ جبر کے نتیجے میں نہیں بلکہ اپنی آگاہی اور ارادے کے ساتھ یہ تکاملی سفر طے کیا جائیگا، کیونکہ خدا کا ازل علم، انسان نامی ایک ایسی مخلوق سے تعلق رکھتا ہے جو اپنے عقل و اختیار کی مدد سے معنوی تکامل کے مراحل کو اپنے ارادے اور اپنی معرفت کے ذریعے طے کر سکتا ہے اور اس راہ میں رسول اکرم (ص) جیسی بعض ہستیاں تکامل اور ترقی کی چوٹی تک پہنچ سکتی ہیں اور ”کون جامع“ (مخلوقات کا نچوڑ) کی اصطلاح کا مصداق بن جاتی ہیں۔

• دین اپنے زمانے کے ساتھ مخصوص ہوتے تھے، بعد میں آنے والے پیغمبر کے ذریعے تکمیل کے مراحل سے گزرتے آئے، یہاں تک کہ خدا کا عظیم الشان نبی (ص) دین اسلام کے ساتھ مبعوث ہوا تاکہ انسانیت کو (خدا کی طرف) ہدایت کرے۔ اس دین کی تشریح اور توضیح کی ذمہ داری رسول خدا (ص) اور آپ (ص) کے گرانقدر اوصیاء کو سونپی گئی۔

دین اسلام دوسرے تمام ادیان سے جامع تر اور کاملتر ہے اور اسی دین کے ذریعے خدا نے اپنے بندوں پر حجت تمام کی، کیونکہ اسلام انسانیت کے لئے ایک جامع اور ہمہ گیر نظام (حیات) رکھتا ہے اور فردی و اجتماعی، عائلی اور سیاسی، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں انسان کی راہنمائی کرتا ہے، نیز یہ دین کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں اور ہر قسم کی کمی اور نقص سے پاک ہے۔ اگرچہ ایک مسائل میں ہم مشکلات کا شکار ہو جائیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے دین کو صحیح طریقے سے سمجھا نہیں ہے لہذا اس نقص اور کمی کا سبب ہم ہی ہیں نہ دین اسلام۔ اگر ظالم و جابر حکمران اور سلاطین، ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کو یہ موقع فراہم کرتے کہ وہ دین کو صحیح اور مکمل طریقے سے بیان فرماتے اور (ائمہ کو) صحیح معنوں میں اسلامی ریاست قائم کرنے کی فرصت ملتی اور آنحضرت (ص) کی احادیث، آپ (ص) کے بیانات اور آپ (ص) کی سیرت طیبہ، آنے والی نسلوں تک پہنچنے دیتے (اور اس راہ میں گمراہ کن اور خطرناک رکاوٹیں کھڑی نہ کرتے) تو انسانیت ہر دور میں اپنی فطرت کے مطابق خدا شناسی اور توحید کی طرف کھینچتی چلی جاتی کیونکہ توحید اور خدا شناسی جو دین اسلام کی بنیاد ہے، کی عمارت فطرت پر کھڑی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ: ”فطرۃ اللہ الّٰہی فطر الناس علیہا، لا تبدل لخلق اللہ (۱)“ (خدا پر ایمان۔ وہی فطرت خداوندی ہے کہ جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، خدا کی خلقت میں کوئی تبدیلی ناممکن ہے)۔

احادیث اور اسلامی احکام کا وہ مجموعہ جو ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، علوم و معارف کا عظیم سمندر ہے اور بعض موارد میں صدیاں گزرنے کے بعد آج کی دنیا جس حقیقت کو

درک کر رہی ہے اور صدیوں قبل کسی موضوع پر امام صادق علیہ السلام نے جو بات فرمائی تھی دانشور اور محققین آج اس کو سمجھ رہے ہیں۔ یہ بات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلام ایک خاص زمانے اور ماحول کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ قیامت تک کاروان انسانیت کی ہدایت کا ضامن اور ان پر حجت ہے۔

بنابراین خدا نے دین اسلام کو نازل فرمایا اور رسول خدا (ص) کو مبعوث فرمایا تاکہ بندوں پر اپنی حجت تمام کرے۔

(۲) ”وعزیمۃ علی امضاء حکمہ“

(پنمیر (ص) کی بعثت کے ذریعے خدا یہ چاہتا تھا کہ دستور و منشور ازل کو نافذ اور جاری کرے)

ابتداء ہی سے خدا یہ چاہتا تھا کہ اس دنیا میں کامل ہستیاں پیدا ہو جائیں اور انسان مکارم اخلاق کے زیور سے آراستہ ہو جائے اور اسی مقصد کے حصول کی خاطر آنحضرت (ص) کو پنمیر بنا کر بھیجا تاکہ رسول مقبول (ص) اور دین اسلام کے ذریعے اپنے اس حکم اور مشیت کو عملی جامہ پہنائے۔ رسول خدا (ص) سے (ایک) حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا ہے: ”بعثت لاتمم مکارم الاخلاق“ (مجھے پنمیر کا منصب سونپا گیا تاکہ میں اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کروں) درحقیقت رسول خدا (ص) کی پنمیری کا بنیادی مقصد اور فلسفہ یہ تھا کہ انسانوں کو کمال اور حق مطلق کی طرف ہدایت کی جائے اور خدا کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے محبوب کی بعثت کے ذریعے اپنے ازل حکم اور منشور کو جاری کرے۔

(۳) ”وانفاذاً لمقادیر حتمہ (۱)“

(خدا نے رسول خدا (ص) کو بھیجا تاکہ اپنے حتمی فیصلوں کو نافذ کرے)

کبھی موصوف، صفت کی طرف اور کبھی صفت موصوف کی طرف اضافہ ہوتے ہیں۔ اس عبارت میں موصوف یعنی ”مقادیر“ اپنی صفت ”حتمہ“ کی طرف اضافہ ہوا ہے۔ ”انفاذ“ کسی حکم کے جاری کرنے

۱۔ بعض دوسرے نسخوں میں ”لمقادیر رحمۃ“ مذکور ہے۔ بنابر اس جملے کا معنی یہ ہوگا کہ چونکہ قرآنی تعبیر کے مطابق آپ ”رحمۃ للعالمین“ ہیں لہذا خدا کی تکوینی اور تشریعی رحمت کا نفاذ اور اجرا آپ کی بعثت سے مکمل ہوتا ہے۔

کو کہتے ہیں "لمقادیر حتمہ" یعنی، خدا کے حتمی اور اٹل فیصلے۔ خدا کے حتمی اور ناقابل تبدیل و تنسیخ فیصلوں میں سے ایک یہ تھا کہ رسول اکرم (ص) اس کائنات میں تشریف لائیں اور پیغمبری و ہدایت کا منصب سنبھال لیں، بنا بریں آپ (ص) کے مبعوث ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ خداوند جل جلالہ نے اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد فرمایا اور اس کو جاری فرمایا۔

عصر بعثت کی معاشرتی اور مذہبی صورت حال،

"فراى الامم فرقا فى ادیانها"

(جب بعثت کا وقت آیا۔ پس دیکھا کہ قومیں دین و مذہب کے لحاظ سے مختلف فرقوں میں بٹ چکی تھیں) "رای" کے فعل میں جو ضمیر ہے وہ ممکن ہے لفظ اللہ کی طرف پلے اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول خدا (ص) کی طرف پلے، اگر ضمیر کا مرجع لفظ اللہ ہو تو جملہ کا معنی یہ ہو گا کہ اگر آپ پوچھئے کہ خدا نے پیغمبر (ص) کو کیوں مبعوث فرمایا؟ تو آپ (ص) فرماتی ہیں کہ جب خدا نے دیکھا کہ لوگ گردہوں میں بٹ چکے ہیں، بعض بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو کوئی سورج کی عبادت کرنے میں مشغول ہیں، اس وقت دوسرے بہت سارے گردہ چاند اور ستاروں کی پرستش پر کمر باندھے ہوئے ہیں، اس طرح انسانیت اپنے دین کے بارے میں تفرقہ کا شکار ہو کر گردہوں میں بٹ چکی ہے (جب خدا نے انسانوں کی اس حالت کو دیکھا تو آپ (ص) کو بھیجا تا کہ انسانیت کو اختلاف و پراکندگی سے نجات دلائیں) لیکن اگر "رای" کی ضمیر کا مرجع، پیغمبر اکرم (ص) ہو تو مذکورہ فقرہ کا معنی یہ ہو گا کہ جب آپ (ص) مبعوث ہوئے تو آپ (ص) نے دیکھا کہ لوگ مذہبی اختلافات کی وجہ سے گمراہی اور ضلالت کا شکار ہو چکے ہیں۔

"عکفا علی بیدانہا"

(یہ قومیں اس آگ کو سینے سے لگائے ہوئے تھیں کہ جسے خود انہوں نے جلایا تھا)

جس طرح "طالب" کی جمع "طلب" ہے اسی طرح "عاکف" کا جمع "عکف" ہے اور اس کا معنی "ساتھ

رہنے والے" ہے۔

یہاں دو احتمال دئے جاسکتے ہیں: پہلا احتمال یہ کہ ”نیرانہا“ سے آشکدے مراد ہیں اور ”عکف“ سے مجوسی، اس طرح یہ جملہ مجوسیت کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ لوگوں نے زندگی کا جو طریقہ اپنایا ہے وہ ان کو جہنم میں پہنچا دے گا اس طرح وہ اپنے ہاتھوں سے جہنم کی آگ کو جلا رہے ہیں (اور اس کے لئے ایندھن فراہم کرنے میں دن رات مصروف ہیں اس طرح وہ آتش جہنم کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں) (۱)۔

”عابدۃ لاوثانہا“

(اپنے بتوں کی پوجا کرتے تھے)

”اوثان“ ”وثن“ کی جمع ہے اور ”وثن“ کے معنی ہیں بت۔ عصر رسالت میں پوری انسانیت مختلف گروہوں کی شکل میں گمراہی اور ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی اور لوگ خدائے یکتا کی عبادت کے بجائے لکڑی اور پتھر سے بنے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔

”منکرۃ للہ مع عرفانہا“

(خدا کی معرفت رکھنے کے باوجود اس کا انکار کرتے تھے)

ہر انسان کی سرشت میں خدا نے، خدا پرستی اور توحید کو ودیعت کیا ہوتا ہے لہذا خدا کی وحدانیت کا مسئلہ فلسفی اور علمی اعتبار سے ایک طے شدہ اور مسلم بات ہونے کے علاوہ ایک فطری مسئلہ بھی ہے۔ پس اگر ہر انسان، آلودگیوں سے پاک فطرت کی طرف رجوع کرے تو وہ یقین کے ساتھ خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرے گا۔ قرآن بھی فرماتا ہے کہ: ”فطرۃ اللہ الٰہی فطر الناس علیہا، لا تبدل لخلق اللہ (۲)“ (خدا پرستی ہی کی بنیاد پر انسانوں کی خلقت ہوئی ہے اور خدا کا یہ قانون تغیر پذیر نہیں)۔ عصر رسالت میں بھی لوگ خدا کی معرفت رکھتے تھے اور اس کی وجہ ان کی فطرت کی آواز تھی

۱۔ شاید حضرت زہراءؑ کا مقصود یہ ہو کہ اس وقت کے انسان، اپنی جہالت و گمراہی کی بنا پر جس دین و مذہب اور آداب و رسوم پر اعتقاد رکھتے تھے وہ ان کی فکری صلاحیتوں اور شرافتمندانہ زندگی کے اصول کے خلاف آسمانی، بجلی ثابت ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ انہی آداب و رسوم اور باطل ادیان پر کٹ مرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

۲۔ سورۃ روم / ۳۰۔

جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتی تھی لیکن عمل کے میدان میں ندائے فطرت سے روگردانی کر لیتے تھے اور بتوں کو پوجا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا "منکرۃ لئذ" وہ خدا کے منکر تھے حالانکہ "مع عرفانہا" ان کے وجود میں خدا کی معرفت موجود تھی، فطرت اور باطن کے اعتبار سے وہ خدا کی پہچان تو رکھتے تھے لیکن ظاہر میں اور عمل کے میدان میں خدا کا انکار کرتے تھے یا کفار کی مانند عمل کرتے تھے۔

(۴) "فانار اللہ بابی محمد ظلہما"

(پس خدا نے میرے والد گرامی حضرت محمد (ص) کے ذریعے ان کی تاریکیوں کو روشنیوں سے منور کیا) خداوند کریم نے رسول خدا (ص) کو مبعوث فرما کر، طاغوت، جھوٹے بتوں نیز بت پرستوں کی ظلمتوں کا خاتمہ کر دیا اور ایمان، توحید اور خدا پرستی کی روشنیوں سے عالم کو روشن فرمایا۔ آنحضرت (ص) نے معاشرے کو خدا اور صرف خدا پر ایمان کی جانب دعوت دی، بت پرستی اور ظلم و ستم سے مبارزہ کیا اور اس راہ میں مشکلات اور سختیاں برداشت کیں۔ اس طرح ۲۳ سال کی طویل کھٹن اور مشقت آور جدوجہد کے بعد کامیاب ہوئے اور بت پرستی کی جگہ خدا پرستی، دشمنی کی جگہ دوستی اور ظلم و ستم کی جگہ عدالت اور مساوات قائم کی۔

حق بات یہی ہے کہ آنحضرت (ص) کے مبعوث ہونے کی برکت سے ہی خداوند عالم نے اس دور کی تاریکیوں اور ظلمتوں کو نور اور روشنی میں تبدیل فرمایا۔

"وکشف عن القلوب بہمہا"

(اور خدا نے بندوں کے دل سے ابہامات کے پردے ہٹا دیے)

"بہم" کا لفظ "بہم" سے مشتق اور "بہتہ" کی جمع ہے۔ مشکوک اور غیر واضح امور کو "بہم" کہتے ہیں۔ اس زمانے کے لوگوں کے دلوں میں جو ابہامات تھے اور جو حقائق مشکوک اور غیر واضح تھے، خدا نے اپنے حبیب (ص) کے ذریعے ان شکوک کو دور کر کے واضح اور روشن فرمایا۔

اگر کوئی شخص موت و زندگی، کائنات کے مبداء، آخرت اور حشر و نشر کی کیفیت وغیرہ کے بارے میں شکوک و شبہات سے دوچار تھا اور ذہن میں مختلف سوالات اٹھتے تھے تو آپ (ص) نے ان حقائق کو

بیان فرمایا اور ان کے دلوں میں موجود ابھامات کو دور فرمایا۔

”وجلّی عن الابصار غمّمہا“

(دل کی آنکھوں سے۔ جہالت و تحیر۔ کے پردے ہٹا کر اسے بینائی بخشی)

”غمّم“ ”غمّمہ“ کی جمع اور پردے کے معنی میں ہے اور یہ لفظ حیرت کہ جو خود عقل و شعور پر پڑنے والا

ایک پردہ محسوب ہوتا ہے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

خداوند عالم نے ہمارے نبی (م) کو بھیج کر لوگوں کو تحیر اور حیرانگی سے نجات دی اور ان کے دل کی

آنکھوں پر جو پردے پڑے ہوئے تھے انہیں ہٹایا، اس طرح وہ اس قابل ہو گئے کہ حق و عدالت اور

انسانیت کی راہ پر گامزن ہو جائیں اور بربریت و جاہلیت سے دست بردار ہو جائیں۔

انسانوں کی ہدایت کے لئے پیغمبر (ص) کا قیام:

”وقام فی الناس بالہدایۃ“

(آپ (ص) نے لوگوں کی ہدایت کی خاطر قیام کیا)

انسانوں کی ہدایت کے لئے آپ (م) نے کوئی کسر نہ چھوڑی، سختیوں اور شدید مشکلات کو تحمل

فرمایا۔ دنیوی مقام و منصب اور مال و ثروت سے چشم پوشی فرمائی تاکہ ضلالت و گمراہی کی دلدل میں پھنسے

ہوئے انسانوں کو نجات دلائیں اور صراطِ مستقیم اور خدا کی طرف ان کی رہبری کریں۔

”فانقذہم من الغوایۃ، وبصرہم من العمایۃ“

(پس لوگوں کو گمراہی سے نجات دلائی اور ان کو اندھے پن سے نکال کر بصیرت بخشی)

آپ (م) کی ۲۳ سالہ زحمّتوں اور محنت کا ثمر یہ نکلا کہ لوگوں کو گمراہی، باطل پر ضد اور ہٹ دھرمی

سے نجات دلائی اور ان کے دلوں کو نور بصیرت سے منور کیا اور فسق و فجور میں غوطہ ور لوگوں اور اپنی

بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینے والی قوم کو انسانیت کے اعلیٰ ترین درجات پر فائز کرنے میں آپ (م)

کامیاب ہوئے۔

”وهداهم الى الدين القويم، ودعاهم الى صراط مستقيم“

(آپ (ص) نے لوگوں کو محکم، قوی اور استوار دین کی طرف ہدایت کی نیز انہیں صراط مستقیم کی طرف بلایا)
 آپ (ص) نے لوگوں کو ایک ایسے دین کی طرف ہدایت کی جو ان کے استحکام اور بقاء کا سبب بنا،
 ایسا دین اور مذہب لازمی طور پر، محکم اور استوار قوانین پر مشتمل ہوگا جو کسی عقب ماندہ معاشرے کو
 نجات دے سکے اور لوگوں کو ضلالت سے زندگی کے صحیح اور سیدھے راستے کی طرف لاسکے۔

رسول خدا (ص) کی رحلت،

”ثم قبضه الله اليه قبض رافة واختيار“

(پھر خدا نے آپ (ص) کی روح کو قبض فرمایا اور یہ قبض روح، خدا کی شفقت اور اختیار کی وجہ سے ہوئی)
 خداوند عالم، اپنے حبیب سے محبت رکھتا تھا اور آپ (ص) پر مہربان تھا، اسی بنا پر آپ (ص) کو اپنی
 بارگاہ میں بلایا تاکہ اس دنیا کی سختیوں کی قید سے آزاد اور خدا کی بے انتہار محبت سے ہمکنار ہو جائیں۔
 ”اختیار“ کے لفظ میں دو احتمال ہیں: ایک یہ کہ خدا نے آپ (ص) کا انتخاب کیا اور آپ کی قبض
 روح ہوئی، دوسرا احتمال یہ ہے کہ آپ (ص) کی قبض روح آپ (ص) کے اپنے ارادہ و اختیار سے ہوئی،
 روایات میں بھی ذکر ہوا ہے کہ عزرائیل کسی سے قبض روح کے بارے میں اجازت نہیں لیتا تھا اور
 صرف آنحضرت (ص) نے اس نے اجازت لی تو آپ (ص) نے اپنے اختیار سے عزرائیل کو قبض روح
 کی اجازت دی، اس طرح عزرائیل نے آپ (ص) کی روح مبارک کے ساتھ ”ملکوت اعلیٰ“ کی طرف پرواز
 کی۔

”ورغبة وايشار“

(اور یہ قبض روح، آپ (ص) کی اپنی رغبت اور جان نثاری کی وجہ سے ہوئی)
 پیغمبر خدا (ص) اپنی رغبت، خوشی اور ایشار کے ساتھ پراضی ہو گئے کہ اس دنیا سے رخت سفر باندھ
 لیں، ایسا نہیں ہوا کہ آپ (ص) اپنی رحلت پر ناراض ہوں اور خدا سے مزید زندگی کی درخواست کریں بلکہ

آپ اس کو بہت خوشی ہوئی کہ اس پست و حقیر دنیا سے ملکوتِ اعلیٰ کی طرف پرواز کر رہے ہیں۔ اس طرح آپ اس نے دنیا کی زندگی پر اخروی زندگی کو ترجیح دی۔

”فمحمداً من تعب هذه الدار في راحة“

(پس حضرت محمد (ص) رحلت پا کر۔ اس دنیا کی سختیوں سے آرام و راحت پا گئے)

”قد خفف بالملائكة الابرار، ورضوان الرب الفغار، ومجاورة الملك الجبار“

(خدا کے۔ نیک سرشت فرشتوں کے حلقے، بختے والے پروردگار کی خوشنودی اور صاحبِ جبروت بادشاہ۔ خدا۔

کی ہم نشینی میں آپ (ص) آرامش کے ساتھ خدا کی رحمتوں سے مستفیض ہو رہے ہیں۔)

”جبار“ صیغہ مبالغہ ہے اور اس کا معنی کمی اور نقائص کو پورا کر کے مکمل کرنے والا ہے، چونکہ خداوند عالم بھی۔ مخلوقات کی کمی اور نقائص کو دور فرماتا ہے اور انسانوں کو معنوی کمالات کی طرف راہنمائی کرتا ہے لہذا خداوند عالم کو ”جبار“ کہا جاتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ”جبار“ قہر و غلبہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہو۔

”صلى الله على ابي، نبيه وامينه على الوحي“

(خدا کے درود و صلوات میرے والد بزرگوار پر ہوں کہ جو خدا کے پیامبر اور اس کی وحی کے امانتدار تھے)

”وصفيه وخيرته من الخلق ورضيه“

(درود و سلام اس پیغمبر پر جو۔ خدا کا برگزیدہ، مخلوقات میں سے انتخاب شدہ اور خدا کا پسندیدہ بندہ تھا)

”والسلام عليه ورحمة الله وبركاته“

(آپ (ص) پر خدا کی سلامتی، رحمت اور برکتیں نازل ہوں)

”صلوات“ اور ”سلام“ کے معانی تقریباً ایک دوسرے کے قریب ہیں لیکن عموماً ”صلوات“

درود و تحیت اور ”سلام“ سلامتی کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

سامعین سے خطاب:

یہاں تک حضرت زہراء سلام اللہ علیہا نے اپنے خطبے میں خدا کی وحدانیت اور اپنے بابا کی رسالت کی

گواہی دی، پھر اہل مجلس اور انصار و مہاجرین جو مسجد میں موجود تھے کی طرف متوجہ ہوئیں اور ان سے خطاب کرتے ہوئے چند کلمات ارشاد فرمائے۔

”ثم التفتت الى المجلس وقالت،“

(پھر مسجد میں موجود سامعین کی طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا:)

”انتم عباد الله! نصب امره ونهيه“

(خدا کے بندو! خدا کے امر و نہی کی نشاندہی کرنے والے تم ہی ہو)

”نصب“ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو علامت کے طور پر مقرر کی گئی ہو جیسے جھنڈا، پرچم، بیڑ اور ٹریفک سگنل وغیرہ۔ شاید اس حملے (آپ ہی خدا کے امر و نہی کے لئے نصب۔ علامت۔ ہیں) کا مقصد یہ ہو کہ تم ہی علامت کے طور پر منصوب کیے گئے ہو اور خدا کا امر و نہی تمہاری طرف متوجہ ہے۔

حقیقت میں آپ (ع) کا مقصد یہ ہے کہ پروردگار کے امر و نہی کا بنیادی ہدف بندگان خدا ہی ہیں دوسرے موجودات نہیں، کیونکہ قانون گزاری اور تشریع کو صرف انسانوں کے لئے عمل میں لایا گیا ہے دوسرے موجودات چونکہ مکلف نہیں ہیں اسی لئے ان کو نہ امر کیا گیا ہے اور نہ نہی (۱) شاید اس فقرہ کا مطلب یہ ہو کہ خدا کے اوامر و نواہی کا محور تم ہو اور احکام شریعت کی علامت بھی تم ہو اور دوسرے لوگ۔ شریعت کے مسائل میں۔ تمہاری پیروی کرتے ہیں۔ ذیل کا فقرہ بھی دوسرے احتمال کی تائید کر رہا ہے۔

”وحملۃ دینہ ووحیہ“

(اور تم خدا کے دین اور وحی کے حامل ہو)

تم ایسے مہاجر و انصار ہو کہ جنہوں نے وحی اور قرآن کو نازل ہوتے دیکھا، پیغمبر (س) کی ہمنشینی سے فیضیاب ہوئے۔ اس طرح تم دین اور وحی کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے ہو۔ لہذا دین کو آنے والی

۱۔ سورۃ جن میں صراحت کے ساتھ جنوں کو صلح و مؤمن اور کافر میں تقسیم کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں پر بھی احکام خداوندی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

نسلوں تک منتقل کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ پس دین اور وحی کے حامل ہونے کا معنی و مقصود یہ ہے کہ دین اور وحی کی تعلیمات کو صحیح اور مکمل طریقے سے آنے والی نسلوں تک پہنچائیں۔ اور اس امانت کو مکمل دیانت داری کے ساتھ ادا کریں۔

”وامناء اللہ علی انفسکم، وبلغائہ الی الامم“

(خدا نے آپ کو آپ کے اوپر امین قرار دیا ہے۔ پس اپنی ذات کے ساتھ خیانت نہ کریں۔

اور آپ نے ہی اسلام کو دوسری قوموں تک پہنچانا ہے)

رسول خدا (ص) پوری انسانیت اور ساری دنیا کے لئے اسلام لائے تھے لیکن جب آپ (ص) اس دنیا سے جا رہے تھے تو اسلام نے ابھی جریزۃ العرب کی حدود سے باہر قدم نہ رکھا تھا لہذا انصار و مہاجرین کی ذمہ داری بنتی تھی کہ وہ اسلام کو دنیا کی تمام قوموں تک پہنچائیں اس لئے آپ (ع) فرماتی ہیں کہ: ”بلغائہ“ یعنی تم خدا کے دین کو پہنچانے والے ہو ”الی الامم“ دوسری قوموں تک۔ آپ (ع) کا مقصد یہ ہے کہ۔ اے اصحاب رسول (ص)۔ آپ پر فرض ہے کہ اسلام اور عدالت کا عملی نمونہ بن جائیں تاکہ دوسری قومیں آپ کی پیروی کریں اور اسی راہ کو اپنائیں جس پر آپ چل رہے ہیں، لیکن تم نے اسلام کے آغاز میں ہی راستے کو بدل دیا اور اصلی راہ سے منحرف ہو گئے ہو تو دوسری قومیں کس طرح تمہاری پیروی کر سکتی ہیں؟ اور تم کس طرح اسلام کو ساری دنیا تک پہنچا سکتے ہو؟۔

”وزعمتم حق لکم“

(اور تم خیال کرتے ہو کہ۔ مذکورہ۔ مقامات۔ اور الہی منصب۔ تمہارا حق ہیں)

یہاں پر آپ (ع) اعتراض آمیز طنز سے کام لیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ آپ تو اپنے آپ کو دین کے پیشوا اور وحی کے امین سمجھتے ہو حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں، چونکہ آپ اس وقت دین خدا کو تبدیل کر چکے ہو اور اے کسی دوسری راہ پر لگا چکے ہو۔ لہذا اب تم وحی کے نگہبان نہیں رہے۔ اسی لئے آپ (ع) فرماتی ہیں کہ: ”وزعمتم حق لکم“ (تم گمان کرتے ہو کہ تم ان مناصب الہیہ کا استحقاق رکھتے ہو) حالانکہ تم میں اب یہ صلاحیت نہیں رہی کہ تم وحی و دین کے حامل اور نفس کے امین اور دین

کے مبلغ کے مقام پر فائز ہو چونکہ نہ صرف تم خود منحرف ہو گئے ہو بلکہ اسلام کو بھی انحراف کا شکار بنایا ہے۔ البتہ بعض دوسری کتابوں میں مندرجہ بالا فقرہ کے بجائے ”و زعمتم حق له فيكم“ ذکر ہوا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ۔ تم اپنے آپ کو ناحق دین کا حامل و وحی کا امین اور مبلغ شریعت سمجھتے ہو، حالانکہ دینی نصوص کی حوالے سے۔ دین کا صحیح اور برحق پیشوا تمہارے درمیان موجود ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ ابوبکر کے ذریعے خلافت اور امت کی رہبری کے غضب ہونے کی طرف اشارہ ہے، لیکن بظاہر پہلا احتمال مناسب نظر آتا ہے اور یہ فقرہ ایک جملہ معترضہ (۱) ہو گا (۲)۔

قرآن اور عترت، پیغمبر (ص) کی دو یادگار چیزیں،

”لله فيكم عهد قدمه اليكم“

(خدا کا تمہارے ساتھ ایک عہد و پیمان ہے جو پہلے ہی تمہیں بتا دیا ہے)

اس عہد و پیمان کے بارے میں دو احتمال موجود ہیں: پہلا احتمال یہ کہ اس عہد و پیمان سے مراد وہ عہد ہے جو عترت کے بارے میں رسول خدا (س) نے اپنی زندگی میں لوگوں سے لیا اور فرمایا کہ: ”انی اوشك ان ادعى... انی تارك فيكم الثقلين، كتاب الله وعترتي...“ (۳)۔

۱۔ جملہ معترضہ اس جملے کو کہا جاتا ہے جو اپنے سیاق و سباق سے کوئی خاص ربط نہیں رکھتا لیکن کسی خاص مقصد اور بات کو سمجھانے کے لئے گفتگو کے دوران بولا جاتا ہے۔

۲۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان جملات کے ذریعے صحابہ کو اہل بیتؑ پر ہونے والے مظالم کے بارے میں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلانا مقصود ہو اور آپؐ نے یہ بتانا چاہتی تھیں کہ، اے اصحاب رسولؐ! جب تمہارا یہ مقام ہے دینی حقائق تمہارے سامنے ہیں اور پوری انسانیت کو اسلام کی جانب بلانا چاہتے ہو تو بتاؤ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تمہارے سامنے وصی رسولؐ اور پیغمبر کے برحق جانشین سے خلافت چھینی جا رہی ہے اس کے اہل بیتؑ پر طرح طرح کے مظالم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے ہیں، اسلام کو پیغمبرؐ کے مدینے میں ہی مٹ کیا جا رہا ہے، ہدایت کے ضامن اور قرآن کے نعم البدل و نظیر، اہل بیتؑ معاشرے سے مکمل طور پر ختم کیے جا رہے ہیں قرآن صامت سے ترجمان قرآن اور قرآن ناطق کو جدا کر کے گمراہی اور ضلالت کے دروازے کھولے جا رہے ہیں، شریعت محمدیؐ اور حضورؐ کا عملی مذاق اڑایا جا رہا ہے آخر تم ان سب کو دیکھنے کے باوجود حق کی حمایت کیوں نہیں کرتے اور ظالم کی مدد اور اس کی حمایت کیوں کر رہے ہو؟

۳۔ یہ حدیث ثقلین کے نام سے معروف ہے اور شیعہ و سنی دونوں نے تواتر کے ساتھ نقل کی ہے۔

(عنقریب مجھے بلایا جائے گا۔ میں دو قیمتی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، خدا کی کتاب اور میری اہل بیت ...) اور بعد میں آنے والا جملہ ”وَبَقِيَّةِ اسْتَخْلَفَهَا عَلَيْكُمْ“ قرآن کریم کی طرف اشارہ ہے اور ”لِلّٰهِ فِيكُمْ“ سے مراد اہل بیت کرام ہیں۔ خلاصہ یہ کہ: ان دو فقروں سے الگ چیزیں مراد ہوں، پہلے فقرے سے اہل بیت اور دوسرے فقرے سے قرآن کریم۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ ان دونوں فقروں سے قرآن کریم ہی مقصود ہو اس صورت میں، خدا کی کتاب قرآن خود ہمیں اہل بیت (ع) کی طرف راہنمائی کرے گی کیونکہ خدا نے قرآن میں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ: ”قُلْ لَا اسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمُوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰی“ (اے ہمارے حبیب، ان سے کہہ دو کہ: تبلیغ رسالت کے حوالے سے سوائے اہل بیت کی محبت کے اور کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا) (۱۲)۔

”وَبَقِيَّةِ اسْتَخْلَفَهَا عَلَيْكُمْ“

(اور تمہارے درمیان خدا کی ایک یادگار ہے جسے اس نے تم پر خلیفہ مقرر کیا ہے) جس طرح تم پیغمبر (ص) کی اطاعت کرتے تھے اسی طرح تم اس یادگار کی بھی اطاعت کرو ابھی جب پیغمبر (ص) اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں تو اس چیز کی اطاعت کریں جسے پیغمبر (ص) چھوڑ کر گئے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ چیز کیا ہے؟

ہدایت کرنے والی قرآنی خصوصیات:

(۱) ”كِتَابُ اللّٰهِ النَّاطِقُ“

۱۔ سورۃ شوریٰ / ۲۳۔

۲۔ دوسرا احتمال زیادہ مناسب نظر آتا ہے کیونکہ اہل بیت کی محبت، سندیت اور اس کے عہد و پیمان الہی ہونے سے صحابہ نے انکار کیا اور اسی انکار کے نتیجے میں تاریخ اسلام کی سب سے پہلی بغاوت رونما ہوئی، اور حسب کتاب اللہ کا نعرہ بلند کیا گیا، لہذا حضرت زہراءؑ قرآن سے استدلال کرنا چاہتی ہیں وہی قرآن جسے طرفین ملتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اپنی زندگی میں اس کو عہد خداوندی کے طور پر پیش کیا اور اپنے بعد اسی کو حاکم بنایا۔

(خدا کی کتاب جو اس کے حکم کو بیان کرتی ہے)

پنمبر (م) کی ایسی یادگار جسے خدا نے تمہارے اوپر اپنا جانشین بنایا ہے اور رسول خدا (م) کے بعد اس کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ خدا کی کتاب۔ قرآن۔ ہے اور یہی کتاب خدا کے احکام کو بیان کرنے والی ہے، ہم نے پہلے بھی کہا کہ خدا کی یہی کتاب صراحت کے ساتھ لوگوں کو پنمبر (م) کی عزت (م) کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

(۲) ”والقرآن الصادق، والنور الساطع“

(یہ کتاب وہی قرآن ہے جو برحق، درخشان نور اور عالمگیر حقیقت ہے)

”الصادق“ وہ چیز جس میں کسی قسم کی غیر حقیقی باتوں اور باطل کا شائبہ تک نہیں ہے ”ساطع“ کے معنی بلندی اور پھیلنے کے ہیں ”النور الساطع“ یعنی بلندی اور نور کا پھیلنا۔ اس فقرے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن میں باطل کے لئے راہ نہیں اور باطل کی گنجائش نہیں، اس کے ساتھ قرآن کا نور ہدایت (تمام روشنیوں سے) بلند تر و فروزان تر ہے جو پوری دنیا کو اپنے نور سے منور کر رہا ہے۔

(۳) ”والضیاء اللامع“

(اور درخشند روشنی۔ کتاب ہے)

”ضیاء“ یعنی روشنی، ”لامع“ روشنی کر دینے والا۔ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے جو خود نور اور روشنی ہے۔ (جہل و گمراہ کے اندھیرے میں گھرے ہوئے دلوں) نور ہدایت سے روشن کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں قرآن بذات خود روشنی ہونے کے علاوہ دوسری چیزوں کو بھی روشنی دیتا ہے اور دوسروں کو ظلمتوں سے روشنیوں کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

(۴) ”بینہ بصائرہ“

(اس کے بصیرت افروز۔ دلائل واضح اور روشن ہیں)

قرآن کے دلائل اور براہین واضح اور روشن ہیں اور ہر کوئی اگرچہ عالم اور دانشور نہ بھی ہو اپنی صلاحیت کے مطابق خدا کو قرآن کی دلیلوں سے سمجھ سکتا ہے۔

(۵) ”منكشفة سرائر“

(اس کے اسرار و رموز قابل فہم ہیں)

قرآن کے اندر موجود اسرار اور رموز انسان کے لئے قابل فہم ہیں البتہ اسرار قرآنی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان اور قرآن کے اپنے مخصوص انداز بیان سے آگاہ اور آشنا ہو۔

(۶) ”منجلیۃ ظواہر“

(قرآن کے ظواہر بھی واضح اور آشکار ہیں)

خطبے کے اس حصہ میں آپ (ع) یہ بیان فرماتی ہیں کہ یہ سب چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن انسان کی زندگی کا دستور العمل اور تکامل ہونا چاہئے اور ایسا نہ ہو کہ صرف مردوں کی مغفرت اور دہن کے سر پر رکھنے کے لئے اس سے استفادہ کیا جائے (لیکن اپنی عملی زندگی سے اسے دور رکھا جائے) یا بعض اخباری مسلک حضرات کی طرح قرآن کے ظاہری معانی (وہ معانی جو اہل محاورہ قرآن کی آیتوں سے سمجھتے ہیں) کو حجت نہ مانیں، ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہماری زندگی کی تمام سرگرمیاں قرآن کی راہنمائی میں طے ہونی چاہیں اور ہمارے ہر فعل اور حرکت میں قرآن حجت ہونا چاہئے۔ البتہ روایات کی طرف رجوع کرنا ضروری اور لازم ہے تاکہ قرآن کو بہتر اور دقیق تر سمجھا جاسکے۔

(۷) ”مغتبۃ بہ اشیاء“

(قرآن کے پیروکار قرآن ہی کی وجہ سے قابل رشک ہیں)

”مغتبۃ“ قابل رشک۔ وہ شخص جسے دیکھ کر رشک کیا جائے ”بہ“ قرآن کے سبب سے ”اشیاء“ قرآن کے پیروکار قرآن کی صحیح معنوں میں پیروی کرنے والے یہ لفظ شیعہ کی جمع ہے۔ ہمیں بھی شیعہ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ہم اہل بیت پیغمبر (ص) کے پیروکار ہیں اور ان کو رسول خدا (ص) کے برحق جانشین مانتے ہیں نیز ان کی اطاعت اور پیروی کو واجب سمجھتے ہیں۔

یہاں پر حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: اگر کوئی صحیح معنوں میں قرآن کی پیروی کرے اور اس کی انسان ساز تعلیمات پر عمل کرے تو کمال و بزرگی کے ایسے مقام پر فائز ہو جائے گا کہ دوسرے

اے دیکھ کر رشک کریں گے۔

(۸) ”قائد الی الرضوان اتباعہ“

(قرآن اپنے پیروکاروں کو مقام رضوان۔ یا جنت۔ کی طرف رہبری کرتا ہے)

”رضوان“ کی اصل ”رضا“ ہے یعنی خوشنودی۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ قرآن کے واقعی پیروکاروں پر دنیا و آخرت دونوں میں خدا راضی اور خوشنود ہوگا (۱) (یہ وہ عظیم مقام ہے جہاں پر خدا کی طرف سے نفس مطمئنہ کو ”ارجی“ اور ”ادخلی“ کے حیات آفریں خطاب سے نوازا جاتا ہے)۔

(۹) ”مؤدالی النجاة استماعہ“

(قرآن اپنے۔ تدریس۔ سننے والوں کو نجات کی شاہراہ پر گامزن کرتا ہے)

”استماع“ باب افتعال کا مصدر اور دقیق و غور سے سننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ ”سماع“ یا ”اسماع“ صرف سننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بنا بریں جو بعض نسخوں میں ”استماع“ کے بجائے ”اسماع“ ذکر ہوا ہے وہ صحیح نہیں بلکہ ”استماع“ ہی صحیح ہے کیونکہ وہ چیز جو انسان کو بد بختی اور ہلاکت سے نجات دلاتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کو غور سے سنیں اور اس کے معانی کو صحیح و درست سمجھ کر اس کے مطابق عمل بھی کریں (۲)۔

(۱۰) ”وبہ تنال حجج اللہ المنورۃ“

(خدا کے نورانی دلائل قرآن ہی کے واسطے سے حاصل ہوتے ہیں)

تمام امور میں خدا کی راہنمائی اور واضح دلیلیں قرآن ہی کے ذریعے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ سنت رسول (ص) اور عترت پیغمبر (ع) جیسی شریعت کے روشن دلائل اور حجت بھی قرآن کی راہنمائی سے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ قرآن فرماتا ہے کہ: ”ما آتاکم الرسول فخذوا وما نہاکم

۱۔ شاید مراد بہشت رضوان ہو جو اہل معرفت کے نزدیک ایک معنوی بہشت ہے اور مادی لذتوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

۲۔ اسی مطلب کی جانب سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۰۴ بھی اشارہ کرتی ہے کہ: ”واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا لعلکم ترحمون“ جب بھی قرآن کی تلاوت کی جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔ یہاں پر بھی سماع کے بجائے استماع کا لفظ استعمال ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ تلاوت قرآن کے وقت وقت اور مکمل توجہ سے قرآن سنیں۔

عنه فانتھوا (۱)“ (جو چیز تمہیں رسول (ص) دیدے اسے لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ) سنت پیغمبر کی حجیت کے لئے قرآن کی یہی آیت کافی ہے۔

(۱۱) ”وعزائمہ المفسرۃ، ومحارمہ المحذرة“

(خدا کی جانب سے بیان کئے ہوئے واجبات اور منع کیے ہوئے محرمات کو قرآن بیان کرتا ہے)
قرآن کے ذریعے واجبات بیان ہوئے ہیں، آیات قرآنی نازل ہوئیں ہیں اور واجبات کو معین کر دیا ہے اور ”اقیموا الصلاة (۲)“ (نماز قائم کرو) ”آتوا الزکاة (۳)“ (زکات دو) ”کتب علیکم الصیام (۵)“ (تم پر روزہ واجب کیا گیا ہے) ”واتموا الحج والعمرة لله (۶)“ (خدا کی راہ میں حج اور عمرہ کو مکمل طریقے سے ادا کرو) ”وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا (۷)“ (خدا کی راہ میں ان لوگوں کے ساتھ لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور تجاوز نہ کرو) ”قل اطیعوا اللہ والرسول (۸)“ (کہدو کہ تم خدا اور رسول خدا کی اطاعت کرو)۔ مذکورہ آیتیں اور اس کے علاوہ دوسری بہت سی آیات، نماز، روزہ، زکات، حج اور جہاد کے دجوب اور دوسرے قوانین خداوندی کو بیان کرتی ہیں، انہی بیان شدہ واجبات کو ”عزائم مفسرہ“ کہا جاتا ہے۔ (واجبات کو بیان کرنے والی آیات کے مقابلے میں کچھ آیات ایسی بھی ہیں کہ جو محرمات کو بیان کرتی ہیں، ملاحظہ فرمائیے)۔

”لاتقربوا الزنی (۹)“ (زنا کے نزدیک مت جاؤ) ”انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان (۱۰)“ (بتحقیق شراب اور جوا شیطان کے ناپاک عمل میں سے ہیں) ”ولا یفتب بعضکم بعضاً (۱۱)“ (ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو) ”یمحق اللہ الربی (۱۲)“ (خدا سود کا خاتمہ کرتا ہے) ان کے علاوہ بھی بہت ساری آیات ایسی ہیں جو شریعت میں منع کی ہوئی چیزوں (محرمات) کو بیان کرتی ہیں اور ”محارم محذره“ سے یہی محرمات مراد ہیں۔

پس حضرت زہراء (ع) کا مقصد یہ ہوا کہ یہ قرآن ہے جو تمہیں خدا کے واجبات اور محرمات سے

۱۔ سورۃ حشر / ۷۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ سورۃ بقرہ / ۳۳۔

۵۔ بقرہ / ۱۸۳۔ ۶۔ بقرہ / ۱۹۶۔ ۷۔ بقرہ / ۱۹۰۔ ۸۔ آل عمران / ۳۲۔ ۹۔ اسراء (بنی اسرائیل) / ۳۲۔

۱۰۔ ۹۰۔ ۱۱۔ حجرات / ۱۲۔ ۱۲۔ بقرہ / ۲۸۶۔

آگاہ کرتا ہے۔ البتہ جہاں تفسیر اور وضاحت کی ضرورت ہو تو وہاں رسول خدا (ص) اور ان کے اہل بیت (ع) ان وضاحت طلب آیات کی تشریح فرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کا حکم ہے کہ ”واقیموا الصلاة“ نماز قائم کرو۔ اب نماز پڑھنے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ پیغمبر اکرم (ص) اور ائمہ ہدیٰ (ع) کی طرف سے بیان ہونی چاہئے۔

(۱۲) ”وبیناته الجالیۃ وبراہینہ الکافیۃ“

(خدا کے روشن اور آشکار دلائل نیز۔ ضمیر کو مطمئن کرنے والے۔ برہان قرآن ہی کے ذریعے تم تک پہنچے ہیں) ”بنیات“ بینہ کی جمع اور ”براہین“ برہان کی جمع ہے۔ خدا کے آشکار اور کافی (یقین کی منزل تک پہنچانے والے) بنیات سے مراد قرآن کی وہ واضح روش ہے جسے علوم و معارف اور اصول و فروع دین کے بیان کے لئے خدا نے اپنایا۔ اس سلسلے میں قرآن بھی فرماتا ہے کہ: ”ان هذا القرآن یہدی للتی هی اقوم (۱)“ (تحقیق یہ قرآن، محکم، قوی۔ اور انحراف و کجی سے سے منزہ۔ علوم و معارف کی طرف راہنمائی کرتا ہے)۔

(۱۳) ”وفضائلہ المندوبۃ ورخصہ الموهوبۃ وشرایعہ المکتوبۃ“

(مستحبات کی فضیلتیں۔ مباح چیزوں۔ میں خدا کی طرف سے دی ہوئی آزادی عمل

اور۔ قرآن میں۔ لکھی ہوئی شریعت۔ سے قرآن ہی کی بدولت آگاہی حاصل ہوتی ہے۔)

قرآن کریم میں واجبات اور محرمات کے علاوہ مستحبات اور مباحات بھی ہیں، بطور مثال مستحب پر یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ: ”لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (۲)“ (اس وقت تک کمال اور بھلائی حاصل نہیں کر سکو گے جب تک کہ تم اپنی عزیز ترین چیزوں کو انفاق نہ کرو گے) اسی طرح یہ آیت مباحات پر دلالت رکھتی ہے کہ: ”قل من حرم ذینۃ اللہ التي اخرج لعبادۃ والطیبات من الذوق (۳)“ (اے ہمارے رسول ان سے فرمائیے کہ: پاکیزہ نعمتوں اور دنیوی زینت۔ کے اسباب۔ کو جسے خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے، کس نے حرام قرار دیا ہے؟) البتہ علامہ مجلسی نے بحار الانوار

میں فرمایا ہے کہ ”رخصہ الموهوبہ“ میں مباح چیزوں کے علاوہ مکروہات بھی شامل ہیں (۱) (مکروہ ہر وہ کام ہے جس میں بندے کو آزادی عمل موجود ہو اور اس فعل کے ارتکاب پر پابندی نہ ہو)۔

(۱۲) ”وشرایعہ المکتوبہ“

(اور شریعت کے (دوسرے) مکتوب قوانین بھی قرآن بیان کرتا ہے)

واجبات، محرمات اور مستحبات کے علاوہ دوسرے تمام شرعی قوانین، جیسے حدود و دیات وغیرہ جو کہ قرآن میں مذکور ہیں، بطور مثال ملاحظہ فرمائیے کہ: ”الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة (۲)“ (زنا کرنے والے مرد اور عورت میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو) یہ غیر شادی شدہ افراد کے حد زنا کو بیان فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ: قرآن کریم جو کہ پیغمبر اکرم (س) کی یادگار ہے، خدا کے تمام احکام اور قوانین کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ البتہ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا ہے کہ اس کا مقصد یہ نہیں کہ مسکین ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے بے نیاز ہو جائیں اور ”حسبنا کتاب اللہ“ کا نعرہ لگائیں کیونکہ اسی قرآن نے صراحت کے ساتھ یہ حکم دیا ہے کہ مسلمان اہل بیت اور عترت رسول (س) کی طرف رجوع کریں (اور ان سے اسرار و رموز قرآن و شریعت کو حاصل کریں)۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

چوتھا درس:

○ فلسفہ احکام الہی:

- تقویٰ کی وصیت
- خدا کی معرفت اور علم کا رابطہ
- اپنی اور اپنے پدر بزرگوار کی شخصیت کا تعارف
- پیامبر اسلام (ص) اور علی (ع) کی اخوت اور یکجہتی
- آغاز رسالت کی کیفیت
- دعوت کے تین مرحلے
- پیغمبر (ص) کی بت شکنی
- توحید کا پرچار اور کفر کا خاتمہ
- نفاق اور کفر کی شکست

فَجَعَلَ اللهُ الْإِيمَانَ تَطْهِيراً لَكُمْ مِنَ الشُّرْكِ، وَ الصَّلَاةَ تَنْزِيهاً لَكُمْ عَنِ
 الْكِبْرِ، وَ الزَّكَاةَ تَزْكِيَةً لِلنَّفْسِ وَ نِمَاءً فِي الرِّزْقِ، وَ الصِّيَامَ تَثْبِيثاً لِلْإِخْلَاصِ، وَ
 الْحَجَّ تَشْيِيداً لِلدِّينِ، وَ الْعَدْلَ تَنْسِيقاً لِلْقُلُوبِ، وَ طَاعَتَنَا نِظَاماً لِلْمِلَّةِ، وَ إِمَامَتَنَا
 أَمَاناً مِنَ الْفِرْقَةِ، وَ الْجِهَادَ عِزّاً لِلْإِسْلَامِ [وَ ذُلّاً لِأَهْلِ الْكُفْرِ وَ النِّفَاقِ]، وَ الصَّبْرَ
 مَعُونَةً عَلَى اسْتِجَابِ الْأَجْرِ، وَ الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ مَصْلَحَةً لِلْعَامَّةِ، وَ بِرَّ الْوَالِدَيْنِ
 وَقَايَةً مِنَ السَّخَطِ، وَ صِلَةَ الْأَرْحَامِ مَنْسَأَةً فِي الْعُمُرِ وَ مَنْمَاءً لِلْعَدَدِ، وَ الْقِضَاصَ
 حَقّاً لِلدِّمَاءِ، وَ الْوَفَاءَ بِالنَّذْرِ تَعْرِيضاً لِلْمَغْفِرَةِ، وَ تَوْفِيَةَ الْمَكَائِيلِ وَ الْمَوَازِينِ
 تَغْيِيراً لِلْبَخْسِ، وَ النَّهْيَ عَنْ شُرْبِ الْخَمْرِ تَنْزِيهاً عَنِ الرَّجْسِ، وَ اجْتِنَابَ الْقَذْفِ
 حِجَاباً عَنِ اللَّعْنَةِ، وَ تَرْكَ السَّرْقَةِ إِيْجَاباً لِلْعَقَّةِ؛ وَ حَرَّمَ اللهُ الشُّرْكَ إِخْلَاصاً لَهُ
 بِالرُّبُوبِيَّةِ؛ فَاتَّقُوا اللهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَ لَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ، وَ أَطِيعُوا اللهَ فِيمَا
 أَمَرَكُمْ بِهِ وَ مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ، فَإِنَّهُ إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ.

ثُمَّ قَالَتْ: أَيُّهَا النَّاسُ إِعْلَمُوا: أَنِّي فَاطِمَةُ، وَ أَبِي مُحَمَّدٌ ﷺ، أَقُولُ عَوْداً وَ
 بَدَواً وَ لَا أَقُولُ مَا أَقُولُ غَلْطاً، وَ لَا أَفْعَلُ مَا أَفْعَلُ شَطْطاً؛ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ
 أَنْفُسِكُمْ، عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ، حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَحِيمٌ؛ فَإِنْ تَعَزَّوْهُ
 وَ تَعْرِفُوهُ تَجِدُوهُ أَبِي دُونَ نِسَاءكُمْ، وَ أَخَا ابْنِ عَمَى دُونَ رِجَالِكُمْ، وَ لَنِعْمَ
 الْمَعْرُوفُ إِلَيْهِ؛ فَبَلَغَ الرِّسَالَةَ ضَادِعاً بِالنَّذَارَةِ، مَائِلاً عَنْ مَذْرَجَةِ الْمُشْرِكِينَ، ضَارِباً
 تَبَجُّهَهُمْ، آخِذاً بِأَكْظَامِهِمْ، دَاعِياً إِلَى سَبِيلِ رَبِّهِ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ،
 يَكْسِرُ الْأَصْنَامَ وَ يَنْكُتُ [يَنْكُثُ] الْهَامَ، حَتَّى انْهَزَمَ الْجَمْعُ وَ وَلَّوْا الدَّبَرَ، حَتَّى
 تَفَرَّى اللَّيْلُ عَنْ صُبْحِهِ وَ أَسْفَرَ الْحَقُّ عَنْ مَحْضِهِ وَ نَطَقَ زَعِيمُ الدِّينِ وَ خَرَسَتْ
 شَفَاشِقُ الشَّيَاطِينِ وَ طَاحَ وَ شَيْطُ النِّفَاقِ وَ انْحَلَّتْ عُقْدُ الْكُفْرِ وَ الشَّقَاقِ، وَ فَهَّمَتْ
 بِكَلِمَةِ الْإِخْلَاصِ فِي نَفَرٍ مِنَ الْبَيْضِ الْخِمَاصِ، الَّذِينَ أَذْهَبَ اللهُ عَنْهُمْ الرَّجْسَ وَ
 طَهَّرَهُمْ تَطْهِيراً.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

خطبے کے گزشتہ حصے میں (حضرت زہراء (ع) نے قرآن کی اہم اہم خصوصیات بیان فرمائیں جو قرآن کے اعلیٰ و ارفع اور نورانی معانی، غنی اصول و معارف اور دلائل اور دین کے اصول و فروع نیز قرآن کے روشن اور واضح ظاہری معانی سے مربوط تھیں۔ اس حصے میں آپ (ع) فروع دین اور دین کے اصول و معارف کے معاشرتی اور معنوی ثمرات اور فوائد کو بیان فرماتی ہیں۔

فلسفہ احکام الہی

۱. ایمان اور نماز

”فجعل اللہ الایمان تطہیراً لکم من الشرک“

(خدا نے ایمان کو لازم اور واجب قرار دیا کہ تمہیں شرک سے پاک کرے)

خداوند عالم نے قرآن میں ایمان کو فرض کیا اور ہمیں ایمان لانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ: صاحب ایمان بنو یعنی کسی چیز کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ یہ اس لئے تھا کہ تمہیں شرک کی آلودگی سے پاک کرے۔ قرآن میں طاغوت (خدا کے علاوہ ہر وہ چیز جس کی عبادت کی جائے) کی اطاعت اور پرستش کرنے والوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ: ”والذین کفروا اولیائهم الطاغوت یخرجونهم من

النور الى الظلمات... (۱)“ (وہ لوگ جو کافر ہوئے اس طرح انہوں نے طاغوت کو اپنا سرپرست بنایا۔ تو اس کے نتیجے میں۔ طاغوت ان کو۔ خدا شناسی اور خدا پرستی کی فطرت کے۔ نور سے نکال کر۔ ضلالت و گمراہی کی۔ تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ گمراہی و ضلالت اور عذاب۔ میں رہیں گے)۔

”والصلوة تنزيها لكم عن الكبر“

(تکبر سے پاک رکھنے کے لئے خدا نے تم پر نماز فرض کی)

خود خواہی سے مقابلہ کا ذریعہ نماز ہے، خصوصاً اس دور میں جب بعض انسان کچھ زیادہ ہی تکبر تھے، عرب کے بعض آدمیوں کے لئے رکوع اور سجدے بہت گراں گزرتے تھے ان کا غرور اور تکبر اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اگر کوئی دروازہ چھوٹا ہو اور وہاں سے ان کو جھک کر جانا پڑتا ہو تو وہ جھکنے کے بجائے دروازے کو خراب کر دیتے تھے! اس طرح وہ جھکے بغیر وہاں سے گزرتے تھے۔ یہ اس لئے کرتے تھے کہ ان کو ذرا سا بھی سر خم کرنا نہ پڑے۔ ایسے معاشرے میں جہاں تکبر اور انانیت حد سے بڑھ چکی تھی، نماز فرض کی گئی تاکہ وہ رکوع کریں، سجدے میں گر پڑیں اور اس طرح ان کے تکبر اور غرور کے بت پاش پاش ہو جائیں۔ قرآن میں ارشاد خداوندی ہے کہ: ”اقم الصلاة لذكركي“ (نماز قائم کرو تاکہ تم میری یاد میں رہو۔ میری ربوبیت اور عظمت سے غافل نہ رہو۔) نماز کا نتیجہ اور ثمریہ ہے کہ جب انسان خدا کی یاد میں رہے اور اس کی عظمت و کبریائی کی طرف متوجہ رہے تو خود بخود تکبر اور غرور سے پاک و منزہ ہو جاتا ہے اور سمجھ لیتا ہے کہ بزرگی و عظمت صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے اس طرح وہ خدا کے سامنے۔ اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے۔ زمین پر گر پڑتا ہے اور عظمت خداوندی کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہیچ سمجھتا ہے۔

”والزکوۃ تزکیۃ للنفس ونماء فی الرزق“

(خدا نے زکوۃ کو واجب فرمایا تاکہ انسان کے نفس کو آلودگیوں سے پاک کرے)

اور اس کی روزی میں وسعت عطا کرے۔ یعنی تزکیہ نفس اور وسعت رزق کی خاطر زکوۃ کو واجب فرمایا۔ لغت میں ”زکوۃ“ کے دو معنی ذکر ہوئے ہیں: ایک تطہیر، پاک کرنا اور دوسرے، نشو و نما، قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے کہ: ”خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم بہا (۱)“ (اے میرے رسول! اس لوگوں کے مال سے زکوۃ وصول کر تاکہ اس ذریعے سے انہیں پاک اور منزہ کرے) بنا بریں یہ کہا جاسکتا ہے کہ زکوۃ کی ادائیگی، انسانوں کی پاکیزگی اور تزکیہ نفس کا موجب بنتی ہے، کیونکہ عموماً دنیا کی مال و دولت، انسان کے دل و جان پر مسلط ہے اور وہ اسی مال و دولت سے محبت رکھتا ہے اور اسی مال کو جسے اس نے زحمات اور کافی محبت سے کمایا تھا جب خدا کی خاطر، اس سے ہاتھ اٹھاتا ہے اور اپنے شرعی واجبات کو منجملہ زکوۃ کو ادا کرتا ہے تو یہ واقع میں ایک تزکیہ نفس ہے، یعنی اپنے مال کو خدا کی راہ میں دے کر۔ اس نے دنیا اور مادیات کی وابستگی اور آلودگی سے اپنے آپ کو پاک اور منزہ کر لیا ہے۔

اگر زکوۃ کا معنی، نشو و نما ہو تو زکوۃ دینے کی وجہ سے انسان کے مال سے کچھ کم نہیں ہوتا، بلکہ اس میں برکت اور اضافہ ہی ہوتا ہے کیونکہ خداوند عالم زکوۃ کے بدلے میں نہ صرف دنیا میں اس کی روزی میں اضافہ فرماتا ہے بلکہ آخرت میں بھی اس کو کئی گنا زیادہ عنایت فرماتا ہے۔ واقع میں زکوۃ انسان کی جائیداد کا بیمہ ہے۔ جس میں انسان خدا کے ساتھ بیمہ کا معاہدہ کرتا ہے۔ روایات میں بھی آیا ہے کہ: ”حصنوا اموالکم بالزکوۃ“ (زکوۃ کی ادائیگی کے ذریعے اپنے جائیداد کی حفاظت کیا کرو)۔

حضرت زہراء (ع) نے یہاں پر زکوۃ کے دونوں معانی کو ذکر فرمایا ہے کہ: ”والزکوۃ تزکیۃ للنفس ونماء فی الرزق“ (خدا نے زکوۃ کو واجب قرار دیا تاکہ اس کے ذریعے تمہاری جانوں کو مال دنیا کی

دائستگی اور آلودگی سے پاک و پاکیزہ کرے اور ساتھ ہی تمہارے رزق میں برکت اور وسعت عطا کرے (۱)

۳۔ روزہ

”والصيام تثبيتاً للاخلاص“

(اور روزے کو واجب فرمایا تاکہ بندوں کے اخلاص کو مستحکم کیا جائے)

نماز اور حج جیسے بعض اعمال و جود ہی یعنی ایسے عمل ہیں جنہیں انجام دینا پڑتا ہے اور کسی چیز کو وجود عطا کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، حالانکہ روزہ ایک امر ”عدی“ ہے۔ یعنی ایسا عمل جس کے لئے کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اسی لئے بہت ہی کم لوگوں کو پتہ ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو روزہ ہے، اسی لئے روزے میں ریا کاری کی گنجائش بہت ہی کم ہے۔ اسی طرح ریا کاری کے لئے روزہ رکھنے والے بھی بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ لہذا اگر کوئی صحیح معنوں میں روزہ رکھے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نیت خالص ہے اور وہ بہت ہی اخلاص رکھتا ہے۔ اسی لئے آپ (ع) فرماتی ہیں کہ: ”والصيام تثبيتاً للاخلاص“ (خداوند عالم نے روزہ کو فرض فرمایا تاکہ اپنے بندوں کے اخلاص کو ثابت قدم رکھے۔ روزے سے اخلاص اس لئے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ ایک عدی امر ہے اور یہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف جذب کرنے کا بہت ہی کم سبب بنتا ہے اور عموماً ایسے لوگ ہی روزہ رکھتے ہیں جن کا قصد اور نیت صرف خدا کی رضا ہوتی ہے۔ شاید اسی نکتہ کی وجہ سے ہو کہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ خداوند متعال نے فرمایا کہ: ”الصوم لی وانا اجزی بہ (۲)“ (روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا (۳)۔

۱۔ بحار الانوار میں علامہ مجلسی ”ثناء فی الرزق“ کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ یہ جملہ سورہ روم کی ۳۹ آیت شریفہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ: ”وما آتیتم من زکوۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ہم المضعفون“۔ البتہ یہ اشارہ اس صورت میں صحیح ہوگا کہ اس آیت میں لفظ زکوۃ سے زکوۃ واجب مراد ہو نہ کہ ہر صدقہ۔

۲۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ”اجز“ کے بجائے ”اجزی بہ“ فعل مجہول ہو، بنا بریں معنی یہ ہوں گے کہ (میں خود روزہ کا اجر ہوں گا) یعنی واقعی روزہ کا اجر وصول الی اللہ اور خدا کے۔ جمال۔ کا شہود ہے۔ در حقیقت روزہ کا اجر و ثواب، پروردگار کا مشاہدہ اور اس کی روحانی لقاء ہے۔

۳۔ علامہ مجلسی ”بحار الانوار میں حضرت زہراءؑ کے اس جملے کے لئے ایک اور معنی ذکر فرماتے ہیں وہ یہ کہ ”خدا نے روزے کو“

”والحج تشييداً للدين“

(اور حج کو دین کی تقویت و استحکام کی خاطر فرض کیا)

حضرت زہراء (ع) نے جو فرمایا کہ حج دین کے استحکام کا سبب بنتا ہے اس کی ایک توجہ یہ ہے کہ حج میں انسان، حضرت ابراہیم (ع) کی پیروی کرتا ہے اور چونکہ حضرت ابراہیمؑ نے تمام دنیوی وابستگیوں اور محبتوں کو ترک کر دیا تھا یہاں تک کہ خدا کی راہ میں اپنے عزیز فرزند کو قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے، اس طرح انہوں نے توحید اور خدا پرستی کے آخری درجے کا مظاہرہ کیا۔ اب چونکہ ہم حضرت ابراہیمؑ کی پیروی کرتے ہیں تو دراصل ہم توحید اور وحدانیت کی بنیادوں کو مستحکم اور دین کی تقویت کر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حج ایک اسلامی کانفرنس ہے جہاں مسلمانوں کو باہمی تفہیم کے ساتھ دین کی تقویت اور استحکام سے مربوط امور کا جائزہ لینا چاہئے۔ روایات حج کے اس پہلے پر بھی دلالت کرتی ہیں۔ بنا بریں حج میں جہاں انفرادی اور عبادی پہلو ہے تو وہاں سیاسی اور معاشرتی پہلو بھی موجود ہے۔ اسی لئے آپؐ ارشاد فرماتی ہیں کہ: ”والحج تشييداً للدين“ (حج دین کے استحکام کا سبب بنتا ہے) یہ اس لئے کہ ایک طرف سے یہ ایک اسلامی کانفرنس ہے جس میں دین کی تقویت کے لئے مسلمانوں کے درمیان یکجہتی پائی جاتی ہے اور دوسری طرف سے حجاج توحید پر اپنے ایمان کو مکمل کرتے ہیں کیونکہ احرام کی حالت میں انسان، لباس اور دنیا کے ظاہری مقام و منصب وغیرہ کے خول سے باہر قدم رکھتا ہے اور شیطان کو سنگسار کرنے کے بعد قربانی پیش کرتا ہے تو یہاں گویا وہ۔ مسلخ عشق پر۔ اپنے نفس کو قربان کر دیتا ہے۔ یہ سب اعمال اور حج کے لئے جو فلسفے ذکر کئے جاتے ہیں ایک دوسرے سے مل کر انسان کے دین کی تقویت کا سبب بنتے ہیں۔

= اخلاص کے استحکام اور بقاء کے لئے واجب قرار دیا ہے (چونکہ بعض دوسری روایات کے مطابق ”ثبیتاً“ کے بجائے ”عمیماً“ (بیان کرنے کی خاطر) ذکر ہوا ہے۔ علامہ مجلسیؒ بھی اسی معنی کی تائید فرماتے ہیں جسے ہم نے متن میں ذکر کیا ہے اور اس کی تائید میں کئی روایات نقل کر کے اس کی وضاحت فرماتے ہیں۔

”والعدل تنسيقاً للقلوب“

(دلوں کو باہم مربوط اور ہم آہنگ بنانے کے لئے خدا نے عدل و انصاف کو واجب فرمایا)
ظلم دلوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے لیکن۔ کسی معاشرے میں۔ جب عدل و انصاف ہو تو
دلوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ ظلم اور بے انصافی کے نتیجے میں معاشرے کا نظام پاش پاش
ہو جاتا ہے اور ظلم مختلف طبقوں، حکومتوں اور قوموں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لے آتا ہے لیکن
عدل و انصاف اس بات کا موجب بنتا ہے کہ افراد، قومیں اور حکومتیں ایک دوسرے پر اعتماد کریں نیز
ملکی اور بین الاقوامی سطح پر۔ تعلقات اور معاشرتی یکجہتی کو فروغ دیں۔

۶۔ اہل بیت علیہم السلام کی امامت

”وطاعتنا نظاماً للملة“

(اور ہماری اطاعت کو واجب قرار دیا تاکہ دین اسلام اپنے اصلی نظم اور حالت پر برقرار رہے)
اہل بیت کی پیروی و فرمانبرداری اس لئے دین کی حفاظت اور اس کے نظم کا سبب بنتی ہے کہ تمام
امور کا محور دین ہے اور اس محور کا بیان اور۔ اس کی پاسداری۔ ایسے امام اور پیشوا کے ذریعے سے ہی
ممکن ہے کہ جو سب سے زیادہ دین شناس اور پرہیزگار ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام کمالات کا
حامل بھی ہو۔ اور یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ۔ اہل بیت علیہم السلام دین شناسی میں دوسروں سے
آگاہ تر اور قرآنی حقائق سے زیادہ آشنا ہیں، کیونکہ ان کے علم کا سرچشمہ مبدع وحی سے پھوٹتا ہے لہذا
دینی امور کا نظم و ضبط اور ان کی ہم آہنگی کا راز ان کی اطاعت میں ہی مضمر ہے۔

”وامامتنا اماناً من الفرقة“

(خدا نے ہم اہل بیت کی امامت کو واجب قرار دیا تاکہ۔ ملت اسلامیہ۔ کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے)
یہاں پر حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ واقع میں امامت ہمارا حق ہے اور یہ حق خدا نے ہمیں

عنایت فرمایا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ: لوگ اختلاف کا شکار نہ ہوں اور لوگ مختلف سمتوں میں بکھر نہ جائیں بلکہ سب ایک ہی مرکز میں جمع ہو جائیں، البتہ ایسا مرکز جسے عقل نے بھی تسلیم کیا ہو اور یہ اس وقت ممکن ہے کہ ایک شخص، علم، تقویٰ، تدبیر، عدالت اور خدا کے ساتھ رابطے کے علاوہ دوسرے پہلوؤں سے بھی عام لوگوں پر برتری رکھتا ہو، ایسی صورت میں تمام لوگوں کو چاہئے کہ اس کامل شخص کی پیروی کریں اور پھر اختلاف و پراکندگی وجود میں نہیں آئے گی۔ بلکہ یہ ایک منجم اور طاقتور قوم بن کر ابھرے گی، اب اگر اس عقل پسند اور شریعت کی طرف سے تعین شدہ حقیقت پر لوگوں کو جمع نہ ہونے دیا اور باہمی اختلاف کی بنیاد رکھی تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔

۷۔ جہاد اور صبر،

”والجہاد عزا للاسلام۔ وذلاً لاهل الکفر والنفاق۔“

(اور جہاد کو واجب فرمایا تاکہ اسلام کی عزت و عظمت کا باعث بنے۔ اور کفار و منافقین کو ذلیل و سوا کر دے) جہاد کی اسی خصوصیت کی بنا پر قرآن میں اس کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ اسی بنا پر جہاد کے بارے میں قرآن اور روایات نے جتنی توجہ دی ہے فروغ دین کی کسی دوسری فرع پر شاید ہی اتنی توجہ دی ہو۔ رسول خدا (ص) اور ائمہ معصومین (ع) کے اقوال میں، جہاد کے بارے میں مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے۔ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام، نبج البلاغہ میں جہاد کو بہشت کا ایک مخصوص دروازہ قرار دیتے ہیں (۱) نیز امام جعفر صادق علیہ السلام نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ: ”بہشت میں باب المجاہدین نامی ایک مخصوص دروازہ ہے جہاں سے خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے، ایک خاص وقار کے ساتھ بہشت میں داخل ہوں گے“۔ آپ ترک جہاد کو دین کی نابودی، زندگی میں ذلت و رسوائی اور معاشی بد حالی کا سبب سمجھتے ہیں (۲)۔

۱۔ نبج البلاغہ خطبہ ۲۷

۲۔ وسائل الشیعہ ج ۱۱ باب الجہاد حدیث ۲۔ جناب استاد حضرت آیت اللہ منتظری کی ولایت فقیہی نامی کتاب کی ج ۱ میں اس موضوع پر تفصیلی بحث ہوئی ہے۔

”والصبر معونة على استيجاب الاجر“

(اور صبر کو اجر و ثواب کے استحقاق کا ذریعہ قرار دیا)

ہماری بعض روایات کے مطابق صبر کی تین قسمیں ہیں (۱):

۱۔ مصیبت پر صبر: جب انسان پر کوئی مصیبت آئے یا اس کا بیٹا یا بیٹی یا کوئی اور عزیز اس دنیا سے چلا جائے تو وہ جذبات میں نہ آئے۔ زمین و آسمان کو نقش نہ دے، خدا اور پیغمبر (ص) کا انکار نہ کرے، بلکہ صبر سے کام لے۔ کیا صبر کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار بھی ہے؟ اگر انسان صبر نہ کرے اور عجلت کرے، اپنے آپ کو پیٹے، چیخے اور چلائے، تو کیا اسے کچھ حاصل ہوگا؟ لہذا کیا یہ بہتر نہیں کہ انسان مصیبت کے اوقات میں صبر کرے اور اپنے امور کو خدا کے حوالے کر دے، تو خداوند متعال بھی اس صبر کے عوض میں اس کو اجر عظیم عنایت فرمائے گا۔ خداوند بزرگ دیر تر قرآن میں ارشاد فرماتا ہے کہ: ”ولنبلونکم بشئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات، وبشر الصابرين (۲)“ (خوف، بھوک، جان و مال اور اولاد میں کمی کھڑے، ہم تمہیں آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو بشارت دے) یعنی ہم تم پر خوف اور بھوک مسلط کریں گے، تمہارے مال اور تمہاری اولاد کو واپس لے لیں گے اس طرح تم سے امتحان لیا جائے گا تاکہ جو لوگ واقعی مومن ہوں گے دوسروں سے الگ ہوں گے اور صبر کرنے والوں کو بشارت دو۔ پھر۔ صبر کی علامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ: ”الذین اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا لله وانا اليه راجعون (۳)“ (صابر وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو عجلت، داد و فریاد اور خدا و رسول (ص) کی اہانت کرنے کے بجائے کہتے ہیں: ”انا لله وانا اليه راجعون“ ہم خدا کی مخلوق ہیں اور ہمیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے)۔ اور اپنے آپ سے کہتا ہے کہ۔ یہ مصیبت جو آئی اور وہ عزیز جو اس دنیا سے چلا گیا ہے۔ تو یہ کوئی اضطراب کی بات نہیں۔ عنقریب تم بھی چلے جاؤ گے اور ان کے ساتھ مل جاؤ گے

۱۔ اصول کافی ج ۲ کتاب الایمان الکفر، باب الصبر، حدیث ۱۵۔

۲۔ سورۃ بقرہ ۱۵۵۔

۳۔ سورۃ بقرہ ۱۵۶۔

۔ کیونکہ اس دنیا سے ہم سب نے جانا ہے۔

۲۔ اطاعت پر صبر: خدا کی اطاعت کرے اس کے واجبات اور دستورات پر عمل کرے اور اس سلسلے میں جو تکلیفیں اور مشقتیں اٹھانا پڑیں تو خوشی کے ساتھ ان کو برداشت کرے، کیونکہ بہشت ہمیں مفت میں نہیں دی جاتی بلکہ اس کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے، ایسا ہرگز نہیں کہ ہم دین کی خاطر کسی بھی زحمت، تکلیف اور سختی کو تحمل نہ کریں اور اسی طرح بہشت میں چلے جائیں، قرآن میں خداوند تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: ”ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما ياتكم مثل الذين خلوا من قبلكم“ (کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ اسی طرح بہشت میں داخل ہو جاؤ گے جبکہ تم سے وہ امتحان نہیں لئے جائیں گے جو گزشتہ امتوں سے لئے گئے تھے) پھر خدا گزشتہ قوموں سے لئے گئے امتحانی پرچے کی وضاحت اسی آیت کے ذیل میں اس طرح فرماتا ہے کہ: ”مستهم البساء والضراء وذل لواحتي يقول الرسول والذين آمنوا معه متى نصر الله“ (ان پر اس قدر سختی اور مشکلات آئیں اور ان کو اتنا جھنجھوڑا گیا کہ خدا کا رسول اور اس پر ایمان لانے والے، پکار اٹھے کہ، خدا نے نصرت اور مدد کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ کہاں گیا؟ اور کب پورا ہو گا؟)

خلاصہ کلام یہ کہ: آسائش و سکون اور خدا کی راہ میں سختیاں اور مشکلات جھیلے بغیر بہشت کی توقع نہیں رکھی جاسکتی بلکہ ضروری ہے کہ خدا کی راہ اور دین اسلام کی سر بلندی کے لئے سختیوں اور بھوک و پیاس کو تحمل کریں اور یہ یقین پیدا کریں کہ اس راہ میں صبر کرنے والوں کا اجر و ثواب خدا ہی عنایت فرمائے گا۔

۳۔ معصیت (گناہ) پر صبر: صبر کی یہ قسم پہلی دو قسموں سے افضل ہے، گناہ و معصیت پر صبر کا مقصد یہ ہے کہ گناہ کے تمام ذرائع اور وسائل فراہم ہوں لیکن اس کے باوجود خدا کی رضا کو سامنے رکھ کر گناہ سے باز رہے، صبر کی یہ قسم دوسری قسموں سے اہم تر ہے اور اس کا ثواب بھی زیادہ ہے۔

بہر صورت اس حملے میں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: خدا نے صبر کا حکم اس لئے دیا کہ تمہیں

خدا کی طرف سے اجر و ثواب ملے۔ لہذا صبر، ثواب اور آخرت میں اجر لینے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس طرح کہ آپؐ کا کلام، اس آیہ شریفہ کی طرف اشارہ ہے کہ: ”انما یوفی الصابرین اجرہم بغیر حساب (۱)“ (صبر کرنے والوں کو خداوند بے حساب اجر و ثواب عنایت فرماتا ہے)۔

۸۔ امر بالمعروف،

”والامر بالمعروف مصلحة للعامة“

(اور امر بالمعروف کو معاشرے کی مصلحت کی خاطر واجب کیا)

دین اسلام نے تمام انسانوں کو یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ احکام الہی کو نافذ کریں۔ ہر شخص پر جہاں اس کی اپنی انفرادی ذمہ داریوں کو انجام دینا لازم ہے وہاں یہ بھی واجب ہے کہ دوسروں کو بھی اپنے فرائض کی ادائیگی کی نصیحت کرے اور ان کو محرمات سے دور رکھے۔ لہذا امر بالمعروف تمام لوگوں کے مفاد میں ہے کیونکہ اگر اسے ترک کیا جائے تو خدا کے احکامات متروک ہو کر معاشرے میں محرمات عام ہو جائیں گے اور اس سے یقیناً معاشرے کو نقصان پہنچے گا۔ قرآن میں ارشاد ربانی ہے کہ: ”ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینبہون عن المنکر (۲)“ (تمہارے درمیان ایک ایسے گروہ کا ہونا لازم ہے جو بھلائی کی جانب دعوت دے، نیکیوں کا حکم دے اور برائیوں سے روکے) البتہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کے کچھ مراتب اور شرائط ہیں کہ جو اس کے اپنے مقام پر کئے جا چکے ہیں (۳)۔

۹۔ والدین کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی،

”وبر الوالدین وقایة من السخط“

۱۔ سورہ زمر / ۱۰۔

۲۔ آل عمران / ۱۰۴۔

۳۔ امر بالمعروف و نہی از منکر سے مربوط مباحث، ولایت فقیہ کی دوسری جلد، بارہویں مجلہ میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

(اور خدا نے ماں اور باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ آپ کو اپنے غضب سے محفوظ رکھے)

والدین کے ساتھ احسان اور نیکی اسلام کی اہم تعلیمات میں سے ایک ہے۔ قرآن میں کئی مقامات پر اس کی تاکید کی گئی ہے ان میں سے ایک سورۃ بقرہ کی یہ آیت کریمہ ہے کہ: ”واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل ان لا تعبدون الا الله وبالوالدین احساناً... (۱۱)“ (جب ہم نے بنی اسرائیل سے یہ عہد و پیمان لیا کہ خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں اور اپنے والدین کے ساتھ نیکی کریں) یہاں خداوند عالم نے اپنی عبادت کے بعد والدین کے ساتھ نیکی کا حکم دیا ہے اور یہ اس مسئلہ کی اہمیت کو بیان کرتا ہے۔

حضرت۔ فاطمہ زہراء (ع)۔ یہاں فرماتی ہیں کہ خدا نے ماں باپ کے ساتھ احسان اور اچھے سلوک کرنے کو واجب قرار دیا ہے تاکہ تمہیں اپنے قہر و غضب اور عذاب سے بچایا جائے کیونکہ اگر کوئی شخص اپنے والدین کو اذیت پہنچائے اور اس کو والدین عاق کر دیں تو وہ حقیقت میں خدا کے غضب کا شکار ہو جاتا ہے۔

”وصلۃ الارحام منساة فی العمر ومنماة للعدد“

(خدا نے صلہ رحم کو واجب کیا تاکہ عمر طولانی عمر اور تعداد میں اضافے۔ نسل میں برکت۔ کا سبب بنے)

”منساة اور نسا“ تاخیر کے معنی میں آتے ہیں یہاں پر اگر ”منساة“ میم کو زبردے کر پڑھیں تو یہ اہم مکان ہے اور اس کے معنی ہوں گے، عمر میں تاخیر ہونے کی جگہ، لیکن اگر ”منساة“ پڑھا جائے تو یہ اسم آلہ ہے اور اس کا معنی ہو گا تاخیر کرنے کا ذریعہ یا آلہ۔ ہم ”منساة“ کو اسم مکان قرار دیں یا اسم آلہ، بہر صورت منساة فی العمر کا مقصد طول عمر ہی ہے۔

”منماة“ بھی اسم آلہ ہے یعنی نشو و نما اور تعداد میں اضافہ کرنے کا وسیلہ ”منماة للعدد“ کا معنی و مقصد یہ ہے کہ اگر تم صلہ رحم کرو گے اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک رکھو گے تو مرگ مفاجات۔ اور جان لیوا حادثات اور بیماریوں۔ سے محفوظ رہو گے اس طرح خود بخود تمہارے۔ خاندان کے افراد۔ کی تعداد میں اضافہ ہو گا۔

اصول کافی (ج ۲ ص ۱۵۰-۲۳۶) میں مرحوم کلینیؒ نے صلہ رحم اور قطع رحم ہر ایک کے ساتھ ایک ایک باب مخصوص کیا ہے اور وہاں پر صلہ رحم کی تاکید و اہمیت، قطع رحم کی مذمت اور دنیا و آخرت میں ان کے نتائج کے بارے میں رسول خدا (ص) اور ائمہ معصومین (ع) سے انتہائی اہم روایات نقل کی ہیں۔ بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت امیر المؤمنین (ع) فرماتے ہیں: ”جب بھی کوئی قوم صلہ رحم سے روگردانی کرے تو ان کی جائیداد شریہ اور بد قماش افراد کے ہاتھوں چڑھ جاتی ہے۔“

۱۰۔ قصاص

”والقصاص حقنا للدماء“

(خدا نے قصاص مقرر فرمایا تاکہ لوگوں کی جانیں محفوظ رہیں)

قانون قصاص کا فلسفہ یہ ہے کہ انسانی جانیں محفوظ رہیں اور خونریزی سے روکا جائے۔ قرآن کریم اس بارے میں فرماتا ہے کہ: ”ولکم فی القصاص حیوة یا اولی الالباب لعلکم تتقون (۱)“ (اے صاحبان عقل و خرد! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے، شاید کہ تم تقویٰ اختیار کرو)۔ قصاص میں زندگی کا راز مضمر ہونے سے مراد یہ ہے کہ جب انسان دیکھتا ہے کہ قاتل کو قصاص میں قتل کیا جاتا ہے تو یہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ کسی کو قتل نہ کرے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ قتل کرنے کی صورت میں اسے بھی قتل کیا جائے گا۔ اس طرح معاشرے پر قانون قصاص کا یہ اثر پڑتا ہے کہ لوگوں کی جانیں محفوظ رہیں اور کوئی قتل و خونریزی اور جنایت کا ارتکاب نہ کرے۔

۱۱۔ نذر پوری کرنا

”والوفاء بالنذر تعریضاً للمغفرة“

(خدا نے نذر پوری کرنے کو واجب قرار دیا ہے تاکہ اس کی وجہ سے خدا کی مغفرت و عفو کی اہلیت پیدا ہو جائے)

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نذر پوری کرنا مغفرت اور گناہ کی بخشودگی میں اثر رکھتا ہے۔ نذر پر عمل کی اہمیت اس آیہ شریفہ سے بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ: ”یوفون بالنذر ویخافون یوماً کان شرہ مستطیراً“ (۱) ”وہ اپنی نذر پر عمل کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا شر ہمہ گیر ہے“ (کیونکہ۔ اس آیت میں۔ خدا کے نیک اور صالح بندوں کی ایک نشانی، نذر پر عمل کرنا بتایا گیا ہے اور دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ”فوقہم اللہ شر ذلک الیوم...“ (۲) ”پس خدا نے اس دن کی سختیوں سے ان کو بچایا۔ اور نجات دی۔“ یہ آیت کریمہ، مغفرت اور قیامت کے دن کی سختی اور عذاب سے نجات کے بارے میں، نذر پر عمل کرنے کی تاثیر کو بیان کرتی ہے۔

۱۲۔ معاملات میں عدل و انصاف،

”وتوفیۃ المکائیل والموازین تغیراً للبئس“

(صحیح ناپ تول اس لئے واجب قرار دیا گیا ہے کہ کم فروشی نہ ہو اور کسی کا حق ضائع نہ ہو جائے) ”بئس“ کے معنی ہیں گھٹانا۔ کم کر کے پہنچنا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ کوئی دکاندار لوگوں کو مال کم دے اور قیمت پوری وصول کرے، خداوند عالم نے صحیح ناپ تول کا حکم دیا ہے تاکہ کسی کا حق ضائع نہ ہو اگر ناپ تول کا سسٹم نہ ہوتا تو لوگوں کے حقوق میں کمی بیشی ضرور ہو جاتی، لہذا خداوند عالم نے صحیح طریقے سے ناپ تول کرنے کا حکم دیا اور اسے واجب اور کم فروشی کو حرام قرار دیا ہے۔ قرآن کے کئی مقامات پر، صحیح ناپ تول اور کم فروشی کے مسئلے کی طرف توجہ دی گئی ہے اور کم فروش افراد کی سختی سے مذمت کی گئی ہے۔ اور یہ مسئلہ اتنا حساس اور اہمیت کا حامل ہے کہ مطففین۔ یعنی کم فروش افراد اور کم کر کے بچنے والے۔ کے نام سے ایک سورہ نازل ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ صحیح ناپ تول اور پیمانے کی امانت کا حکم اس لئے دیا گیا کہ کاروبار اور تجارت میں کسی کا استحصال نہ ہو کاروبار کے استحصالی نظام کو ایک صحت مند اور انصاف پر مبنی نظام میں بدل دیا جائے۔

۱۳۔ شراب کی حرمت،

”والنہی عن شرب الخمر تنزیہاً عن الرجس“

(شراب نوشی سے منع فرمایا تاکہ تمہیں آلودگیوں سے دور اور پاک رکھے)

جب کوئی شخص شراب پیتا ہے تو وہ اپنی عقل کھو بیٹھتا ہے کیونکہ شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے، جب کوئی عقل کھو بیٹھتے تو ممکن ہے کہ ہر قسم کی بدکاری (خلاف شرع کام) اس سے سرزد ہو جائے یہاں تک کہ مستی کی حالت میں کسی کو قتل کر دے، انہی مفاسد کی بنا پر خداوند متعال نے شراب نوشی حرام قرار دی ہے۔

حضرت فاطمہ زہراء (ع) کا یہ فقرہ قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ: ”انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان (۱)“ (شراب، جو اوہ بت جن پر قربانی ذبح کی جاتی ہے اور وہ تیر جن سے استخارہ کے لئے استفادہ کیا جاتا ہے۔ یہ سب۔ پلید اور ناپاک چیزیں ہیں اور شیطانی کاموں میں سے ہیں (۲) شراب نوشی گناہ کبیرہ ہے اور صراحت کے ساتھ شرابی کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے نیز اس کا غلط انجام بھی کسی سے پوشیدہ نہیں اور حاکم شرع شراب پینے والے پر شرعی حد کہ جو اسی کوڑے ہیں جاری کرے گا۔

۱۴۔ قذف کی حرمت،

”واجتناب القذف اجتناباً عن اللعنة“

(اور تمہیں غلط تہمتوں سے روکا گیا تاکہ تم خدا کی لعنت۔ قہر و غضب سے بچ سکو)

”قذف“ کے معنی ہیں کسی کو ناروا نسبت دینا، مثال کے طور پر کسی کو جان بوجھ کر زنا یا لواط کی

۱۔ سورۃ مائدہ / ۹۰۔

۲۔ ”ازلام، زلم“ کی جمع ہے اور ”زلم“ تیز لوک والے تیر کو کہا جاتا ہے جس کے سرے پر افعل نہ کرو۔ لکھا ہوتا تھا اے اچھا ہونے پر دلیل بنا کر انجام دیا جاتا اور جس کے سرے پر لا قفل نہ کرو۔ لکھا ہوتا تھا اے کام کے برے ہونے پر دلیل بنا کر انجام نہیں دیا جاتا تھا۔

نسبت دی جائے، تو خدا نے لوگوں کو اس غلط کام سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کہ: ”ان الذین یرمون المحصنات الغافلات لعنوا فی الدنیا والاخرۃ (۱)“ (وہ لوگ جو پاکدامن مگر غافل عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، یقیناً دنیا و آخرت دونوں میں وہ لعنت کیے گئے ہیں) اسی بنا پر حضرت زہراءؑ فرماتی ہیں کہ: ”واجتناب القذف“ یعنی خدا نے ناروا تہمتوں سے تمہیں روکا ہے۔ ”اجتناباً عن اللعنة“ تاکہ تم خدا کی لعنت، قہر و غضب سے محفوظ رہ سکو۔ قذف بھی گناہ کبیرہ ہے۔ حاکم شرع، فقہی کتابوں میں مذکورہ شرائط کے مطابق اس پر شرعی حد جاری کرے گا جو کہ اسی کوڑے ہیں۔ جنسی امور سے مربوط بہت ساری گالیاں، جیسے ماں، بہن وغیرہ سے مربوط گالیاں۔ اگر عمداً دی جائیں اور معنی کی طرف متوجہ ہو تو وہ بھی قذف میں شامل ہیں (۲)۔

۱۵۔ چوری کی حرمت،

”وترک السرقة ایجاباً للعفة“

(خدا نے لوگوں کو چوری سے منع فرمایا تاکہ ان کے ہاتھ پاک اور عفیہ رہیں)

چوری بھی گناہ کبیرہ ہے۔ اگر فقہی کتابوں میں مذکور شرائط پوری ہو جائیں تو اس پر شرعی حد جاری ہوتی ہے۔۔۔ یہ حد اس طرح جاری ہوگی کہ۔ پہلی مرتبہ چوری پر دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں کاٹی جائیں گی، دوسری دفعہ چوری کرنے پر بائیں طرف کے قدم کا آدھا حصہ کاٹ دیا جائے گا، اگر تیسری دفعہ چوری کرے تو عمر قید کی سزا ہوگی، اب اگر کوئی زندان میں چوری کرے تو اس دفعہ اسے پھانسی دی جائے گی۔ چوری کے لئے جو کڑی سزائیں مقرر کی گئی ہیں، ان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ چوری کی حرمت کس قدر شدید ہے۔ اور شریعت کو اس سے کس قدر نفرت ہے۔

۱۔ سورہ نور ۲۴۔

۲۔ قذف سے خاندان کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی برائیوں کا شکار ہو جاتے ہیں اس طرح انسانی معاشرہ انسانیت سے دور ہو کر غیر قابل اصلاح بحر ان کا شکار ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آج ہم مغربی دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔

”و حرم اللہ الشریک اخلصاً له بالربوبیۃ“

(خدا نے شرک کو حرام کیا تاکہ اس کی ربوبیت کے بارے اخلاص پیدا کریں)

کیونکہ وہ ہستی جو کائنات کی خالق اور رازق ہے، قدرت کاملہ اور کمال مطلق ہے، تو وہ۔ صرف۔ اللہ ہی کی ذات ہے اور خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے جھکنا۔ ایک قسم کی۔ غیر معقول حرکت ہے۔ پس ہمیں چاہیے کہ صرف خدا کے سامنے جھکیں، اسی لئے تواضع کریں اور اس کے لئے اخلاص پیدا کریں اور اپنے نفس کے بتوں کو۔ دل۔ سے نکال باہر کریں، ایسا نہ ہو کہ مقام عمل میں، ہم خواہشات نفسانی کو اپنا معبود اور خدا بنالیں اور ان۔ خواہشات۔ کے مطابق زندگی گزاریں، جیسا کہ قرآن نے بھی اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ: ”افرأیت من اتخذ الہہ ہواہ... (۱)“ (کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا کہ جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو اپنا خدا بنا رکھا ہے۔ اور خواہشات کی پرستش کرتا ہے۔) لہذا حضرت زہراءؑ اس جملہ میں فرماتی ہیں کہ: ”حرم اللہ الشریک“ خدا نے شرک کو حرام قرار دیا ہے۔ ”اخلصاً له بالربوبیۃ“ تاکہ اس کی ربوبیت کے بارے میں سب اپنے اندر اخلاص پیدا کریں۔

اخلص، شرک کا نقطہ مقابل اور اس کی ضد ہے، ان میں سے ہر ایک کے مراتب اور درجے ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ ایک انسان مؤمن بھی ہو اور نچلے درجے کے شرک۔ شرک خفی۔ میں بھی مبتلا ہو، جیسا کہ قرآن میں بھی آیا ہے کہ: ”وما مؤمن اکثرہم باللہ الا وہم مشرکون (۲)“ (اکثر لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے ہیں مگر یہ کہ وہ۔ اب بھی۔ مشرک ہیں)۔ یعنی جو لوگ ایمان لائے ہیں تو ان کے ایمان میں شرک۔ کی آمیزش ہے اور وہ کسی نازلتر درجہ پر شرک میں مبتلا ہیں اور اس لحاظ سے مشرک ہیں۔ بنا بریں، ایمان کامل، تو صرف انبیاءؑ، اولیاء اور خدا کے مقرب بندوں کا ایمان ہے کہ جو ہر قسم کے شرک سے پاک اور منزہ ہوتا ہے۔

تقویٰ کی وصیت

”فاتقوا اللہ حق تقاتہ“

(پس لوگو! حریم کبریائی کا اس طرح پاس رکھو جس طرح پاسداری کا حق ہے)
ہر شخص، ایک مخصوص مقام و منزلت رکھتا ہے اور اسی مقام و منزلت کے لحاظ سے اس کی شخصیت کو محفوظ ہونا چاہئے۔ اب خدا کی عظمت اور بزرگی و کبریائی کا عالم یہ ہے کہ عقل انسانی اس کی معرفت کی وادی میں حیران اور دنگ رہ جاتی ہے تو یہ واضح سی بات ہے کہ حریم کبریائی کی پاسداری اور تقویٰ کی ذمہ داری کس قدر سنگین ہوگی۔

”ولا تموتن الا و انتم مسلمون“

(۔ اس طرح زندگی گزار دو کہ تم پر موت نہ آجائے مگر یہ کہ تم مسلمان ہو)
۔ ہر وہ شخص جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے۔ اسلام کی موت نہیں مرتا، بلکہ مادیات کے ساتھ اس کی دل بستگی اور دنیا کی محبت اس بات کا سبب بنتی ہے کہ وہ عمر کے آخری لمحوں میں ہر چیز کا انکار کر دے! انسان اپنی پوری زندگی میں خدا اور پیغمبر (ص) کا نام لیتا رہتا ہے لیکن پھر بھی وہ ہر چیز کا منکر ہو جاتا ہے۔ انسان کو ایسے مواقع پر خدا کی پناہ مانگنی چاہئے۔

اسلام کے ساتھ موت آنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دنیوی وابستگیوں کی قید سے خود کو رہا کریں اور جیسا کہ حضرت زہراء (ع) نے بھی اپنے خطبے میں فرمایا کہ خدا کی حریم کبریائی کا پاس رکھنا چاہئے کیونکہ صرف ان لوگوں کا انجام اچھا ہو سکتا ہے کہ جو متقی اور پرہیزگار ہوں، ”والعاقبة للمتقين (۱)“

”واطيعوا اللہ فیما امرکم به و انہاکم عنه“

(خدا کی اطاعت کرو ان چیزوں میں کہ جن کا خدا نے امر کیا ہے یا اس سے روکا ہے)
۔ یعنی خدا کے اوامر اور نواہی میں اس کی اطاعت کرو۔ مقصد یہ ہے کہ واجبات کو ادا کریں اور محرمات سے بچے رہیں، بعض لوگ واجبات پر عمل کرنے کے بجائے، مستحبات پر عمل کرتے ہیں

حالانکہ یہ سراسر غلطی ہے۔ ضروری ہے کہ انسان سب سے پہلے واجبات اور محرمات کو اہمیت دے اور دوسرے مرحلے میں مستحبات پر عمل کرے۔ البتہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہم مستحبات سے غفلت برتنے لگیں۔ بلکہ حتی المقدور مستحبات پر بھی عمل کرنا چاہئے کیونکہ انسان کی روح کی پاکیزگی اور معنوی درجات کے حصول میں مستحبات کا بڑا عمل دخل ہے۔ درحقیقت مستحبات کو بجالانا واجبات کی تکمیل ہے۔

خدا کی معرفت اور علم کا رابطہ،

”فانه انما يخشى الله من عباده العلماء (۱)“

(کیونکہ فقط خدا کے صاحبان علم بندے ہی خدا سے ڈرتے ہیں)

اگر کوئی صحیح معنوں میں عالم ہو، خدا کی معرفت رکھتا ہو اور حق تعالیٰ کی صفات اور کمالات سے آگاہی رکھتا ہو تو وہ خود بخود خدا کی عظمت کے سامنے مرعوب ہوتا ہے۔ اس طرح کی خدا شناسی سائنسی علوم کے ذریعے بھی حاصل ہوتی ہے اور ”انما يخشى الله من عباده العلماء“ کی اس آیت میں لفظ علماء سے مراد صرف علم فقہ اور اصول کے دانشور ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے ذکر شدہ آیات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سائنس اور معاشرتی علوم کے دانشور بھی شامل ہیں، کیونکہ وہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: ”الم تر ان الله انزل من السماء ماءً فأخرجنا به ثمرات مختلفاً الوانها ومن الجبال جدد بيض وحمر مختلف الوانها وغرابيب سود ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوان“ (۲) (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ: خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے رنگارنگ میوے پیدا کئے اور پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ، بہت سیاہ اور دوسرے مختلف رنگوں کی نشانیاں بنائیں اور اسی طرح انسانوں، جن بندگان اور چارپاؤں کو بھی مختلف رنگ اور شکل میں پیدا کیا) ان آیات میں خداوند عالم، نظام خلقت کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ یہ

سارے موجودات انتہائی ظرافت اور عظمت کے ساتھ خلق ہوئے ہیں اور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ان کا کوئی خالق ہے اور وہ قادر مطلق اور حکیم علی الاطلاق ہے۔ یہاں پر زمین شناسی، معدن شناسی، انسان شناسی اور حیوان شناسی سے مربوط چند مسائل کو بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ: ”انما یخشى الله من عباده العلماء“ تو اس کا مقصد یہ ہے کہ جو بھی ان علوم سے باخبر ہو اور یہ جانتا ہو کہ کائنات کی خلقت میں کس قدر دقت، طاقت، ہنرمندی اور نفاست سے کام لیا گیا ہے تو یہ خود بخود خدا کے سامنے مرعوب ہو گا اور خدا ترس بنے گا۔ پس معلوم ہوا کہ اس آیہ شریفہ میں لفظ علماء سے مراد صرف فقہ اور اصول۔ وہ علم جس میں فقہ کے ماخذ اور منابع سے بحث کی جاتی ہے۔ کے جاننے والے علماء ہی نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو انسان بھی، انسانی، معاشرتی اور سائنسی علوم میں دسترس رکھتا ہو اور یہ جان لے کہ اس کائنات کا کوئی حکیم، دانا اور قادر توانا خالق ہے تو وہ خود بخود خدا کی عظمت کے سامنے جھک جائے گا۔ اور اپنی بے چارگی اور بے بسی کا اس کو بھرپور احساس ہو گا۔ (۱)

اپنی اور اپنے پدر بزرگوار کی شخصیت کا تعارف:

”ثم قالت، ایہا الناس اعلموا! انی فاطمة وابی محمد (ص)“

(پھر آپؑ نے فرمایا کہ لوگو! جان لو کہ میں فاطمہ ہوں اور میرے باپ محمد (ص) ہیں)

یہاں پر آپؑ لوگوں کے احساسات و جذبات کو بیدار کرنا چاہتی ہیں کہ تمہیں کس طرح گوارا

۱۔ البتہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مادی علوم کا ہر دانشور اور ہر سائنسدان، خدا شناس ہو کیونکہ بہت سارے ایسے سائنسدان بھی ہیں جن کے دلوں میں خدا سے خوف اور خشوع کا دور دور تک بھی کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا، بلکہ مقصد یہ ہے کہ سائنسی علوم، کائنات کی خلقت کی عظمت اور ان کی تخلیق میں پائی جانے والی دقت اور نظم سے آگاہی کے ذریعے خداوند متعال کی عظمت اور اس کی قدرت کاملہ کو پہچانا جاسکتا ہے اور جو بھی خدا کی عظمت و بزرگی کو درک کرنے کا تو فطری طور پر اس میں خدا کے لئے خشوع پیدا ہوگا۔

۲۔ دوسرے الفاظ میں، کائنات اور اس کے اندر موجود نظام اور قانون کی معرفت ہی خدا شناسی اور خدا ترسی ہے لیکن ہر سائنسدان کا اس راہ پر گامزن ہونا یا نہ ہونا دوسری بات ہے۔ سائنسی علوم کے کتنے ہی ایسے ماہرین ہیں کہ جو اپنے علم و اپنی معرفت کے برخلاف قدم اٹھاتے ہیں۔

ہے کہ ہمارے اوپر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے جائیں اور تم خاموش تماشاخی بنے رہو!

”اقول عوداً وبدواً ولا اقول ما اقول غلطاً“

(ایک بار کہتی ہوں پھر بھی کہوں گی۔ یعنی بار بار کہوں گی۔ لیکن جو بات بھی کہوں گی اس میں کوئی غلطی نہیں ہوگی)

”ولا افعل ما افعل شططاً“

(اور جو کام کروں گی اس میں خلاف حق کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی)

”شطط“ وہ چیز جو حق کے خلاف ہو۔ حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: میں جو کچھ کہہ رہی ہوں یا انجام دے رہی ہوں وہ حق کے عین مطابق ہے اور حق سے ہٹ کر نہ تو کوئی بات کرتی ہوں اور نہ ہی کوئی قدم اٹھاتی ہوں۔

”لقد جاءكم رسول من انفسكم (۱)“

(بمحقق تمہارے پاس ایک ایسا رسول آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اسی معاشرے سے اٹھا ہے)
پیغمبر (ص) انہی لوگوں اور اسی معاشرے میں سے تھے اور پیغمبر (ص) کا کسی ایسے طبقے سے تعلق نہ تھا کہ جس کا تعلق معاشرہ سے کٹ کر ایک الگ تھلگ طبقے سے ہو، بلکہ پیغمبر (ص) کا تعلق اسی معاشرے سے تھا اور وہ شخص جو اسی معاشرے سے اٹھا ہو وہ معاشرے کے تمام دکھ درد اور ان کی مشکلات سے واقف ہوتا ہے کیونکہ وہ خود بھی اس معاشرے میں موجود مشکلات اور سختیوں کا مزہ چکھتا ہے لہذا اس قسم کے افراد ہی معاشرے کے خیر خواہ اور دلسوز راہنما ثابت ہوتے ہیں۔

”عزیز علیہ ما عنتم“

(اگر تم پر سختیاں اور مشکلات آتی تھیں تو وہ ان پر بہت ہی گراں گزرتی تھیں)

اگر کوئی صحیح معنوں میں اسی معاشرے کا فرد ہو تو وہ اس معاشرے کا دلسوز بھی ہوتا ہے لہذا اگر اس معاشرے کے کسی بھی فرد پر کوئی سختی یا دباؤ بھی آئے تو وہ غمگین ہوتا ہے اور لوگوں کے دکھ درد میں ان کا شریک ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ان سختیوں سے الگ تھلگ نہیں سمجھتا۔ ”عزیز علیہ“ یعنی

۱۔ یہاں سے وہ باتیں شروع ہوتی ہیں جن کے بارے میں آپؐ فرمائی تھیں کہ ”میں جو کچھ بھی کہوں گی صحیح اور حق کی بات کہوں گی“

پیغمبر اسلام (ص) پر بہت ہی سخت اور گراں گزرتا ہے کہ ”ماعنتم“ اگر تم پر کوئی مشکل یا سختی آپڑے تو۔ یہاں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ: خدا پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے تم پر جو ضرر واقع ہو رہا تھا، رسول خدا (ص) کو اس سے بہت دکھ ہوتا تھا، اسی لئے وہ بہت ہی چاہتے تھے کہ تم خدا پر ایمان لاؤ اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت پاؤ۔

”حریص علیکم، بالمؤمنین رؤف رحیم“

(تمہاری بھلائی کے خواہاں اور مؤمنین پر شفیق اور مہربان تھے)

پیغمبر (ص) تمہاری بھلائی چاہتے تھے اور اس بات کے مستثنیٰ تھے کہ جس میں تمہاری بہتری ہو اسے انجام دے اور اہل ایمان پر بہت بہت مہربان اور شفقت رکھتے تھے۔ آپؐ کے یہ حملے قرآن سے ماخوذ ہیں اور بعینہ یہی الفاظ قرآن میں ذکر ہوئے ہیں (۱)۔

دوسری آیت میں ارشاد ربانی ہے کہ: ”وما ارسلناک الا رحمة للعالمین (۱)“ (۔ اے ہمارے حبیب۔ ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ۔ آپ کو۔ دونوں جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے) حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ آپ (ص) تمام انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے لیکن مؤمنین پر آپ (ص) زیادہ مہربان اور ان پر آپ (ص) خصوصی نظر رحمت رکھتے تھے۔

پیغمبر اسلام (ص) اور حضرت علی (ع) کی اخوت اور ہمبستگی،

”فان تعزرة وتعزوة تجدواہ ابی دون نسانکم“

(اگر تم پیغمبر اکرم (ص) کے نسب کو دیکھو اور اسے پہچانو تو تم جان لو گے کہ وہ میرا باپ ہے، تمہاری عورتوں کا نہیں)

”واخا ابن عمی دون رجالکم“

(اور میرے چچا زاد۔ حضرت علیؑ کے بھائی ہیں نہ کہ تمہارے مردوں میں سے کسی کے بھائی)

یہ تو سب جانتے تھے کہ جب پیغمبر اسلام (ص) مدینہ تشریف لائے تو آپ (ص) نے مہاجرین اور انصار

غرض تمام مسلمانوں کے درمیان عقد اخوت (مواخات) باندھا اس وقت آپ (م) نے حضرت علیؓ کے ساتھ عقد اخوت جاری فرمایا اور حضرت علیؓ کو اپنے بھائی کے عنوان سے انتخاب فرمایا۔

یہاں پر حضرت زہراء (ع) پیغمبر (م) کے ساتھ حضرت امیر المؤمنینؓ کی قرابت اور رشتہ داری کی طرف لوگوں کو متوجہ کرانا چاہتی ہیں اور یہ بتا دینا چاہتی ہیں کہ امیر المؤمنینؓ میرے چچا زاد بھائی ہونے کے علاوہ رسول خدا (م) کے ساتھ اخوت بھی رکھتے ہیں اور اس اخوت کا لازمہ یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان معنوی اور روحانی لحاظ سے ایک قسم کی ہم آہنگی بھی موجود ہے۔ اس طرح آپؐ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ امیر المؤمنینؓ کی معنویت اور ان کے روحانی درجات اور کیفیت پیغمبر اکرم (م) کی طرح ہیں اور وہ اسی مقام و عظمت کے حامل ہیں۔

”و لنعم المعزى اليه“

(اور کس قدر خوش قسمت ہے وہ شخص کہ جس کی نسبت رسول خدا (ص) سے ہو)

البتہ یہاں پر نسبت سے مراد پیغمبر (م) کے ساتھ معنوی اور روحانی نسبت ہے، کیونکہ اگر صرف رشتہ داری کی نسبت مراد ہوتی تو ابو بکر اور عمر بھی پیغمبر (م) کے رشتہ دار تھے، کیونکہ ابو بکر عائشہ کا باپ، اور عمر حفصہ کا باپ تھا اور یہ دونوں پیغمبر (م) کی زوجات میں سے تھیں، پس جس نسبت پر افتخار کیا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ (ع) کا مقصد ظاہری رشتہ داری ہی نہیں بلکہ روحانی، معنوی اور فکری اتحاد ہے کہ جو حضرت علیؓ اور پیغمبر (م) کے درمیان پایا جاتا تھا اور یہی اتحاد اس بات کا سبب بنا کہ مدینہ میں پہنچتے ہی پیغمبر اکرم (م) آپؐ کو اپنے بھائی کے عنوان سے انتخاب کریں اور آپؐ کے ساتھ عقد اخوت باندھیں۔

آغاز رسالت کی کیفیت،

”فبلغ الرسالة صادعاً بالندارة“

(پھر رسول خدا (ص) نے جہالت اور شرک سے لوگوں کو ڈراتے ہوئے پیغام رسالت پہنچایا)

”صدع“ پھاڑنے اور ظاہر کرنے کے معنی میں آتا ہیں اور اس اعتبار سے کہ۔ تبلیغ رسالت۔ سکوت کو توڑ دیتی ہے اور کسی ایسی بات کو سامنے لاتی ہے کہ معاشرے میں موجود ماحول کو دیگرگوں کر دیتی ہے۔ ذیل کی آیت کریمہ میں۔ تبلیغ رسالت کے حوالے سے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ: ”فاصدع بما تؤمر (۱)“ (یعنی اظہر بما تؤمر: جس چیز کی تمہیں ذمہ داری سونپی گئی ہے اسے بیان اور ظاہر کر) حقیقت یہ ہے کہ رسول خدا (ص) کی رسالت اس دور کی معاشرتی صورت حال کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ وہ ان شرائط اور حالات کے سراسر برخلاف تھی جو اس وقت (عرب) کے معاشرے میں پائے جاتے تھے۔ اسی لئے رسول خدا (ص) کے ذریعے ابلاغ رسالت اور لوگوں کو۔ گمراہی و شرک۔ سے ڈرانا اس بات کا سبب بنا کہ اس وقت معاشرے میں پائے جانے والی خاموشی کے طلسم ٹوٹ جائیں۔

”مانلاً عن مدرجة المشرکین“

(مشرکین کی روش کو ٹھکراتے ہوئے۔ لوگوں کو توحید دیکتا پرستی کی طرف دعوت دی۔) اگرچہ پیغمبر (ص) کے رشتہ داروں، خاندان کے افراد اور دوسرے لوگوں کی اکثریت مشرک اور بت پرست تھے، رسول خدا (ص) نے ان کی راہ و روش کی کوئی پرواہ نہیں کی اور جس راستے پر وہ چلتے تھے اس کی مخالفت کرتے ہوئے توحید کا راستہ اختیار فرماتے اور لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دیتے اور شرک و بت پرستی سے ڈراتے تھے۔

”ضارباً ثبجہم، اخذاً باکظامہم“

(اپنی تبلیغ کے ذریعے۔ آپ (ص) نے کفار کی کمر توڑ دی تھی اور ان کی سانس کو سینوں میں بند کر دیا تھا) ”شیخ“ فرس کے وزن پر کمر اور کسی چیز کے درمیانی حصہ کے معنی میں آتا ہے اور ”کظم“ بھی فرس کا ہسم وزن ہے اور اس کے معنی ہیں سانس کی نالی اور گلہ۔ ان دو فقروں کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اکرم (ص) کفار کے ساتھ انتہائی شدت اور سخت طریقے سے پیش آتے تھے اسی لئے قرآن میں بھی ارشاد ہوا ہے کہ: ”اشدآء علی الکفار (۲)“ (پیغمبر (ص) اور اس کے ساتھی، کفار کے ساتھ سختی سے پیش آتے

تھے) البتہ کفار کے ساتھ انتہائی سختی اور شدت سے پیش آنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اخلاقی اور انسانی اصولوں کا لحاظ نہ رکھا جائے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ دینی امور میں۔ کسی قسم کی لچک، سودا بازی اور سہل انگاری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ۔ اپنی پوری طاقت اور ہمت کے ساتھ منطقی طریقہ سے استقامت کرنی چاہئے۔

دعوت کے تین مراحل

”داعی الی سبیل ربہ بالحکمة والموعظة الحسنة“

(اور یہ اس وقت تھا کہ جب آپ (م) لوگوں کو حکمت۔ واستدلال۔ اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے خدا کی طرف بلاتے تھے) ان فقرہوں میں آپؐ دعوت کے مراتب کا ذکر فرماتی ہیں، جیسا کہ قرآن بھی فرماتا ہے کہ: ”ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلہم بالتی هی احسن (۱)“ (حکمت، اچھی نصیحت اور بہترین مجادلہ کے ذریعے اپنے پروردگار کی راہ۔ توحید۔ کی طرف دعوت دو) آیہ شریفہ دعوت کے تین مرحلے بیان فرما رہی ہے:

۱۔ استدلال اور برہان کا مرحلہ: وہ افراد جو استدلال اور منطق کے پابند ہیں اگر ان کو کوئی بات دلیل کے ذریعے بتائی جائے تو قبول کر لیتے ہیں، ایسے افراد کو استدلال اور حکمت کے ذریعے خدا کی طرف دعوت دینی چاہئے۔

۲۔ موعظہ کا مرحلہ: بعض افراد ایسے ہیں جو استدلال کو نہیں سمجھتے ہیں بلکہ ان کی عقلیں ان کے جذبات کے تابع ہیں۔ مثلاً ایسے افراد کہ جو امام رضاؑ کو ان کے سنہری گنبد کے ذریعے سے پہچانتے ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں علم و فضل اور منطق و استدلال سے سروکار رکھنے والے افراد ہیں کہ جو امام رضاؑ کو ان کے کمالات کے ذریعے پہچانتے ہیں۔ بہر صورت۔ احساسات و عواطف سے مغلوب۔ افراد کو موعظہ و نصیحت کے ذریعے ہدایت کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ موعظہ و نصیحت میں تقریر کا پہلو نمایاں

ہوتا ہے اور ایسی باتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے جو سننے والے کو متاثر کریں۔

۳۔ جدل کا مرحلہ: بعض افراد ضدی اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں وہ نہ منطق و استدلال کو قبول کرتے ہیں اور نہ ہی نصیحت کا ان پر کوئی اثر ہوتا ہے، ایسے افراد کے ساتھ جدل سے کام لیا جائے اور وہ جن چیزوں کو مانتے ہیں ان کے ذریعے ان پر حجت تمام کر کے۔ اور۔ انہیں بحث میں شکست دے کر راہ راست کی طرف دعوت دی جائے۔

پیغمبر (ص) کی بت شکنی،

”یکسر الاصنام وینکت۔ ینکت۔ الہام“

(پیغمبر (ص) نے بتوں۔ اور جھوٹے معبودوں۔ کو توڑ دیا اور اپنے ہاتھوں سے مشرکین کے سردوں کو کچل دیا)
پیغمبر اکرم (ص) اپنے ہاتھوں سے بتوں کو توڑتے تھے۔ آپ (ص) نے ۳۶۰ بتوں کو توڑا، جنگوں میں بنفس نفیس شرکت فرماتے تھے اور مشرکین پر کاری ضرب لگاتے تھے۔

مندرجہ بالا دوسرا جملہ، دو صورتوں میں نقل ہوا ہے، بعض نسخوں میں ”ینکت“ اور بعض میں ”ینکت“ ذکر ہوا ہے، لیکن بظاہر ”ینکت“ صحیح نظر آتا ہے کیونکہ ”ینکت“ کے معنی ہیں ہاتھ سے کسی پر ضرب لگانا۔ الہام یعنی کھوپڑی، اس طرح ”ینکت الہام“ کے یہ معنی ہوں گے کہ رسول خدا (ص) مشرکین پر اپنے طاقتور ہاتھوں سے وار کرتے اور ان کا خاتمہ کر دیتے تھے، لیکن اگر ”ینکت الہام“ ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ (ص) بتوں کو منہ کے بل گرا دیتے تھے۔

”حتی انہزم الجمع وولوا الدبر“

(یہاں تک کہ مشرکین کی جمعیت نابود ہو گئی اور وہ سب بھاگ گئے)

پیغمبر اسلام (ص) اور مسلمانوں کی مقاومت اور فداکاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین نے ہر میدان میں شکست کھائی اور اپنے مورچے خالی کر کے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے (۱)۔

۱۔ آپ کا یہ فقرہ شاید سورہ ص آیت ۱۱ کی طرف اشارہ ہو جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ، ”جندنا ہناک مزموم من الاحزاب“ یعنی (وہ)۔

توحید کا پرچار اور کفر کا خاتمہ،

”حتی تغری اللیل عن صبحہ“

(یہاں تک کہ اندھیری رات کا خاتمہ ہو گیا اور صبح آشکار ہوئی)

پیغمبر اسلام (س) نے جو زحمات اور تکلیفیں برداشت کی تھیں اور جس ایثار و فداکاری کا مظاہرہ کیا تھا، اس نے رنگ لایا، اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں اور شرک و بت پرستی نابود ہو گئی اور۔ کفر و ضلالت کی گھٹا ٹوپ اندھیری رات ختم ہو گئی اور۔ حق و حقیقت نیز ہدایت کی۔ نورانی صبح آشکار ہوئی۔ اس حملے میں تشبیہ اور استعارہ سے کام لیا گیا ہے اور کفر و شرک کو شب تاریک سے اور حق و حقیقت۔ اسلام۔ کو صبح سے تشبیہ دی گئی ہے، جب اندھیری رات ختم ہو جاتی ہے اور صبح نمودار ہوتی ہے تو سورج کی نورانی کرنیں دنیا کو روشن کر رہی ہوتی ہیں۔ اسی لئے آپؐ فرماتی ہیں کہ: ”تغری اللیل عن صبحہ“ (رات کی۔ ہولناک دیواروں میں۔ صبح کی وجہ سے شکاف پڑ گیا) آپؐ کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح رات کی تاریکی کے اندر سے صبح کی روشنی نمودار ہوتی ہے اسی طرح اس وقت کے ماحول میں جو کفر و شرک کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، شکاف پڑ گیا اور توحید کی روشنی نمایاں ہوئی۔

”واسفر الحق عن محضہ“

(اور حق اپنی حقیقی اور اصلی شکل میں آشکار ہو گیا)

”اسفر“ کے معنی ہیں ظاہر اور آشکار۔ یہاں ”اسفر الحق“ سے صحیح اور خالص توحید مراد ہے، حق اور خدا پرستی کا نور، زمانہ جاہلیت کی خرافات اور جہالت و نادانی کے دبیز پردوں میں مخفی ہو چکا تھا، لیکن رسول خدا (س) کی بعثت نے ان پردوں کو چاک کر دیا اور معاشرے کی تطہیر کی اور حق و عدالت کی راہ کو نمایاں کیا (۱)۔

== ساری جماعتیں اور لشکر جنہوں نے اسلام اور عدالت کے مقابلے میں شکست کھائی (مقصود یا جنگ بدر ہے یا مجموعی طور پر حق کے مقابلے میں باطل کا محاذ۔

۱۔ قرآن میں جو ارشاد ہے کہ ”ویرکیم و یعلمم الکتاب والحکمۃ“ (آل عمران / ۱۶۴) پیغمبرؐ نے انہیں پاک کیا اور کتاب و حکمت سکھائی تو وہ اس واقعیت کو بیان کرنا چاہتا ہے کہ تعلیم کتاب و حکمت کا مقدمہ، تزکیہ نفس ہے جب تک انسان کا دل و دماغ خرافات اور جہالت سے پاک نہ ہو تو حکمت و دانش کا دل میں ترقی کرنا ممکن نہیں۔

”ونطق زعيم الدين وخرست شقاشق الشياطين“

(اور دين کے زعيم اور رہبر نے جب بولنا شروع کیا تو ان شياطين کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور وہ خاموش ہو گئے)
دين کے پيشوا اور رہبر نے بولنا شروع کیا یعنی، ختمی مرتبت (اس) نے جب دين کی تبليغ آغاز کی اور گفتگو شروع فرمائی کی تو کفر کے بولنے والے خاموش ہو گئے۔

”شقاشق، شقشقه“ کی جمع ہے۔ جب اونٹ غضب میں آتا ہے آواز نکالتا ہے تو اس کا منہ جھاگ سے بھر جاتا ہے اور اس کے منہ سے جھاگ جیسی ایک چیز نکلتی ہے کہ جسے عربی میں ”شقشقه“ کہتے ہیں۔ یہاں پر کفار کو اس طرح کے اونٹ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب پیغمبر (اس) نے گفتگو اور بولنے کی ابتدا فرمائی تو ان شياطين کی بلند آواز کٹ گئی اور خاموش ہو گئی جبکہ ان کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

منافقت اور کفر کی شکست

”وطاح وشيظ النفاق“ (اور منافقين کی جماعت نابود ہو گئی)

”طاح“ ہلاک ہوا، ”وشيظ النفاق“ اہل نفاق کی جماعت، لغت میں۔ وشيظ۔ پست، حقیر اور بے نام و نسب افراد کو کہا جاتا ہے اور منافقين بھی عموماً اسی قسم کے افراد ہی ہوا کرتے ہیں، ورنہ صاحب کردار اور اچھے خاندان کے افراد بہت کم ہی منافقت اور دو روئی کا شکار ہوتے ہیں اور کبھی۔ منافقت نہ کر کے۔ بہت سارے مادی مفادات کو ٹھکرا دیتے ہیں اور کئی خطروں کو مول لیتے ہیں۔

”وانخلت عقد الكفر والشقاق“ (اور کفر و دشمنی کی گرہیں کھل گئیں)

کفر اور دشمنی کی گرہ سے مراد شاید کفر اور اسلام دشمن طاقتوں کے درمیان ہونے والے عہد و پیمان اور معاہدے ہوں کہ جن کی بنا پر وہ اسلام کے مقابلے میں متحد ہو جاتے تھے اور ایک محاذ تشکیل دے رکھا تھا اور اسلام کی کامیابی اور مرحلہ وار پیشرفت کے نتیجے میں ان کے عہد و پیمان اور معاہدے بھی خود بخود ختم ہو گئے۔

”وفہتم بکلمۃ الاخلاص“

(اور تم سب کلمہ اخلاص و توحید پڑھنے لگے)

”فہ“ اس نے زبان سے کوئی بات کہی، اس کا مضارع ”یفہ“ ہے۔ مقصود یہ ہے کہ: تم پیغمبر اسلام (ص) پر ایمان لائے، اسلام اختیار کیا اور کلمہ اخلاص یعنی ”لا الہ الا اللہ“ کو زبان پر جاری کیا۔ جب اسلام کے راستے سے رکاوٹیں دور ہو جائیں اور کفار و اسلام دشمن عناصر کے معاہدے ختم ہو جائیں تو لوگ اپنی خدا داد فطرت کی رو سے توحید اور اخلاص کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔

”فی نفر من البیض الخماص“

(اور تم ایک ایسے گروہ میں تھے کہ جو نورانی چہرے اور خالی شکم۔ روزہ دار۔ انسانوں پر مشتمل تھا)

”بیض“ ابيض کی جمع ہے یعنی سفید، ”خماص“ خمس کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں بھوکے، جن کے پیٹ خالی ہوں۔ ”البیض الخماص“ سے روزہ دار اور نورانیت کے حامل افراد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے اور آپؐ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ تم ایک ایسے گروہ کے درمیان رہ رہے تھے جو نورانی اور سفید چہرے رکھتے تھے اور روزہ زیادہ رکھنے کی وجہ سے جن کے پیٹ ہمیشہ خالی رہتے تھے، اس گروہ سے آپؐ کی مراد اہل بیت پیغمبر (ص) ہیں چونکہ اس جملہ کی تشریح آپؐ خود فرماتی ہیں کہ:

”الذین اذهب اللہ عنہم الرجس و طہرہم تطہیراً“

(وہی افراد کہ جن سے خدا نے آلودگیوں کو دور کیا اور پاکیزگی۔ و طہارت۔ عطا کی)

یہ جملہ، سورۃ احزاب کی آیت ۳۳ کی جانب اشارہ ہے جو بہت ساری روایات کے مطابق اہل بیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی اور ان ہستیوں کی عصمت کے بارے میں بنی نوع انسان کو آگاہ کیا (۱)۔ ان کے شکم خالی ہونے کی یہ صفت کنایہ ہے اس بات سے کہ اہل بیتؑ کے شکم، مشکوک

۱۔ تفسیر المیزان ج ۱۶ ص ۳۱۱ میں مذکور ہے کہ ”ام سلمہ اور عائشہ کی اسناد سے اہل سنت کی مختلف کتابوں میں تقریباً ۴۰ روایتیں اور شیعہ کتب میں تقریباً ۳۰ روایتیں، امیر المؤمنینؑ، امام مجاہدؑ، امام باقرؑ و امام صادقؑ کی طرف سے نقل ہوئی ہیں۔ یہ ساری روایتیں صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آیۃ تطہیر، اہل بیتؑ کی شان ہی میں نازل ہوئی ہے۔“

غذاؤں سے خالی ہیں۔ یعنی کوئی ایسا لقمہ وہ نہیں اٹھاتے تھے کہ جس میں کوئی شبہ ہو۔ یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کثرتِ روزہ کی وجہ سے ان کے شکم اکثر خالی ہی رہتے تھے اور وہ بہت کم ہی کھانا کھاتے تھے۔

چہرے کی ٹورانیٹ اور سفید روئی بھی، اہل بیت کے معنوی اور معاشرتی مقام و منزلت اور ان کی خاندانی شرافت نیز حسب و نسب کی عظمت کی طرف اشارہ ہے۔ البتہ علامہ مجلسی مرحوم نے ان دو جملوں کے بارے میں اور کئی احتمالات بھی نقل فرمائے ہیں کہ جو ہماری نظر میں صحیح نظر نہیں آتے۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

پانچواں درس:

○ زمانہ جاہلیت میں،

جزیرۃ العرب میں انحطاط و پستی کے چند نمونے :-

- | | |
|-----------------|-------------------------------|
| ۱۔ معنوی کمزوری | ۲۔ سیاسی اور معاشرتی کمزوریاں |
| ۳۔ معاشی کمزوری | ۴۔ نفسیاتی کمزوری |

○ پیغمبر (ص) کے ذریعے انسانیت کی نجات

○ اسلام کی ترویج میں حضرت علی (ع) کا کردار

○ مختلف جنگی محاذوں میں،

حضرت علی (ع) کی دلیری اور شجاعت کے نمونے

○ حضرت امیر المؤمنین (ع) کی چند خصوصیات

○ کل کے گوشہ نشین، آج کے مفاد پرست

○ مفاد پرستوں کی خصوصیات

○ رحلت پیغمبر (ص) اور اس کے اثرات

○ گھات میں بیٹھے ہوئے شیطان صفت لوگ

○ بے وقوف تابعدار

وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ، مَذَّةَ الشَّارِبِ وَ نُهْزَةَ الطَّامِعِ وَ قُبْسَةَ
العجلان و موطىء الأقدام؛ تَشْرَبُونَ الطَّرْقَ وَ تَقْتَاتُونَ الْقَدَّ [الورق]، أَذْلَةُ
خَاسِثِينَ، تَخَافُونَ أَنْ يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِكُمْ، فَأَنْقَذَكُمُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى
بِأَبِي مُحَمَّدٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ بَعْدَ اللَّتَا وَ أَلْتَى وَ بَعْدَ أَنْ مَنَى بِهِمُ الرِّجَالُ، وَ ذُوبَانَ الْعَرَبِ، وَ
مَرْدَةَ أَهْلِ الْكِتَابِ، كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ، أَوْ نَجَمَ قَرْنُ الشَّيْطَانِ أَوْ
فَغَرَتْ فَاغِرَةٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ، قَذَفَ أَخَاهُ فِي لَهَوَاتِهَا، فَلَا يَنْكُفَىءُ حَتَّى يَطَّأَ
صِمَاحَهَا بِأَخْمَصِهِ وَ يَخْمَدَ لَهَا بِسَيْفِهِ، مَكْدُوداً فِي ذَاتِ اللَّهِ، مُجْتَهِداً فِي أَمْرِ
اللَّهِ، قَرِيباً مِنْ رَسُولِ اللَّهِ، سَيِّداً فِي أَوْلِيَاءِ اللَّهِ، مَشْمِراً نَاصِحاً، مُجِدِّداً كَادِحاً،
لَا تَأْخُذُهُ فِي اللَّهِ لَوْمَةٌ لَائِمٌ؛ وَ أَنْتُمْ فِي رِفَاهِيَّةٍ مِنَ الْعَيْشِ، وَادِعُونَ فَاكِهُونَ آمِنُونَ،
تَتَرَبَّصُونَ بِنَا الدَّوَائِرِ، وَ تَتَوَكَّفُونَ الْأَخْبَارَ، وَ تَنْكُصُونَ عِنْدَ النَّزَالِ، وَ تَفَرُونَ مِنَ
الْقِتَالِ؛ فَلَمَّا اخْتَارَ اللَّهُ لِنَبِيِّهِ دَارَ أَنْبِيَائِهِ وَ مَأْوَى أَصْفِيَائِهِ، ظَهَرَ فِيكُمْ حُسْنُكَ
النِّفَاقِ، وَ سَمِلَ جِلْبَابَ الدِّينِ، وَ نَطَقَ كَاطِمَ الْغَاوِينَ، وَ نَبَغَ خَامِلَ الْأَقْلِينَ، وَ هَدَرَ
فَنِيْقَ الْمُبْطِلِينَ، فَخَطَرَ فِي عَرْضَاتِكُمْ وَ أَطْلَعَ الشَّيْطَانَ رَأْسَهُ مِنْ مَغْرَزِهِ، هَاتِفاً
بِكُمْ فَأَلْفَاكُمْ لِدَعْوَتِهِ مُسْتَجِيبِينَ، وَ لِلْعِزَّةِ [لِلْغَرَّةِ] فِيهِ مَلَا حَظِينَ، ثُمَّ اسْتَنْهَضَكُمْ
فَوَجَدَكُمْ خَفَافاً، وَ أَحْمَشَكُمْ فَأَلْفَاكُمْ غَضَاباً، فَوَسَمْتُمْ غَيْرَ إِبْلَكُمْ، وَ وَرَدْتُمْ غَيْرَ

مُشْرِبَكُمْ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

کفر و نفاق پر اسلام کی فتح و کامیابی، اسلام دشمن عناصر کی شکست اور شرک کا خاتمہ کر کے توحید کی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں اہل بیت علیہم السلام کے کردار اور امت کے درمیان ان کے مقام و منزلت کے بارے میں مختصر اشارہ فرمانے کے بعد اب خطبے کے اس حصے میں اسلام سے قبل مسلمانوں کی حیثیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں:

زمانہ جاہلیت میں جزیرۃ العرب میں انحطاط و پستی کے چند نمونے:

۱۔ معنوی کمزوری:

”وکنتم علی شفا حفرة من النار (۱)“

(اور تم جہنم کے دھانے پر کھڑے تھے)

”شفا“ کسی چیز کے دہانے کو کہتے ہیں اور ”حفرة“ گڑھے کو کہتے ہیں۔ تم جہنم کے دہانے پر کھڑے تھے۔ اس حملے کا مقصد یہ ہے کہ جاہلیت کے دور میں تمہاری زندگی بت پرستی میں گزر رہی تھی، اگر پیغمبر خدا (ص) تشریف نہ لاتے اور تمہیں اس وقت کی برائیوں اور تباہ کاریوں سے نجات نہ دیتے اور

۱۔ حضرت نے یہ جملہ آل عمران کی آیت ۱۰۳/۱ سے اخذ کیا ہے۔

تمہیں مسلمان نہ بناتے تو تم جہنم کی آگ میں گر پڑنے کے لئے تیار تھے۔
 یہاں پر بخت سے پہلے کے معاشرتی حالات کو آپ اختصار کے ساتھ ان کے گوش گزار کرتی ہیں
 تاکہ وہ یہ سمجھ جائیں کہ وہ کیا تھے اور ابھی کیا بن چکے ہیں اور یہ بنیادی اور عمیق تبدیلی کس ہستی کی
 مرہون منت ہے؟ اور وہ یہ سوچیں کہ آج پیغمبر (س) کے اہل بیت اور آپ (س) کے باقی ماندہ آثار کے
 ساتھ کیا سلوک رواج رکھا جا رہا ہے؟ اور خود اصحاب کس قسم کی سیاست کا شکار ہو چکے ہیں؟

۲۔ سیاسی اور معاشرتی کمزوریاں،

”مذقة الشارب“

(تم تو پیاسے لوگوں کی پیاس بجھانے کا ذریعہ بنے ہوئے تھے)

حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: تم جو ایک ضعیف اور کمزور قوم تھے کہ جسے ہر طرف سے ہر
 کوئی اپنے ہر مقصد کے لئے استعمال کرتا تھا، بالکل اس وقت تیسری دنیا کی قوموں کی طرح، کہ یہاں کے
 اکثر لوگ غیر تعلیم یافتہ اور غریب ہوتے ہیں اور استعمار گر جب بھی چاہیں ان کے پاس آجاتے ہیں۔
 امریکہ اور برطانیہ، تیل کی خاطر حملہ آور ہوتے ہیں، کوئی گیس کو دیکھ کر، کوئی یہاں کے سونے کے ذخائر
 سے استفادہ کرنے کی غرض سے، تو کوئی اپنی مصرنی پیداوار کی کھپت اور ناکارہ اسلحوں کی فروخت اور اس
 کے لئے مارکیٹ کی تلاش میں، تیسری دنیا کا رخ کرتا ہے اور ان کو اپنے۔ وحشیانہ۔ حملوں کا نشانہ بناتا
 ہے۔ کیونکہ ہمیشہ سے کمزور قومیں، طاقتور قوموں کے حملوں کا نشانہ بنتی رہی ہیں اور طاقتور قوموں نے
 ہمیشہ ان سے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ حضرت زہراء (ع) ایسے ہی لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتی ہیں
 کہ: تم اتنے کمزور تھے کہ جو کوئی، جو بھی چاہتا تھا تمہیں اپنے جہوم اور حملے کا نشانہ بنالیتا تھا۔

”مذق یا مذقہ“ اس دودھ کو کہا جاتا ہے جس میں پانی ملا دیا گیا ہو۔ ”مذقة الشارب“ کا معنی یہ ہے کہ
 وہ پانی ملا ہوا دودھ، جس سے ہر پیاسا شخص اپنی پیاس بجھاتا ہے اور یہاں یہ مراد ہے کہ عربوں کی حالت
 یہ تھی کہ جو بھی تمہیں استعمال کرنا چاہتا تھا آسانی تمہیں استعمال کر لیتا تھا۔ ان کی مثال اس مال کی طرح

تھی کہ جس کا کوئی مالک نہ ہو اور ہر کوئی اپنی مرضی سے اس سے فائدہ اٹھائے۔

”ونہزة الطامع“

(لاپچی افراد کی فرصت اور موقع کے آلہ کار بنے رہے)

”نہزۃ“ نون پر پیش کے ساتھ فرصت اور موقع کے معنی میں آتا ہے۔ تم لاپچی افراد کی طمع اور ان کے للچ کو پورا کرنے کے لئے بہترین جگہ تھے۔ یعنی ہر طاقتور۔ شخص یا قبیلہ۔ جس کو للچ ہوتا تھا وہ تمہارے پاس آتا اور تمہارے منافع اور ذخائر سے استفادہ کرتا تھا اور اپنی للچ تک رسائی کے لئے تمہیں آلہ کار بناتا تھا۔

”وقبسة العجلان“

(اور تم جلد باز اشخاص۔ کے آگ کے شعلے لینے۔ کا مقام تھے)

زمانہ قدیم میں جلانے اور پکانے کے وسائل کم تھے، کھانا پکانے اور اپنے آپ کو گرم کرنے کے لئے آگ جلاتے تھے اس مقصد کے لئے عموماً لکڑی استعمال کرتے تھے۔ اگر کوئی آگ جلانا چاہتا تھا تو بڑی مشکل سے لکڑیاں جمع کرتا تب جا کر آگ جلاتا تھا۔ اگر کسی کو آگ کی ضرورت ہوتی لیکن لکڑیاں جمع کرنے کی فرصت نہ ہوتی اور وہ جلدی میں ہوتا تو وہ جا کر کسی دوسرے کی جلانی ہوئی آگ سے کوئی جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر لے جاتا تھا اور اس طرح اس شخص کی آگ بجھ جاتی تھی اور ختم ہو جاتی تھی اسی طرح اگر کئی افراد جلدی میں وہاں سے آگ کے جلتے ہوئے شعلے لے جاتے تو وہ آگ مطلوبہ ایندھن نہ ہونے کی وجہ سے مکمل طور پر بجھ جاتی تھی۔ ”قبسة العجلان“ اس جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں سے جلد باز اور شتابزدہ انسان جلدی میں آگ کے شعلے اٹھا اٹھا کر لے جائیں اور ان کے پاس اتنی فرصت نہ ہو کہ خود جا کر لکڑی جمع کریں اور اپنی لکڑیاں لا کر اس کے ذریعے آگ لگا کر گرمی کا ساماں فراہم کریں اور اچانک آکر وہاں سے کوئی جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر چلے جائیں۔

در اصل حضرت زہراء (ع) تشبیہ سے کام لے رہی ہیں اور یہ بیان کرنا چاہتی ہیں کہ: تم ہر طرف سے فارت اور هجوم کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے، مختلف مقامات سے لوگ آتے تھے اور تمہارے قدرتی ذخائر اور

مال و ثروت کو غارت کر کے چلے جاتے تھے لیکن تم اس قدر ضعیف، ناتوان اور کمزور تھے کہ اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتے تھے یہ طاقتور افراد اور قبائل تمہیں اپنے مقاصد کے لئے لقمہ ترکی طرح نگل لیتے تھے۔ ہاں! کمزور اور قوت ارادی سے عاری افراد کا ہمیشہ سے یہی حشر ہوتا ہے۔

”وموطیء الاقدام“

(اور تم قدموں تلے روندے جاتے تھے)

یعنی جہاں سے بھی کوئی آدمی آ جاتا تمہارے سروں پر قدم رکھ کے گزر جاتا تھا، علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں کہ: یہ ایک مشہور ضرب المثل ہے جو لوگوں کی ذلت اور شکست کو بیان کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔

حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ جب اسلام کے ذریعے تمہیں عزت و قدرت حاصل نہیں ہوئی تھی اس وقت تم اس قدر کمزور تھے اور ذلت کی زندگی گزار رہے تھے کہ دوسروں کے پاؤں تلے تم روندے جاتے تھے۔

۳۔ معاشی کمزوری

”تشریبون الطرق“

(تم گڑھوں میں جمع شدہ گندا پانی پیتے تھے)

آپ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ دینی اور مذہبی لحاظ سے تم اس قدر لپٹی کا شکار تھے کہ جہنم کے دھانے پر کھڑے تھے۔ معاشرتی لحاظ سے بھی تم کمزور اور بد بخت تھے کہ اسلام نے تمہیں عزت اور طاقت سے نوازا۔

”تشریبون الطرق“ تم گڑھوں کے گندے پانی پیتے تھے۔ ”طرق“ ایسے گڑھوں کو کہا جاتا ہے جو راستے کے بیچ میں ہوں اور مختلف قسم کے حیوانات اس میں پیشاب بھی کرتے ہوں۔

حضرت فاطمہ (ع) فرماتی ہیں کہ کیا تم وہی افراد نہیں کہ جو اس قسم کے گڑھوں کے گندے پانی

پیتے تھے۔ اور پینے کے لئے پاک اور صاف پانی کے چند گھونٹ فراہم کرنے کی تم سکت نہیں رکھتے تھے۔

”وتقتاتون القذ۔ الورق۔“

(تمہارا کھانا جانوروں کا دھجڑا ہوتا تھا جسے صاف نہ کیا گیا ہوتا۔ یاد رکھو کہ پتے تھے۔)

”تقتاتون“ کی اصل ”قوت“ ہے اور یہ باب افتعال سے مضارع کا جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔ باب افتعال میں ”اقتوت“ کی داد ایک صرفی قاعدے۔ متحرک حرف علت سے قبل زبر ہو تو وہ حرف علت الف میں بدل جاتا ہے۔ کے مطابق الف میں بدل گئی اور ”اقتات“ بن گیا۔ ”قذ“ اس چمڑے کو کہا جاتا ہے جس کو صاف نہ کیا گیا ہو۔

اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی غذا کو اس چمڑے سے تیار کرتے تھے جس کو صاف نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ ایسے چمڑوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ چربی ہوتی تھی، وہ بے چارے لوگ جو خالی ہاتھ۔ غریب۔ ہوتے تھے اسی چمڑے کو ابال کر ایک قسم کا سالن اپنے اور اپنے بچوں کے لئے تیار کرتے تھے۔ ان کی معاشی بد بختی اور پسماندگی کی حالت زار یہ تھی۔

بعض دوسرے نسخوں میں قذ کے بجائے ”الورق“ ذکر ہوا ہے۔ ورق یعنی درختوں کے پتے۔ پس اس حملے کا مقصد یہ ہو گا کہ تمہارا کھانا درختوں کے پتے تھے اور تم اسی کے ذریعے اپنی بھوک مٹاتے تھے۔ بہر صورت آپ اپنے مخاطبین کو یہ یاد دلانا چاہتی ہیں کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ کس قدر بد بخت اور بے چارے تھے اور تاسف انگیز زندگی گزار رہے تھے اور اب۔ مسلمان ہونے کے بعد۔ ان کی حالت کیا ہے۔ اور کتنی نعمتوں سے نوازے گئے ہیں۔

۳۔ نفسیاتی کمزوری۔

”اذلۃ خاسنین“

(تم۔ معاشرے میں۔ ذلیل و رسوا اور دھتکارے ہوئے لوگ تھے)

”اذلہ“ ذلیل و رسوا اور کمزور لوگ کے معنی میں ہے۔ ”خاسنین“ معاشرے کے دھتکارے ہوئے

افراد کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تم معاشرہ اور معاشرتی و تہذیبی آداب و رسوم سے کوسوں دور تھے اور نفسیاتی اعتبار سے بھی پست، کمزور اور انسانی شخصیت سے عاری افراد تھے۔

”تخافون ان يتخطفكم الناس من حولكم“

(تم اس قدر کمزور تھے کہ تم ہر وقت ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں ہر طرف سے تمہیں اچک نہ لیں)

”تخطف“ تیز رفتاری سے کسی چیز کو چھیننا۔ واضح سی بات ہے کہ طاقتور طبقے، کمزور اور ناتواں انسانوں کو نوکر اور غلام بنا کر ان سے بیگار لیتے ہیں اور اپنے مقاصد کے لئے ان سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حضرت زہراء (ع) کا یہ ارشاد اس آیہ شریفہ کی طرف اشارہ ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: ”واذکروا اذ انتم قليل مستضعفون في الارض تخافون ان يتخطفكم الناس فاواکم وایدکم بنصرہ ووزکم من الطیبات لعلکم تشکرون (۱)“ (اس وقت کو یاد کرو کہ جب تم تعداد میں کم اور زمین پر کمزور اور ناتواں تھے اور اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں تمہیں اچک نہ لیں، پس خدا نے تمہیں پناہ دی اور تمہاری مدد کی اور پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا شاید کہ تم خدا کا شکر کرو) یہاں پر آپؐ بھی اس آیہ شریفہ سے استفادہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: ”تخافون ان يتخطفكم الناس من حولكم“ (یعنی تم اس قدر ناتواں اور بے یار و مددگار تھے اور اس ڈر اور خوف میں تمہاری زندگی گزرتی تھی کہ کہیں کوئی دوسرا قبیلہ تم پر حملہ نہ کر دے اور لمحوں کے اندر تمہیں اپنا غلام نہ بنا لے)۔

پیغمبر (ص) کے ذریعے انسانیت کی نجات،

”فانقذکم اللہ تبارک وتعالیٰ بابی محمد (۲)“

(پھر خداوند تبارک و تعالیٰ نے میرے والد گرامی محمد (ص) کے ذریعے تمہیں نجات دی)

۱۔ سورۃ انفال / ۲۶۔

۲۔ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ذیل میں بھی یہی مضمون ذکر ہوا ہے ”وکنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها“۔

تم علاوہ اس کے کہ اخروی زندگی اور مستقبل کے لحاظ سے جہنم کے دہانے پر کھڑے تھے دنیوی اعتبار سے بھی بہت کمزور اور ضعیف تھے لیکن خداوند متعال نے تمہیں میرے والد بزرگوار کے ذریعے نجات دی۔ شاید آپؐ یہ فرمانا چاہتی تھیں کہ تم تو کچھ بھی نہیں تھے لیکن خدا نے میرے والد گرامی اور میرے شوہر کے طفیل سے تمہیں نجات دی اور اب تم نمک حرامی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔

”بعد اللتیا والتی وبعد ان منی ببہم الرجال“

(تمہیں یہ نجات۔ اس کے بعد ملی کہ جب پیغمبر خدا (ص) نے بہت ساری مشکلات اور ناگوار حوادث برداشت کیے اور۔ مشرکین۔ کے دلیر مگر ضدی لوگوں سے بچنے آزمائی کی)

یعنی رسول خدا (ص) نے تمہیں ان سب معاشرتی بگاڑ اور تباہ کاریوں سے نجات دی اور اس راہ میں ناگوار حوادث کا سامنا کیا اور وہ ساری زحماتیں اور رنج و غم برداشت کیے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ ان کامشرکین کے ایک ایسے ٹولے سے واسطہ پڑا کہ جن میں شجاعت و دلیری کے میدان میں کسی چیز کی کمی نہ تھی لیکن وہ استدلال اور منطق کی سوچ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔

”اللتیا والتی“ عربی کی ایک ضرب المثل ہے۔ اس کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ: اللتیا یعنی چھوٹے قد والی عورت، التی کا معنی درمیانی یا بڑی قد والی عورت۔ اس ضرب المثل کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ:- جدی نامی کا ایک شخص شادی شدہ نہ تھا، اس نے جب شادی کا ارادہ کیا تو ایک کوتاہ قد عورت سے شادی کی اور اس عورت نے اسے کافی ستایا۔ جدی نے تنگ آکر اسے طلاق دیدی، پھر اس نے ایک دراز قد عورت سے شادی کی یہ پہلی عورت سے بھی بدتر نکلی اور اس کی زندگی کو تاریک کر کے رکھ دیا اس شخص نے مجبور ہو کر اسے بھی طلاق دے دی۔ اس کے بعد اس شخص نے کچھ عرصہ اکیلے ہی زندگی گزاری اس دوران کسی نے اس سے پھر شادی کرنے کے بارے میں جب پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ: ”بعد اللتیا والتی“ یعنی اس چھوٹے قد اور لمبے قد والی عورتوں کے بعد اب میں شادی سے پشیمان ہو چکا ہوں۔ اس کے بعد سے یہ فقرہ عربی میں ایک اصطلاح اور ضرب المثل بن گیا اور گزرے ہوئے ناخوشگوار واقعات اور حوادث کے بارے میں اشارہ کرتے وقت یہ فقرہ بولا جاتا ہے۔

یہاں پر حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: ”بعد اللتیا والتی“ یعنی ان تمام سختیوں اور ناخوشگوار واقعات اور حادثات کو تحمل کرنے کے بعد، ”وبعد ان منی ببہم الرجال“ منی یعنی بے سلا ہوا، بہم بہت کی جمع اور دلیر مگر منطق و استدلال سے عاری انسانوں کو کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ: شاہی دور میں بھی شاہ ایران نے بعض اوقات اس قسم کے افراد کو بھرتی کر رکھا تھا تاکہ اس کے ذریعے وہ اپنی بعض خواہشات کی تکمیل کر سکے۔ رسول خدا (ص) کا بھی ایسے ہی افراد سے واسطہ پڑا تھا جو دلیر تو ضرور تھے مگر استدلال اور منطق کی زبان سے کوسوں دور تھے لیکن آپ (ص) نے کافی زحمات اٹھانے کے بعد ان کو راستے سے ہٹایا اور اسلام کی پیشرفت کے لئے راہ ہموار فرمائی۔

”وذؤبان العرب“

(اور اس کے بعد کہ پنمیر (ص) عرب کے درندوں سے الجھے)

پنمیر اکرم (ص) کا واسطہ عرب کے ایسے درندہ خو اور نڈر انسانوں سے تھا کہ جو بھیڑیوں کی طرح چیرنے پھاڑنے میں مہارت رکھتے تھے بھیڑے کا کام درندگی ہے کہ جو ایسے ہی بھیڑ بکریوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ انسان کی طرح تو نہیں ہے کہ ضرورت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھائے۔ اس کے سامنے جو بھی آتا ہے اسے پھاڑ دیتا تھا، یہ لوگ بھی بھیڑیے کی طرح درندہ صفت تھے اور منطق و استدلال سے کوسوں دور تھے ان کا کام صرف قتل اور غارتگری کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

”ومردۃ اہل الکتاب“

(اس کے بعد۔ اہل کتاب کے سرکش عناصر سے آپ (ص) کا واسطہ پڑا)

اس وقت۔ اہل کتاب بالعموم اور خاص کر عیسائی حضرات جنگ و جدال سے دور رہتے تھے لیکن رسول خدا (ص) کا واسطہ اہل کتاب کے چند ایسے سرکش عناصر سے پڑا جو اپنی تورات اور انجیل کے فرامین سے بھی سرکشی کرتے تھے جیسا کہ مدینے کے یہودی کہ جو پنمیر (ص) کے خلاف بہت ساری جنگوں کا باعث بنے اور یہ لوگ کفار و مشرکین کے یار و مددگار اور ان کے ساتھ ہم پیمان ہو گئے تھے۔

اسلام کی ترویج میں حضرت علی (ع) کا کردار،

”کلما او قدوا ناراً للحرب اطفاءها الله“

(جب بھی کفار، جنگ کی آتش افروزی کرتے تو خدا اس کو بجھا دیتا تھا)

پیغمبر اکرم (ص) ہرگز جنگ نہیں چاہتے تھے، کفار اور اسلام دشمنوں کے خلاف آپ (ص) کی اکثر جنگیں، دفاعی حیثیت رکھتی تھیں اور یہ جنگیں دشمنوں کی سازش کے توڑ میں لڑی گئیں۔ اس حملے سے یہ مفہوم بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جنگ کی آگ کو ہمیشہ اسلام دشمن طاقتیں بھڑکاتی تھیں لیکن خدا اے مومن، جاں نثار اور صابر انسانوں کے ذریعے بجھا دیتا تھا اور ان کے شر سے مومنین کو محفوظ رکھتا تھا۔

”او نجم قرن الشيطان“

(یا جب بھی شیطان کے سینگ، تابعدار لوگ، نمودار ہوتے تھے)

”نجم“ یعنی ظاہر ہوا، نمودار ہوا، جب شیطان کے سینگ ظاہر ہوتے تھے کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی اسلام کے دشمنوں کی طرف سے کوئی سازش تیار کی جاتی تھی، شیطان کے سینگ اس کی طاقت اور نفوذ کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ شیطان کی قوت اور نفوذ کے منظر ایسے لوگ ہیں جو شیطان کے جھوٹے وعدوں کے فریفتہ ہو کر اس کی پیروی کرتے ہیں۔

”او فغرت فاغرۃ من المشرکین“

(یا مشرکین میں سے کوئی منہ کھولنے والا، درندہ صفت، منہ کھول لیتا تھا)

”فغر“ یعنی منہ کھولا، یہاں پر مشرکین کو درندوں سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ حملے کے وقت درندے اپنا منہ کھولتے ہیں۔ یہاں پر اس فقرہ کا مقصد یہ ہے کہ مشرکین کے، درندہ صفت، گروہ، مسلمانوں کے خلاف جب بھی کوئی بلوہ کرنا چاہتے تھے اور مسلمانوں پر درندوں کی طرح حملہ آور ہوتے تھے تو:

”قذف اخلافہا فی لہواتہا“

(پیغمبر اکرم (ص) اپنے بھائی، علی (ع) کو ان کے حلقوم میں دھکیل دیتے تھے)

۔ اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو پیش آنے والے خطوں میں علی (ع) ہی کو د پڑتے تھے اور اسلام کو اس خطرے سے نجات دیتے تھے۔ جب عمرو بن عبدود - میدان میں - میں آتا ہے اور رجز خوانی کرتا ہے تو کوئی جرات نہیں کرتا کہ اس سے مقابلہ کرے۔ پہلا دوسرا اور بہت سارے لوگ جو بعد میں دعویدار بنے سب پیچھے ہٹ گئے، ایسے مواقع میں پر پیغمبر (ص) حضرت علی (ع) ہی کو دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے کہتے تھے تاکہ علی (ع) آگے بڑھ کر مشرکین کا خاتمہ کر دیں۔

حضرت زہراء (ع) یہاں یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ حضرت علی (ع) کی فداکاری، جاں نثاری اور کوششوں کا نتیجہ ہی تھا کہ اسلام کامیاب اور فتح مند ہوا۔ اسی لئے آپؐ فرماتی ہیں کہ اگر شیطان کا کوئی ٹولہ میدان میں آجاتا یا مشرکین، اژدھے کی مانند منہ کھولے مسلمانوں کی طرف بڑھتے یا کوئی اور سازش ہوتی تو ”قذف اخاہ فی لہواتھا“ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے علی (ع) ہی کو پیغمبر (ص) آگے بڑھاتے تھے۔ اگر علی (ع) نہ ہوتے تو۔ کون تھا جو ابوسفیان کا ناک دم کرتا؟ عمرو بن عبدود کی رجز خوانی کا جواب دیتا؟ اور ہجرت کی رات دشمنوں کی سازش کو کون ناکام بناتا؟ ان تمام موارد میں صرف علی (ع) ہی تھے کہ جو رضا کارانہ طور پر خطروں کو مول لیتے۔ اور جان کی بازی لگا کر اسلام کی پاسبانی کرتے تھے۔ سازشوں اور جنگوں کے ذریعے اسلام کی نابودی کے خواب دیکھنے والوں کو نابود کر دیتے تھے۔

”لہوات“ لہات کی جمع ہے جو حلقوم کے آخری حصے کو کہا جاتا ہے۔ سازش اور جنگ بھی انسان کو لقمہ ترکی طرح منگل کر ہضم کر دیتی ہے۔ اسی لئے اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں اور جنگوں کو لہوات سے تعبیر کیا گیا ہے اور امیر المؤمنین (ع) نے اس حلقوم کو اپنے ہاتھوں سے اس طرح بند کیا کہ وہ دم گھٹ کر مر گئے۔

مختلف جنگی محاذوں میں حضرت علی علیہ السلام کی دلیری اور شجاعت کے نمونے،
 ”فلا ینکفیٰ حتی یطاء صماخہا (۱) باخمصہ“

۱۔ بعض نسخوں میں ”صماخہا“ کے بجائے ”جناحہا“ ذکر ہوا ہے تو اس صورت میں جملے کا معنی یہ ہوگا کہ (جب تک ان کے پروں کو ==

(ان کے کانوں۔ سروں۔ کور گڑے بغیر علی (ع) واپس نہیں پلٹتے تھے)

اس وقت میدان جنگ میں جب کوئی شخص اپنے مد مقابل کو پچھاڑ دیتا تھا تو فاتح اپنے پاؤں کو مغلوب کے سر پر رکھ دیتا تھا اور اسے روند دیتا تھا۔ پاؤں سے کانوں کو روندنا، کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ جب تک میدان جنگ فتح نہ کرتے علی (ع) میدان جنگ سے واپس تشریف نہ لاتے تھے اور ایسا نہ تھا کہ آپ جنگ سے فرار کریں یا ذمہ داری کو ادھورا چھوڑ کر بھاگ نکلیں (۱)۔

”صماخ“ یعنی کان کی نالی، ”اخص“ ہتھیلی یا پاؤں کے نچلے حصے کو کہتے ہیں۔ اس حملے کا مفہوم یہ ہے کہ امیر المؤمنین (ع) اسلام دشمنوں کے سروں کو روند دیتے تھے۔

”ویخمد لبہا بسیفہ“

(ان کے شعلوں کو اپنی تلوار سے بجھا دیتے تھے)

حضرت علی (ع) کی شجاعت اور استقامت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک دشمن پر مکمل فتح نہ پاتے اور اسے شکست نہ دیتے شجاعت سے لڑتے رہتے تھے اور اس راہ میں آپ کے دل میں کسی قسم کا ضعف اور تردد نہیں پایا جاتا تھا اور نہ ہی اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر واپس آتے تھے۔

امیر المؤمنین علیہ السلام کی چند خصوصیات،

(۱) ”مکدوداً فی ذات اللہ، مجتہداً فی امر اللہ“

(اس حال میں کہ حضرت علی (ع) خدا کی راہ میں شدید ترین سختی برداشت کر رہے تھے)

اور خدا کے احکام پر سختی سے کار بند تھے)

”مکدود“ لفظ ”کذ“ کا اسم مفعول ہے اور اس سے مراد وہ شخص ہے جس پر شدید سختی اور دباؤ ہو۔

== اپنے پاؤں سے روندتے آپ واپس نہ آتے تھے (۱) پر قدرت، طاقت اور شل و شوکت کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مد تابیخ جاتی ہے کہ آپ کو ہمیشہ آگے سے زخم لگے ہیں اور پشت سے زخم نہیں لگے کیونکہ آپ کرار غیر فرار تھے اور کبھی دشمن کو پیٹھ نہیں دکھاتے تھے۔

ذات اور امر خدا سے، احکام خداوندی اور ہر وہ چیز مراد ہے جس کا تعلق خدا سے ہو۔ ان دو جملوں کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی (ع) خدا کے دین اور احکام نیز خدا سے نسبت رکھنے والی چیزوں کے بارے میں سخت کوشش اور حساس تھے اس سلسلے میں کسی قسم کی سستی اور لاابالی گری اور سودا بازی سے نہ صرف نفرت کرتے تھے بلکہ راہ خدا اور خدا کی خاطر آپؐ شدید ترین سختیوں کے دباؤ کا شکار تھے لیکن آپؐ شجاعت سے دین خدا کی حمایت اور نگہبانی فرماتے تھے (۱)۔

(۲) ”قرباً من رسول اللہ، سیداً فی اولیاء اللہ“

(آپ (ع) رسول خدا (ص) کے مقرب اور خدا کے ولیوں کے سردار تھے)

ظاہری رشتہ داری اور روحانی و معنوی دونوں کے لحاظ سے آپؐ پیغمبر خدا (ص) کے مقرب اور نزدیک ترین فرد تھے۔ خدا کے برگزیدہ بندوں میں بھی آپؐ کا مقام واضح تھا اور آپؐ ان کے سید و سردار تھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ ہر لحاظ سے دوسروں سے برتر مقام رکھتے تھے۔

حقیقت میں حضرت فاطمہ (ع) اپنی ان باتوں کے ذریعے۔ اور وہ بھی ایسے مخصوص حالات میں۔ حاکمیت کے غصب کرنے پر اعتراض کرنا چاہتی تھیں جو کہ حضرت فاطمہؑ کی شجاعت اور شہامت پر ایک مستحکم دلیل ہے کہ آپؐ نے انتہائی بے باکی اور شجاعت نیز ٹھوس دلائل کے ذریعے حکمرانوں کے مقابلے میں ولایت و امامت حقہ کا دفاع فرمایا۔

(۳) ”مشمراً ناصحاً، مجدداً کادحاً“

(حضرت علیؑ - خدمت خلق کے لئے تیار اور لوگوں کے خیر خواہ تھے۔)

جدیت اور محنت کے ساتھ فعالیت میں مشغول تھے)

یعنی امیر المؤمنین (ع) اپنے ذاتی مفاد کی خاطر سوچنے کے بجائے معاشرے کے خیر خواہ اور اس کے

۱۔ مکدود، مغلوب کو بھی کہا جاتا ہے۔ اس معنی کی رو سے آپؐ کی مراد یہ ہو سکتی ہے کہ خلافت کے مسئلے میں تم نے غلبہ پایا اور علیؑ مغلوب ہو گئے لیکن اس کے باوجود بھی علیؑ نے دین خدا کے باقی عقائد اور احکام کو تمہاری انحرافی طوفانی موجوں سے محفوظ رکھنا چاہا اور ان کٹھن مشکلات کے دباؤ کے باوجود تحفظ دین کے لئے جدوجہد کی۔

کام آنے والے انسان تھے۔ آپؐ گفتار کے غازی نہیں بلکہ کردار کے غازی تھے اور ہمیشہ نیک اعمال کی بجا آوری میں مشغول رہتے تھے۔

(۴) ”ولا تاخذہ لومة لائم“

(خدا کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے وہ متاثر نہیں ہوتے تھے)

یعنی لوگوں کی سرزنش اور پروپیگنڈہ کے خوف سے حق کے دفاع سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے اور بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور حوادث سے متاثر ہونے کے بجائے صرف خدا کی خوشنودی کو اپنے مد نظر رکھتے تھے۔ ان کا مطمح نظر اور ہدف صرف خدا کی رضا و خوشنودی تھی اور بس۔

کل کے گوشہ نشین، آج کے مفاد پرست،

”وانتم فی رفاهیۃ من العیش“

(- علی (ع) قربانی دے رہے تھے۔ اور آپؐ زندگی کی لذتوں اور عیش و عشرت میں مصروف تھے)

اس وقت جب امیر المؤمنین (ع) اسلام کی خاطر زحمات برداشت کر رہے تھے، دوست و دشمن اپنی زبانوں سے ان پر زخم لگاتے تھے ان کے دل پر پھریاں چل رہی تھیں اور اسلام کی راہ میں تکلیفیں اٹھا رہے تھے، لیکن اس کے باوجود کبھی بھی پیچھے ہٹنے کا نام تک نہ لیا اور پیغمبر (ص) کو تنہا اور اکیلا نہ چھوڑا۔ اسلام کی دعوت، حضرت علیؑ کی کوششوں کے نتیجے میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس وقت تمہاری حالت یہ تھی کہ حوادث و مشکلات سے اپنے کو دور رکھتے تھے۔ سربکف مجاہدین کا۔ مذاق اڑاتے تھے اور اپنی خورد و نوش کی فکر میں سرگردان رہتے تھے۔ رحلت پیغمبر (ص) کے فوراً بعد۔ تم نے مفاد پرستانہ چال چلی اور علی (ع) کو خانہ نشین کر کے، خلیفہ معین کرنے میں مشغول ہو گئے!!

سوال :- پہلے آپؐ نے فرمایا کہ تم بد بخت، بے چارہ، کمزور اور دوسرے لوگوں کی تاخت و تاز کا مقام بنے ہوئے تھے اور یہاں پر آپؐ فرماتی ہیں کہ تم عیش و عشرت اور آرام و آسائش کی زندگی گزار رہے تھے تو ممکن کوئی رہے کہ کوئی سوال کرے کہ حضرتؑ کی ان دو باتوں میں تضاد ہے ان دونوں کو

کس طرح جمع کیا جاسکتا ہے؟

جواب :- یہاں کئی احتمال دیئے جاسکتے ہیں:

۱۔ مشرکین سب کے سب توفیق غریب اور مفلوک الحال نہیں تھے بلکہ ابو جہل، ابوسفیان اور بہت سارے دوسرے مشرکین اشرافیہ زندگی گزار رہے تھے البتہ عام لوگوں کی اکثریت معاشی بد حالی اور فقر و فاقہ کا شکار تھی۔

۲۔ شاید آپ کا مقصد یہ ہو کہ اگرچہ تم ایک تنگین اور ذلت آور زندگی گزار رہے تھے لیکن اسی وقت تم عیاشی اور رفاہ کے بھی دلدادہ تھے اور اسلام کی فتح و کامیابی کی خاطر راحت سکون چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔

۳۔ زمانہ جاہلیت میں تم فقیر و غریب تھے اور ذلت آمیز زندگی گزار رہے تھے جب اسلام آیا اور تمہیں اس پست اور تنگین زندگی سے نجات دی تو اب تم اسلام کے محافظ بننے اور سختیوں اور مشکلات کے وقت اسلام اور پیغمبر اسلام (ص) کا دفاع کرنے کے بجائے اپنے ذاتی مفادات کی فکر میں ہو اور مسلمانوں کے ارد گرد گزرنے والے واقعات اور حادثات کے بارے میں بے توجہی اور بے پروائی کی پالیسی پر عمل پیرا ہو۔

خلاصہ یہ کہ آپ لوگ مسلمان ہونے سے قبل پست، بے چارے اور کمزور تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد تمہاری زندگی کا گراف بہتر ہوا ہے لیکن تم نے اسلام کی خدمت اور اس راہ میں جان نثاری پر عیش و عشرت کو ترجیح دی ہے اور اس کے دلدادہ ہو گئے ہو۔

اس تیسرے احتمال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت فاطمہؑ نے مسلمانوں کو زمانہ جاہلیت کی تنگین اور ذلت آمیز زندگی کی یاد دہانی کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ: ”فانقذکم اللہ تبارک و تعالیٰ بابی محمد“ یعنی اس ذلیل و رسوا زندگی سے خدا نے تمہیں میرے والد گرامی حضرت محمد (ص) کے ذریعے نجات بخشی۔ اس کے بعد آپؐ فرماتی ہیں کہ: ”وانتم فی رفاہیۃ من العیش“ یعنی تم زندگی کی لذتوں اور آرام و آسائش میں ڈوبے ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ تم اسلام کی خاطر کسی قسم کی

قربانی دینے اور رنج و مشقت تحمل کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس طرح آپؐ یہ ارشاد فرماتی ہیں کہ طاقتور ہونے سے قبل تم بد بختی اور بے چارگی کے عالم میں پڑے ہوئے تھے لیکن جب تمہیں طاقت اور قوت عطا ہوئی تو اسلام اور اس کے مقاصد کی خاطر قربانی دینے کے بجائے آرام و سکون اور تعیش کو تم نے اپنا کعبہ مقصود بنا لیا ہے۔

مفاد پرستوں کی خصوصیات:

(۱) ”وادعون، فاکھون، آمنون“

(۔ جنگ و جہاد کی سختیوں سے خود کو دور رکھ کر تم۔)

خاموش، مطمئن اور خوشحال و عیاش۔ ہونے کے علاوہ۔ سکون اور امن کی زندگی گزار رہے تھے (ایک مؤمن اور فرض شناس انسان، اپنے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، بلکہ اس پر لازم ہے کہ ان امور کے بارے میں اپنی ذمہ داری کا احساس کرے اور اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھے اگر وہ کوئی مثبت کردار ادا نہیں کر سکتا تو کم از کم ان امور کے بارے میں بے توجہی سے کام نہ لے، جہاں تک اس کے لئے ممکن ہو فعال رہے اور مسلمانوں کے رنج و غم میں خود کو شریک سمجھے۔ ایسا ہرگز نہ ہو کہ ہم دوسرے مسلمانوں کے دکھ و درد سے لاتعلق رہیں اور اپنی اور اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کی فکر میں شب و روز گزار دیں اور۔ فارسی کی۔ اس ضرب المثل کا مصداق نہ بنیں کہ: ”سری کہ درد نمی کند چرا دستمال ببندیم“ (یعنی جس سر میں درد نہ ہو اس پر رومال کیوں باندھیں)؛ انسان کی انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے جیسے انسانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کے مقابلے میں خاموش نہ رہے اور شاعر۔ سعدی۔ کے بقول کہ:

بنی آدم اعضای یکدیگرند کہ در آفرینش ز یک گوهرند

(بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء و جوارح ہیں، کیونکہ سب کی خلقت ایک ہی گوہر سے ہوئی ہے)

چو عضوی بدرد آورد روزگار دیگر عضو ہارا نماند قرار

(اگر حوادث زمانہ کسی عضو کو درد میں مبتلا کر دیں، تو دوسرے اعضاء تڑپ اٹھتے ہیں)۔

اس انسانی رابطے سے بالاتر، ہم سب مسلمان ہیں اور قرآن و اہل بیت اطہار علیہم السلام کے پیروکار۔ لہذا ہماری ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ روایات میں آیا ہے کہ: ”کلکم داع و کلکم مسئول عن رعیتہ“ یعنی۔ جس طرح چرواہا اپنے ریوڑ کا ذمہ دار ہے۔ اسی طرح تم بھی ایک دوسرے کے ذمہ دار ہو۔

حضرت زہراء (ع) ان لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: ”جب علی (ع) راہ خدا و اسلام میں فداکاری کر رہے تھے اور قربانیاں دے رہے تھے اور اپنی ہستی کو اخلاص کے ساتھ اسلام پر قربان کر رہے تھے تو اس وقت تم اپنے سکون اور آسائش کی فکر میں سرگردان تھے، حق کی حمایت کے بجائے خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے۔ راہ خدا میں۔ زحمات برداشت کرنے کے بجائے امن و امان کے ساتھ عیاشی میں مشغول تھے لیکن جب۔ علی (ع) کی کوششوں، قربانیوں اور آپ کی جاں نثاری کے نتیجے میں اقتدار اور حکومت کا۔ دسترخوان بچھ چکا تو تم آگے بڑھے اور علی (ع) کو خانہ نشینی پر مجبور کر دیا۔

(۲) ”تتر بصون بنا الدوائر“

(تم اس انتظار میں تھے کہ ہمیں۔ اہل بیت پیغمبر (ص) کو۔ مصیبتیں اور آفتیں گھیر لیں)

تم میں سے بعض جو بظاہر مسلمان ہوئے تھے اور منافقانہ کردار ادا کر رہے تھے اور جو دور سے (مختلف) حادثات کا تماشا دیکھ رہے تھے اس بات کے منتظر تھے کہ ان جنگوں اور مقابلوں میں ہم مصیبتوں اور آفتوں کا شکار ہو جائیں۔ اور مثال کے طور پر، جنگ میں علی (ع) شکست کھائیں۔

”دوائر“ دائرہ کی جمع ہے۔ مصیبت اور سختی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مفاد پرست عناصر، ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مومن اور فداکار افراد کو شکست ہو کیونکہ یہ لوگ حق کی فتح سے ہمیشہ حائف رہتے ہیں۔

(۳) ”و تتو کفون الاخبار“

(اور تم۔ دور سے جنگ و جہاد کی۔ خبریں سننے کے منتظر رہتے تھے)

توقف یعنی توقع اور انتظار۔ جب کوئی انسان جنگ اور جہاد میں سرگرم عمل ہو تو عافیت طلب اور بے درد لوگ صرف خبر سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: تم میں سے بعض جو۔ اسلام سے کوئی۔ دلچسپی نہیں رکھتے تھے میدان جنگ سے باہر صرف اس انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ۔ جنگ کے متعلق۔ خبریں سنیں۔ یہ لوگ جنگ کے میدان میں قدم رکھنے سے اجتناب کرتے تھے۔

(۴) "وتنكصون عند النزال"

(اور بحرانی حالات میں تم پیچھے ہٹ جاتے تھے)

"نزال اس زمانے میں جب ایک دوسرے سے رو برد لڑائی کے لئے تیزی سے گھوڑے سے اترتے تھے تو اس حالت کو نزال کہا جاتا ہے البتہ اصطلاحاً بحرانی حالات کو نزال کہا جاتا ہے۔" تنكصون کے معنی ہیں رک جانا اور عقب نشینی کرنا۔ آپؐ یہ فرماتی ہیں کہ: جب جنگ اپنے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو جاتی تھی تو تم معرکہ کارزار میں داخل ہونے کے بجائے رک جاتے تھے اور پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ عافیت طلب افراد ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ عام حالات میں بڑا ہا ہو اور شور و غل مچاتے ہیں لیکن بحرانی اور حساس لمحات میں یا تو خاموش رہتے ہیں یا میدان سے بھاگ نکلتے ہیں یا پھر کبھی کبھار دشمن کے ساتھ مل کر اس کے مددگار بن جاتے ہیں۔

(۵) "وتفرون من القتال"

(اور تم میدان جنگ سے فرار کرتے تھے)

خلاصہ یہ کہ: پہلے تم اسلام اور اس کی ترویج کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے لیکن آج جب حالات پر تمہارا کنٹرول ہے، پیغمبر (ص) کے حکم کو ٹھکرا کر اپنے لئے خلیفہ بنا رہے ہو اور علی (ع) کو۔ اپنے خدا داد منصب۔ سے علیحدہ کر رہے ہو، ایسے افراد کو اصطلاح میں "Opportunist" یعنی مفاد پرست کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسے افراد جو اپنے اہداف کی تکمیل کے لئے مناسب موقع اور فرصت کی تلاش میں رہتے ہیں اور ہوا کے رخ کو دیکھ کر چلتے ہیں اور اس گروہ کی حمایت کرتے ہیں جو کامیابی حاصل کر لے۔ ایسے افراد بحرانی اور حساس حالات میں اسلام اور حق۔ بلکہ اپنی قوم و ملت۔ کا دفاع کرنے سے

گریز کرتے ہیں۔

رحلت پیغمبر (ص) اور اس کے اثرات،

”فلما اختار الله لنبيه دار انبيائه وماوى اصفياه“

(پس جب وہ وقت آیا کہ خداوند عالم نے اپنے حبیب کے لئے اپنے نبیوں اور برگزیدہ بندوں کی منزل

اور آرامگاہ کا انتخاب فرمایا۔ یعنی آپ (ص) اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔)

(۱) ”ظہر فيكم حسكة النفاق“

(تو تمہارے درمیان منافقت کے کانٹے نمودار ہو گئے)

یعنی پیغمبر خدا (ص) کی رحلت کے بعد باہم متحد ہونے اور ان کی وصیتوں پر عمل کرنے کے بجائے تم منافقت اور دوروئی کا شکار ہو گئے۔

”حسکہ“ یعنی کانٹے اور تیغ۔ یہاں پر آپ کی کلام میں یہ لفظ استعارہ (۱) کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس حملے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حق و حقیقت کے متوالوں کے جسموں میں تیغ چبھتی ہے اسی طرح تمہارے اندر منافقت کا کانٹا ظاہر ہوا ہے۔

(۲) ”وسمل جلباب الدين“

(تمہارے دین اور تمہاری معنویت کا لباس پرانا اور بوسیدہ ہو چکا ہے)

”سمل“ پرانا اور بوسیدہ کپڑا یا لباس۔ ”جلباب“ عبا یا بڑی چادر اور رداء کی طرح ہے کہ جو انسان کو ڈھانپ سکے یعنی لباس۔ یہاں ”جلباب الدین“ یعنی دین کا لباس۔ یہ فرما کر آپ نے دین کو لباس اس لئے قرار دیا ہے کہ جس طرح لباس انسان کے جسم کو مکمل ڈھانپ لیتا ہے اسی طرح دین بھی انسان کی انفرادی اور اجتماع زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: پیغمبر اکرم (ص) کی وفات سے قبل معاشرے پر دین کی مکمل

۱۔ استعارہ ایک قسم کی مجاز گوئی ہے مثل کے طور پر شجاعت کی صفت کے پیش نظر کسی دلیر اور نڈر شخص کو شیر کہا جائے۔

حکمرانی تھی اور معاشرے کے تمام امور اور روابط و ضوابط دینی اصولوں کی بنیاد پر طے ہوتے تھے، لیکن پیغمبر خدا (س) کے انتقال کے فوراً بعد۔ تم نے دین کی حاکمیت کے بجائے جالی رسومات کو ترجیح دی ہے اور ان کو معاشرے میں رائج کیا ہے اس طرح۔ دین ایک پرانا بوسیدہ لباس بن کر اپنی حیثیت کھو بیٹھا ہے۔

(۳) ”ونطق کاظم الغاوین“

(اور وہ گمراہ مگر خاموش لوگ۔ جو کل تک اسلام کی تقدیر سے لاتعلق رہتے تھے اچانک۔ بول اٹھے ہیں)

پیغمبر اسلام (س) کی رحلت کے بعد ایسے گمراہ عناصر نے فرصت سے استفادہ کیا اور آگے بڑھے سیاست وقت نے ان کو صاحب سخن بنادیا جو کل تک خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے اور فرصت کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے اب یہی لوگ ملت کی قسمت کے مالک بن گئے ہیں! جب ابوسفیان کہ جس کی اسلام کے ساتھ دشمنی آشکار تھی، مسلمانوں کی تقدیر کا مالک بن جاتا ہے تو دوسروں کا کیا حال ہوگا؟ حالانکہ ان کے مقابلے میں علی (ع)، سلمان اور ابوذر جیسے افراد جنہوں نے اسلام کی خاطر سب سے زیادہ تکالیف اٹھائی تھیں، معاشرے سے الگ کر کے خانہ نشین ہونے پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں!! (۱)۔

(۴) ”ونبع خامل الاقلین“

(پست اور گنہگار لوگ۔ بلوں سے ٹکل آئے۔ اور میدان میں آگئے)

ہر تحریک اور انقلاب کے دوران پست اور بزدل افراد خود کو کسی گوشہ میں چھپا لیتے ہیں اور فرصت کے منتظر رہتے ہیں، حق و عدالت کے خلاف ہمیشہ سے یہی لوگ زیادہ سے زیادہ وار کرتے آئے ہیں۔

۱۔ بات یہاں تک جا پہنچی کہ علیؑ جیسی ملکوتی شخصیت کی اس قدر کردار کشی کی جاتی ہے کہ جب شام میں یہ خبر پہنچی کہ آپؑ مسجد میں شہادت پاگئے تو لوگ تعجب سے پوچھتے ہیں کہ کیا علیؑ بھی نماز پڑھتے تھے؟ ابوذر جیسی شخصیت کو اسلامی ریاست کے خلاف آشوب برپا کرنے کی ہمت میں ربذہ میں شہر بدر کیا جاتا ہے اور وہ وہیں پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں! حضرت علیؑ کے گھر پر کہ جو نزول وحی کا مرکز تھا حملہ کر دیا جاتا ہے! پیغمبرؑ کی اکلوتی بیٹی کی اہانت اور انہیں اذیت دی جاتی ہے البتہ تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اسلام اور خلافت رسولؑ کے نام پر یہ ساری شرمناک کاروائیاں انجام پا رہی تھیں!!!

حضرت زہراء (ع) یہاں پر ایک چھوٹے سے حملے میں اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ فرماتی ہیں کہ رسول خدا (س) کی وفات کے بعد انہی لوگوں نے فرصت کو غنیمت جانا اور میدان میں آگئے۔

(۵) ”وہدر فنیق المبتلین“

(باطل گروہ۔ کفار و مشرکین۔ کے بہادر اور دلیر افراد بھی گرجنے لگے)

”فنیق“ بہادر اور شجاع لوگ، ”ہدر“ گرجتے ہوئے بات کرنا۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبر اکرم (س) کی زندگی میں باطل اور اہل باطل دب چکے تھے اور ان کے بہادر اور دلیر افراد کو بھی اسلامی معاشرے کے بارے میں لب کشائی کی جرات تک نہ تھی لیکن۔ آپ (س) کی رحلت کے بعد۔ اب وہ جسارت پر اتر آئے ہیں اور وہ اہل حق کے خلاف گستاخ ہو گئے ہیں۔

”فخطر فی عرصاتکم“

(پس۔ اب یہ لوگ۔ تمہارے درمیان اپنی دموں کو ہمارے ہیں۔ یعنی مقام و منصب کے مالک بن گئے ہیں۔) ابوسفیان وغیرہ اور خلیفہ اول و دوم کے کارندے جنہیں مسلمان ذرا بھر بھی اہمیت نہیں دیتے تھے اب آکر تمہارے درمیان مقام و منصب کے مالک بن چکے ہیں اور تمہاری زندگی کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔

”واطلع الشیطان راسه من مغرزه“

(اور شیطان نے اپنی پناہ گاہ سے سر اٹھایا)

”مغرز“ پناہ گاہ اور چھپنے کی جگہ کو کہا جاتا ہے، یہاں شیطان کو اس جنگی خاردار جانور سے تشبیہ دی گئی ہے جو خطرے کے وقت کچھوے کی طرح اپنے خول میں چھپ جاتا ہے اور خطرہ ٹل جانے کے بعد اس سے سر باہر نکال لیتا ہے۔

شیطان بھی پیغمبر اسلام (س) کی زندگی میں اپنے خول میں پھنسا رہتا تھا اور ظاہر ہونے کی جرات نہیں کرتا تھا، لیکن ابھی وہ اپنی پناہ گاہ سے نکل کر تمہیں۔ حق کی مخالفت پر۔ اکسارہا ہے۔

”هاتفأ بکم“

(شیطان اپنی پناہگاہ سے نکل کر تمہیں دعوت دے رہا ہے)

ابھی شیطان نے حالات کو جب اپنے لئے مناسب سمجھا ہے تو اپنی پناہگاہ سے نکل آیا ہے اور تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ آؤ تاکہ خلیفہ بنائیں (۱)۔ یہاں پر حضرت زہراء (ع) نے سقیفہ والوں کی جلد بازی میں ہونے والی کارروائی کو شیطانی عمل قرار دیا ہے۔

گھات میں بیٹھے ہوئے شیطان صفت لوگ،

”فالفاکم لدعوتہ مستجبین“

(پس شیطان نے تمہیں اپنی دعوت پر لبیک کہنے والوں میں سے پایا)

شیطان نے دیکھا کہ تم اس سے ہم آہنگ ہو اور اس نے اسلام کو امامت سے الگ کر کے انحراف سے دوچار کرنے کے اپنے شیطانی منصوبے پر عمل کرنے کے لئے تمہیں آمادہ پایا۔ اور تم نے اس کی سازش کو عملی جامہ پہنایا۔ اس طرح حقیقت میں سقیفہ میں جو کچھ ہوا وہ شیطان کی دعوت اور اس کے منصوبے پر عمل درآمد کے سلسلے میں ایک مثبت جواب تھا۔

”وللغزۃ۔ للغزۃ۔ فیہ ملاحظین“

(اور تم حصول عزت۔ یا دھوکہ کھانے۔ کی خاطر، شیطان کی طرف دیکھ رہے تھے)

یہ عبارت دو طرح سے نقل ہوئی ہے: ایک ”للغزۃ“ اور دوسری ”للغزۃ“ اب اگر پہلی عبارت صحیح ہو تو معنی یہ ہوگا کہ تمہیں شیطان نے دھوکہ دیا ہے اور آپ اس پر امیدیں لگائے بیٹھے تھے اور آپ نے اسے مثبت جواب دیا ہے، لیکن اگر دوسری عبارت یعنی ”للغزۃ“ درست ہو تو معنی یہ ہوگا کہ تم معاشرے میں عزت و احترام کے خواہاں تھے مثلاً: کوئی خلیفہ کوئی وزیر۔ کوئی والی دگورز بننا چاہتے تھے تاکہ اس طرح عزت و شوکت حاصل کریں، تم شیطان کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اور تم نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔

۱۔ روایت میں بھی ہے کہ جس نے سب سے پہلے ابو بکر کی بیعت کی وہ شیطان تھا کہ جو ایک بوڑھے شخص کی شکل میں آیا تھا۔۔۔

بے وقوف تابعدار

”ثم استنہضکم، فوجدکم خفافاً“

(پھر شیطان نے تم سے چاہا کہ قیام کریں پس اس نے دیکھا کہ تم گھٹیا انسان ہو)

معمولاً ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ دوسروں کو اپنا مرید اور بے چون و چرا فرمانبردار بنانا چاہتے ہیں تو پہلے ان کو کھوکھلا کر دیتے ہیں، ان کی شخصیت اور تشخص کو چھین لیتے ہیں ان لوگوں کو غور و فکر اور تعقل و تفکر کی قدرت سے محروم کر دیتے ہیں پھر ان کو اپنا مرید اور بے چون و چرا تابعدار اور پیرو کار بنا لیتے ہیں۔ لہذا حضرت فاطمہ زہراءؑ بھی فرماتی ہیں کہ شیطان نے تم سے یہ چاہا کہ تم اٹھو اور اس کی اطاعت کرو تو اس نے یہ دیکھا کہ تم میں کوئی استقلال نہیں، خودی اور انسانی شخصیت سے عاری، چند گھٹیا آدمی ہیں اور ہر بلانے والے کے ساتھ چل پڑتے ہیں۔ قرآن میں بھی فرعون کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ”فاستخف قومہ فاطاعوہ“ (فرعون نے اپنی قوم کو گھٹیا اور کھوکھلا بنایا جس کے نتیجے میں انہوں نے فرعون کی اطاعت کی) جب تک انسان سے اس کی خودی سلب کر کے اس گھٹیا نہ بنایا جائے اس وقت تک شیاطین انس و جن ان پر تسلط نہیں جاسکتے اور ان کی اندھی تقلید نہیں ہو سکتی۔

”واحمشکم فالفاکم غضاباً“

(اور شیطان نے جب تمہیں درغلایا۔ غضبناک کیا۔ تو تمہیں غضبناک پایا)

”احمشکم“ تمہیں غضبناک کیا، تمہارے غصے کو بھڑکایا، ”حمش“ اس حرکت یا بات کو کہا جاتا ہے جو کسی کو غضبناک یا شد مزاج بنادے، جیسا کہ جنگوں میں پڑھی جانے والی بعض رجز خوانیاں جو لوگوں کو اس قدر غضبناک کر دیتی تھیں کہ وہ آپے سے باہر ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ”فالفاکم غضاباً“ شیطان نے دیکھا کہ تم اس کی پسند کے شد مزاج غضبناک اور عداوت رکھنے والے لوگ ہو اور علی (ع) کے بارے میں دلوں میں عداوت، دشمنی اور حسد رکھتے ہو اور اس وقت انتقام لینے کے درپے اور تیار ہو۔

”فوسمتم غیر ابلکم“

(اس طرح تم دوسروں کے اونٹوں پر علامت لگانے میں مشغول ہو گئے)

پرانے زمانوں میں لوگ اس لئے کہ ان کے اپنے اونٹ پہچانے جاسکیں ان پر داغ کے ذریعے مخصوص علامتیں لگاتے تھے۔

حضرت زہراء (ع) ان سے فرماتی ہیں کہ اب جب کہ تمہارے ہاتھوں میں اقتدار آیا ہے تو تم نے دوسروں کے اونٹوں پر بھی علامتیں لگانا شروع کر دی ہیں اور ان کو اپنا اونٹ بنا کر ان میں تصرف کرنے لگے گئے ہو (۱) آپ کی یہ بات کنایہ ہے اس بات سے کہ تم اپنی حد سے تجاوز کر کے دوسروں کے حریم میں داخل ہو گئے ہو۔

”ووردتم غیر مشربکم“

(دوسروں کے پانی پینے کے مقام میں داخل ہو گئے ہو)

گزشتہ زمانوں میں جب شہروں میں پینے کے صاف پانی کے لئے پائپ لائن وغیرہ کا بندوبست نہیں ہوتا تھا تو لوگ پانی کے حصول کے لئے چشموں اور ندیوں سے استفادہ کرتے تھے اور ہر قوم یا گروہ کے لئے پانی لینے کی جگہ مخصوص تھی اور انہیں اسی مخصوص جگہ سے پانی لینا پڑتا تھا، لیکن طاقتور اور ڈکٹیٹر قسم کے افراد دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرتے تھے اور دوسروں کے چشموں پر بھی ناجائز قبضہ جاتے تھے۔

یہاں حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ: تم لوگ دوسروں کے چشموں میں داخل ہو گئے ہو۔ یہ کنایہ ہے اس واقعیت کی طرف کہ: تم نے اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے اور امامت و ولایت کو اپنے تجاوز کا ہدف بنایا ہے، کیونکہ امامت اور پیغمبر (ص) کی جانشینی ایک ایسی ذمہ داری ہے کہ جو خدا کی طرف سے سونپی جاتی ہے اور پیغمبر (ص) کے توسط سے خود خداوند عالم، امام اور پیغمبر (ص) کے جانشین

۱۔ جزیرۃ العرب میں اس وقت اونٹ ہی عظیم قومی سرمایہ تھا لہذا ان کی ثقافت میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اونٹ اور اس قومی سرمایہ کے بارے میں لوگوں کے مختلف رویوں کو، کنایوں اور مثالوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کو معین فرماتا ہے، جس طرح پیغمبر (م) کو خدا معین فرماتا ہے اور لوگوں پر اس کی اطاعت واجب ہے بالکل اسی طرح پیغمبر (م) کے جانشین کو بھی خدا معین کرتا ہے اور لوگوں کو اس کی بھی اطاعت اور پیروی کرنی چاہئے، لیکن تم حد سے بڑھ گئے ہو اور خدا کے حکم کو پامال کرتے ہوئے تم نے اپنی طرف سے فیصلہ کر کے پیغمبر (م) کے لئے خود ساختہ جانشین مقرر کر دیا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

چھٹا درس:

- گزشتہ درس کا خلاصہ
- سقیفہ کی واقعی صورت حال
- سقیفہ کے دوران حقائق کی تبدیلی
- عوام، سیاسی کھلونے
- قرآن میں رہبر کے شرائط
- قرآن کی چند خصوصیات
- قرآن، راہنمائے فکر و عمل

ثُمَّ اسْتَنْهَضَكُمْ فَوَجَدَكُمْ خَفَافًا، وَأَحْمَشَكُمْ فَأَلْفَاكُمْ غَضَابًا؛ فَوَسَّمْتُمْ غَيْرَ
إِبْلَاحِكُمْ، وَوَرَدْتُمْ غَيْرَ مَشْرِيبِكُمْ [شَرِبِكُمْ].

هَذَا وَالْعَهْدُ قَرِيبٌ، وَالْكَلِمُ رَحِيبٌ، وَالْجَرْحُ لَمَّا يَنْدَمِلُ، وَالرُّسُولُ لَمَّا
يُقْبَرُ، ابْتِدَارًا، زَعَمْتُمْ خَوْفَ الْفِتْنَةِ، أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ
بِالْكَافِرِينَ، فَهَيْهَاتَ مِنْكُمْ، وَكَيْفَ بِكُمْ، وَأَنْتَى تُؤَفِّكُونَ! وَكِتَابُ اللَّهِ بَيْنَ
أَظْهَرِكُمْ، أُمُورُهُ ظَاهِرَةٌ وَأَحْكَامُهُ زَاهِرَةٌ وَأَعْلَامُهُ بَاهِرَةٌ، وَزَوَاجِرُهُ لَاسِيحَةٌ، وَ
أَوَامِرُهُ وَاضِحَةٌ؛ وَقَدْ خَلَفْتُمُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ، أَرَغْبَةً عَنْهُ تَدْبُرُونَ [تَرِيدُونَ]؟ أَمْ
بِغَيْرِهِ تَحْكُمُونَ؟ بِشَسِّ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا، وَمَنْ يَتَّبِعِ [يَتَّبِعْ] غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ
يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس کا خلاصہ،

گزشتہ درس میں ہم نے یہ بتایا کہ حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام نے مہاجرین و انصار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

پنغیر اس کی رحلت کے بعد تمہارے درمیان منافقت کے کانٹے نمودار ہوئے، دین اور معنویت کا خاتمہ ہو گیا، مشرکین اور دوسرے افراد جو آج تک گوشہ و کنار میں چھپے ہوئے تھے نمایاں ہو کر صاحب سخن بن گئے، شیطان نے اپنے خول سے سر نکال کر تم میں تحرک پیدا کیا اور اپنی طرف بلایا پس اس نے تم کو گھٹیا اور بے ارادہ پایا۔ اس طرح شیطان نے سمجھ لیا کہ اگر تمہیں درغلایا جائے تو تم بہت جلد متاثر ہو جاؤ گے۔ مختلف قسم کے پروپیگنڈوں سے جو افراد متاثر ہوتے ہیں وہ عموماً کوئی مستحکم نظریہ نہیں رکھتے یہ ضعیف الارادہ اور کھوکھلے انسان، جو بات بھی سنتے ہیں بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔

گزشتہ درس میں یہ بھی عرض کیا تھا کہ جو لوگ کسی معاشرے سے غلط استفادہ کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس قوم کو اپنے نظریات اور آزاد خیالی سے محروم کر دیں تاکہ یہ قوم کمزور اور جذباتی بن جائے اور ہوا کے ہر جھونکے سے بے اختیار متاثر ہو جائے۔

فرعون کے بارے میں قرآن فرماتا ہے کہ: اس نے اپنی قوم کو ہلکا اور گھٹیا پایا کہ جس کے نتیجے میں

انہوں نے اس کی اطاعت کی (۱)۔

عموماً ایسا ہوتا کہ جب کوئی فاسد گروہ کسی فرد کو اپنا ممبر بنانا چاہے تو پہلے قدم کے طور پر اس فرد سے اس کی خودی چھین لیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ شاہی دور میں زندان میں ایک شخص تھا جو عقیدہ بدل کر کمیونسٹ بن چکا تھا، میں نے اس سے کہا کہ: تجھے کیا ہوا کہ اچانک اپنے دینی اعتقادات کو چھوڑ کر کمیونسٹ بن گئے ہو؟ اس نے جواب میں کہا کہ: ہماری پارٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنا عقیدہ بدل دیں! چونکہ ہم پارٹی کے ممبر ہیں اور پارٹی کے فیصلے ہمارے لئے حجت ہیں!! یہ وہی بات ہے جسے حضرت زہراء (ع) نے لوگوں سے فرمایا کہ: شیطان نے تمہیں بلایا اور چونکہ تم سست عناصر اور بے ارادہ قسم کے لوگ تھے، شیطان کے استقبال کے لئے آگے بڑھ گئے حالانکہ انسان کو فکری اور عقلی طور پر مستقل مزاج ہونا چاہئے اور مختلف قسم کے پروپیگنڈوں اور ہتھکنڈوں سے متاثر نہیں ہونا چاہئے یہاں پہنچ کر آپ فرماتی ہیں کہ:

”ثم استنبضکم فوجدکم خفافا“

(پھر شیطان نے تم سے چاہا کہ۔ اس کے پیچھے۔ چل پڑیں تو اس نے تمہیں گھٹیا پایا)
شیطان نے تم میں سنجیدگی نہیں دیکھی اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے دیکھا کہ تم میں اپنا کوئی فکری اور عقلی استقلال نہیں ہے اور جس طرف وہ ہانکے تم اسی طرف چل پڑتے ہو۔

”واحمشکم فالفاکم غضابا“

(شیطان نے تمہیں درغلا یا اور غصہ دلایا تو تمہیں غضبناک پایا)
یعنی شیطان نے اس طریقے سے تمہارے جذبات کو بھڑکایا کہ تم غصے سے آگ بگولہ ہو گئے۔ اگر کوئی شخص دوسروں سے غلط استفادہ کرنا چاہے تو وہ ان کے سامنے کچھ ایسی باتیں اور قصیدہ خوانی کرتا ہے کہ ان کے جذبات سے کھیل کر بعض اور افراد کو ان کا جانی دشمن بنا دیتا ہے، اس کام کو اصطلاح میں احمش کہا جاتا ہے۔

۱۔ ”فاتحہ قومہ فاطمہ“ سورہ زخرف / ۵۴۔

”فالفاکم غضاباً“ اس وقت شیطان نے دیکھا کہ تم غضبناک اور کینہ توز آدمی ہو اور شیطان کی مرضی کی مطابق تم غضبناک ہوتے ہو، اپنے غصہ اور کینہ توزی کو کفار و منافقین کے خلاف استعمال کرنے کے بجائے پیغمبر (ص) کے اہل بیت کو اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بناتے ہو۔

”فوسمتم غیر ابلکم“

(پھر کیا تھا کہ تم نے دوسروں کے اونٹوں پر اپنی ملکیت کی علامت لگائی)

یعنی تم حد سے گزر گئے اور دوسروں کے اونٹوں پر علامت لگا ڈالی! اس دور میں رسم یہ تھی کہ ہر شخص اپنے مویشیوں کو چراگا ہوں اور صحراؤں میں چرنے کے لئے چھوڑ دیتا تھا اور اپنے مویشیوں کی پہچان کے لئے ہر کوئی اپنے حیوانات پر مخصوص علامت لگا دیتا تھا، کوئی کان کاٹ دیتا تھا تو کوئی حیوان کے بدن کی کسی خاص جگہ پر گرم لوہے سے علامت لگا دیتا تھا اس عمل کو دسم کہتے تھے۔

یہاں حضرت زہراء (ع) کا یہ فرمانا کہ: تم نے دوسروں کے اونٹوں پر علامت لگا دی ہے، اور اس طرح دست درازی کر کے دوسروں کے مال مویشیوں کو اپنی ملکیت میں شامل کر لیا ہے کا مطلب یہ ہے کہ خلافت پر تمہارا کوئی حق نہ تھا اور تم نے اپنی اس بغادت کے ذریعے امامت و خلافت کی شرعی حدود پر تجاوز کیا ہے اور اپنی حد سے گزر گئے ہو۔

”ووردتم غیر مشربکم۔ شربکم۔“

(اور تم نے دوسروں کے گھاٹ اور چشمے پر ناجائز قبضہ جمایا ہوا ہے)

یہاں نسخوں میں لفظی اختلاف ہے بعض میں ”مشربکم“ ہے جبکہ بعض نسخوں میں ”شربکم“ ذکر ہوا ہے۔ ہر صورت دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی گھاٹ، پانی پینے کی جگہ۔

گزشتہ زمانوں میں خصوصاً ایسے علاقوں میں جہاں پانی کم اور استفادہ کرنے والے زیادہ ہوتے تھے رواج یہ تھا کہ ہر قوم یا محلہ کے لئے چشمے یا ندی وغیرہ سے پانی لینے کی جگہ متعین ہوتی تھی اور ہر کوئی اپنے مخصوص گھاٹ سے ہی پانی لیتا تھا۔ پانی لینے کی ان جگہوں کو ”منہل، مشرب یا شرب“ کے نام سے یاد کرتے تھے اور اس طرح ہر قبیلہ اور محلہ کے لوگوں کے پانی لینے کی جگہ معین اور مشخص ہوتی تھی۔

ہر صورت یہ تقسیم بندی اس وجہ سے تھی کہ وہاں ازدحام نہ ہو۔ اور باہمی نزاع کا سبب نہ بنے۔ البتہ طاقتور افراد یا قبیلے کبھی اپنے زور اور طاقت کے بل بوتے پر دوسروں کے گھاٹ پر قبضہ جمالیتے تھے۔ یہاں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: تم دوسروں کے گھاٹ میں داخل ہو گئے۔ آپؐ کا مقصد یہ ہے کہ تم نے اپنی حد سے تجاوز کیا ہے اور تم ظلم اور سنگری سے دوسروں کے حریم کو نشانہ بناتے ہو۔

سقیفہ کی واقعی صورت حال

”ہذا، والعہد قریب“

(تم ان ساری کارستانیوں کے مرتکب ہوئے ہو حالانکہ عہد رسولؐ تم سے بہت ہی قریب ہے)

حضرت زہراء سلام اللہ علیہا فرماتی ہیں کہ: تم نے اپنی سنگری کا آغاز ایسی حالت میں کیا کہ جب پیغمبر اکرم (س) کی رحلت کو کچھ عرصہ ہی گزرا ہے اور چند روز قبل تم آنحضرت (س) کے منبر تلے بیٹھتے تھے اور آنحضرت (س) تمہیں اپنی عترت (حضرت امیر المؤمنین، حضرت زہراء علیہما السلام) کے بارے میں نصیحت اور سفارش کرتے تھے اور تمہیں حق وعدالت کی رعایت کی تلقین فرماتے تھے، چند دن ہی گزرے ہیں کہ غدیر خم میں پیغمبر خدا (س) نے دو ٹوک الفاظ میں علی (ع) کو اپنا جانشین بنایا اور تم سب نے اس کی بیعت کی ہے اور اسے مبارک باد دی ہے۔ اب تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم نے اتنی جلدی ہر چیز کو بھلا دیا ہے! اور رسول خدا (س) کی نصیحتوں کو پامال کر رہے ہو؟!!!

”والعہد قریب“ عہد رسول خدا (س) سے تم بہت ہی نزدیک ہو (۱)۔ ”عہد، عہد“ کا مصدر ہے۔ اور عہد ملاقات کرنے نیز پہچاننے کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں عموماً ایسی ملاقات کو کہا جاتا ہے جو شناخت اور معرفت کے ساتھ ہو۔

۱۔ اس جملے سے شاید یہ مراد ہو کہ غدیر خم میں آپؐ کی حضرت علیؑ کے ساتھ بیعت اور عہد کا زمانہ نزدیک ہے اور اس پیمان اور بیعت کو ابھی عین ابھی مکمل نہیں ہوئے کہ جس کو آپؐ نے توڑ مروڑ دیا ہے!

”والکلم رحب“

(حالانکہ پنیبر (م) کی رحلت کا زخم بہت گہرا اور ہرا ہے۔)

”کلم“ یعنی زخم اور چوٹ۔ ”رحیب“ ”رحب“ سے مشتق اور وسیع، کشادہ اور گہرے کے معنی میں

استعمال ہوتا ہے۔

رحمۃ للعالمین (م) کی وفات نے اہل بیتؑ اور آپ (م) کے مخلص اصحاب کے دلوں پر گہرا زخم لگایا ہے۔ حضرت زہراء (ع) بھی اس عبارت میں یہی فرماتی ہیں کہ: رسول خدا (م) کی رحلت کے سبب سے ہمارے دلوں پر جو چوٹ آئی ہے وہ بہت گہری وسیع اور قوت برداشت سے باہر تھی۔ لیکن تم نے اس زخم پر مرہم رکھنے کی بجائے ہمارے اوپر مظالم کے پہاڑ ڈھائے۔

”والجرح لما یندمل“

(۔ ہمارے دل کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے)

ان باتوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ رحلت رسول خدا (م) کے فوراً چند دن بعد ہی فدک غضب ہوا تھا اور آپؑ نے مسجد میں خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ بعض تاریخی کتابوں میں ذکر ہوا ہے کہ رحمت للعالمین (م) کی وفات کے دسویں دن آپؑ نے مسجد میں لوگوں سے خطاب فرمایا۔ بہر صورت اہل بیتؑ، پنیبر (م) کے غم میں سوگوار تھے۔ کہ انہی دنوں میں اہل بیتؑ پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

”والرسول لما یقبر“

(اور پنیبر (م) ابھی دفن بھی نہیں ہوئے تھے)

یہاں حضرت زہراء (ع) سقیفہ کی کاروائی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ابھی رسول خدا (م) دفن بھی ہونے نہ پائے تھے اور حضرت علی (ع) ان کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے کہ یہ لوگ سقیفہ میں جمع ہو گئے اور اسلام اور مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے لگ گئے۔

سقیفہ کے دوران حقائق کی تبدیلی

”ابتداراً“

(انتہائی جلد بازی میں۔ تم نے یہ قدم اٹھایا۔)

”ابتداراً“ ممکن ہے مفعول مطلق ہو (۱) اور اس کا فعل محذوف ہو اس طرح اصل میں ”ابتدر تم ابتداراً“ یعنی تم نے حد سے زیادہ جلد بازی سے کام لیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ مفعول لہ (۲) ہو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ چونکہ تم جلدی میں تھے اور آپؐ کا مقصد یہ ہے کہ۔ تم خلافت کو غصب کرنا چاہتے تھے بغاوت کے لئے مناسبت ترین وقت وہی تھا کہ جب علی (ع) دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر پیغمبر خدا (ص) کی تجہیز و تکفین میں مصروف تھے۔ لہذا تم سقیفہ میں جمع ہو گئے اور یہ سوچنے لگے چونکہ پیغمبر خدا (ص) کے بعد اسلامی معاشرے کا کوئی سربراہ نہیں ہے اور اسلام خطرات سے دوچار ہے لہذا اسلام کو خطرات سے بچانے کے لئے خلیفہ مقرر کر دیا ہے۔ چونکہ اس منصوبے پر عملدرآمد کے لئے وقت کم تھا اور تم جلدی میں تھے، پیغمبر (ص) کو بے کفن چھوڑ دیا اور بغاوت کر کے کرسی اقتدار پر قبضہ جمالیا، اقبال نے خوب کہا ہے: ”چون صحابہ حب دنیا داشتند مصطفیٰ را بے کفن بگذاشتند“۔

”زعمتم خوف الفتنة“

(تم نے گمان کیا کہ۔ اگر ہم خلافت غصب نہ کریں تو۔ فتنے سر اٹھائیں گے!)

”زعمتم“ تم نے گمان کیا، یہ کلمہ عموماً اس وقت استعمال کیا جاتا ہے کہ جب کسی غلطی کی توجیہ میں کوئی نامعقول عذر پیش کیا جائے۔ اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ تم نے جلدی بازی سے کام لیا اور یہ بہانہ پیش کیا کہ ہمیں ڈر تھا کہ کہیں فتنے سر نہ اٹھائیں، مثال کے طور پر سوچا کہ کہیں یہ تازہ مسلمان مرتد نہ ہو جائیں۔ اسی بہانے کی آڑ میں آکر۔ فوراً ایک شخص کو پیغمبر (ص) کا جانشین بنایا گیا!۔

واقعیت یہ تھی کہ سقیفہ والوں کا بنیادی ہدف، خلافت کو غصب کرنا تھا۔ جو کر لیا۔ لیکن درپردہ

۱۔ مفعول مطلق، فعل کا مصدر ہوتا ہے جو اس فعل کی تاکید کے لئے لایا جاتا ہے۔

۲۔ مفعول لہ، کسی کام کی علت اور مقصد کو بیان کرتا ہے۔

حقائق سے بے خبر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے "خوف فتنہ" کے بہانے کا سہارا لیا تاکہ ایک طرف سے تو کوئی عوامی رد عمل سامنے نہ آئے اور دوسری طرف سے اپنے اس اقدام کو جائز اور حق بجانب قرار دیں، لیکن حضرت زہراء (ع) نے در پردہ علل و اسباب سے پردہ اٹھایا اور ان کے اہداف و مقاصد کی طرف لوگوں کو متوجہ فرمایا۔

"الافى الفتنة سقطوا"

(آگاہ رہو! یہ لوگ فتنے کی گہرائیوں میں گر گئے ہیں)

تم جو چاہتے تھے کہ فتنے سے محفوظ رہیں لیکن یہ جان لو کہ تمہارا یہ اقدام اس بات کا سبب بن گیا ہے کہ تم سب فتنے میں گر پڑو۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فتنہ ہو سکتا ہے کہ علی (ع) کو گوشہ نشینی اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے۔ مفاد پرست اقتدار سنبھال لیں اور اسلام کو اپنی اصلی راہ سے منحرف کر دیں۔ اس کے علاوہ تم نے پیغمبر اکرم (س) کی واضح نص شرعی کی بھی مخالفت کی کیونکہ خدا اور پیغمبر خدا (س) کے حکم سے علی (ع) کی خلافت کا اعلان ہوا تھا۔ اور تمام مسلمانوں نے علی (ع) کی بیعت کی تھی، بنا بریں پیغمبر اسلام (س) کے بعد جانشینی کا مسئلہ پہلے سے حل ہو چکا تھا اور کوئی مشکل نہیں تھی، لیکن تم نے اپنے اس اقدام کے ذریعے اسلامی معاشرے میں تفرقہ اور فتنہ کے بیج بوئے۔

"وان جہنم لمحیطۃ بالکافرین (۱۱)"

(اور جہنم کفار کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے)

یہاں آپؐ نے قرآن کی اس آیت کو ان پر تطبیق کیا ہے اور درحقیقت ان کو کافر قرار دیا ہے، البتہ آپؐ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ اصطلاحی کافر ہیں (یعنی وہ خدا و رسول خدا (س) اور قیامت کے بھی منکر ہوں، ایسا نہیں تھا) بلکہ جہاں ایمان کے کچھ مراتب ہیں وہاں کفر کے بھی کچھ مرتبے ہیں اور بعض روایات میں آیا ہے کہ گناہ کی حالت میں انسان سے اس کا ایمان جدا ہو جاتا ہے اور غضب خلافت چونکہ گناہان کبیرہ میں سے شمار ہوتا ہے لہذا حضرت زہراء (ع) نے کفار سے مربوط اس آیت کو، سقیفہ

۱۔ آپؐ نے سورہ توبہ کی آیت ۴۹ کو بعید نقل کیا ہے۔

والوں پر تطبیق فرمایا ہے۔

عوام، سیاسی کھلونے،

”فیہات منکم“

(تم سے۔ یہ حرکتیں۔ بہت بعید تھیں!)

تم مہاجر و انصار سے یہ بعید تھا کہ ایسی حرکتوں کے مرتکب ہو جاؤ اور اپنے پیغمبر (س) کے خاندان کو تنہا چھوڑ دو اور یہ بھی بعید تھا کہ ایک شیطان صفت گروہ کے فریب میں آکر ان کی سیاست اور پروگراموں کے سامنے کھلونا بن جاؤ۔

”وکیف بکم؟“

(اور تمہیں ہوا کیا ہے؟)

یعنی تم اسلام میں سبقت رکھتے ہو اور کسی حد تک ان امور سے آگاہی بھی رکھتے ہو۔ پھر۔ ان سب چیزوں کے باوجود۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟۔

”وانسی توفکون؟“

(اور کہاں بھٹک رہے ہو؟)

امامت جیسے اہم مسئلے میں انحراف اور کجی نے حضرت زہراء (ع) کو مضطرب اور پریشان کر دیا ہے کیونکہ آپؑ دیکھ رہی تھیں کہ سادہ لوح عوام، چند معلوم الحال افراد کی شیطانی سیاست کے ہاتھوں کھلونا بن چکے ہیں اسی لئے آپؑ ان سے پوچھتی ہیں کہ: کیا تم جانتے ہو کہ آخر کیا کر رہے ہو؟ اور تمہیں۔ راہ راست سے منحرف کر کے۔ کہاں لے گئے ہیں؟۔

قرآن میں رہبر کے شرائط،

”و کتاب اللہ بین اظہر کم“

(در حالیکہ خدا کی کتاب - قرآن - تمہارے درمیان موجود تھی)

”بین اظہر کم“ کا لفظی ترجمہ ”تمہارے کاندھوں کے درمیان ہے“۔ یہ ایک اصطلاح ہے اور اس وقت بولی جاتی ہے کہ جب کسی حساس مقام پر کسی اہم شخصیت کا دفاع کرنا مقصود ہو۔ فرض کریں کہ کسی جگہ پر کوئی شخصیت موجود ہے اور لوگ اس کی شخصیت کو دشمن کے مقابلے میں محفوظ رکھنا چاہیں تو اس محترم شخص کو اپنے گھیرے میں لے لیا کرتے ہیں اور اکثر لوگ اس کی طرف پشت کر کے دشمن کے روبرو کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہر طرف سے اس کی حفاظت کی جاتی ہے تاکہ دشمن اس پر حملہ نہ کر سکے۔

یہاں پر حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: خدا کی کتاب، قرآن تمہارے کاندھوں کے درمیان موجود تھی اور تم دشمنوں کے مقابلے میں قرآن اور احکام قرآن کی پاسبانی کرتے تھے اس طرح تم قرآن کو اپنے درمیان رکھ کر دشمن کی طرف متوجہ تھے اب اسی قرآن میں امامت اور مسلمانوں کی سربراہی کے شرائط مذکور ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ: ”افمن یہدی الی الحق احق ان یتبع امن لایہدی الا ان یہدی“ (۱) ”کیا جو لوگوں کو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے وہ لائق اتباع اور پیروی کا حقدار ہے یا وہ شخص جو جب تک کوئی اس کو ہدایت نہ کرے ہدایت نہیں پاتا؟“۔ یعنی ایک شخص ہدایت یافتہ ہے لوگوں کی عملاً ہدایت کر رہا ہے دوسرا شخص محتاج ہدایت ہے اب ان دو میں سے کون امامت درہبری کا حقدار ہے؟۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ: ”ولاتطیعوا امر المسرفین“ (۲) ”اسراف اور فضول خرچی کرنے والوں کی پیروی نہ کرو“ یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ جو شخص فضول خرچ ہو۔ یا خود ہدایت کا محتاج ہو۔۔۔ مسلمانوں کا حاکم اور رہبر نہیں بن سکتا بلکہ خلیفہ اور مسلمانوں کے رہبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ عادل اور ہدایت یافتہ ہو۔ اسی طرح قرآن مجید میں اسلامی معاشرے کے رہبر اور سربراہ کے لئے دوسری شرائط بھی ذکر ہوئی ہیں (۳)۔

۱۔ سورہ یونس / ۳۵۔

۲۔ سورہ فہراء / ۱۵۱۔

۳۔ تاریخ اور اہل سنت کے بہت سارے علماء کی گواہی کے مطابق، حضرت علیؑ علی مقام کے اعتبار سے تمام لوگوں سے زیادہ اعلم ==

قرآن کی چند خصوصیات

(۱) ”امورہ ظاہرہ واحکامہ زاہرہ“

(قرآن کے علوم و معارف آشکار اور اس کے احکام درخشاں ہیں)

یہ جملہ اس بات پر دلالت رکھتا ہے کہ قرآن کی آیات سے جو معانی ہماری سمجھ میں آتے ہیں وہ ہمارے لئے حجت ہیں اور ہماری زندگی پر قرآن کی حکمرانی ہونی چاہئے۔ یہ کسی بھی صورت میں صحیح نہیں کہ ہم قرآن کو صرف تبرک کے لئے چومیں اور طاقت پر احترام سے رکھ دیں تاکہ صرف فاتحہ خوانی کے لئے اس سے استفادہ کریں، بلکہ ضروری ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں قرآن کی طرف رجوع کریں اور قرآن کے احکامات اور فرامین پر عمل کریں، البتہ قرآنی آیات کی توضیح اور تفسیر کے لئے معصومین کی روایات کی طرف رجوع کرنا بھی ضروری ہے۔

(۲) ”واعلامہ باہرہ“

(قرآن کی نشانیاں، بلند اور غالب ہیں)

جیسا کہ آج کل سڑکوں کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے سڑکوں پر مخصوص علامتیں نصب کی جاتی ہیں بالکل اسی طرح گزشتہ زمانوں میں بھی صحراؤں اور راستوں میں مسافروں کی راہنمائی کے لئے علامت کے طور پر بڑی بڑی چیزیں نصب کر دی جاتی تھیں اور یہ علامتیں عموماً اونچی اور بلند ہوا کرتی تھیں تاکہ مسافر دور سے ان علامتوں کو دیکھ سکے، اصطلاح میں ان علامتوں کو ”علم“ کہا جاتا تھا اور بلند علامتوں اور نشانیوں کو ”علم باہر“ یعنی بلند اور غالب علامت کہا جاتا ہے۔ ”باہر“ بھڑکے سے مشتق ہے اور ”بھڑک“ کے معنی بلند، اونچا اور غالب کے ہیں۔

یہاں پر حضرت - فاطمہ (ع) - قرآن کی تعلیمات کو ان علامتوں سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتی ہیں

== اور فقیہ تر تھے اور بہت سارے مسائل کے بارے میں خلیفہ ثانی آپؑ سے سوال کرتا تھا۔ یہ مشور ہے کہ جب عمر کسی حکم کو نہیں جانتا تھا تو حضرت علیؑ سے پوچھتا اور آپؑ، خلیفہ کی راہنمائی فرماتے تھے ایسے ہی موقعوں پر حکم خدا سے آگاہ ہونے کے بعد خلیفہ نے سترے زیادہ مقامات پر کہا کہ، ”لولا علی لملک عمر“ اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ملاک ہو جاتا۔

کہ قرآن کی نشانیاں اور علامتیں دوسرے ادیان و مذاہب کی تعلیمات پر غالب اور ارفع و اعلیٰ ہیں۔ قرآن میں بھی آیا ہے کہ: ”ان هذا القرآن یهدی للتی هی اقوم (۱)“ (بیشک یہ قرآن انسان کو بہت محکم اور قوی قوانین و معارف کی جانب ہدایت کرتا ہے)

(۳) ”وزواجہ لایحۃ واوامرہ واضحۃ“

(قرآن کے امر و نہی واضح اور آشکار ہیں)

”زواجہ“ سے مراد قرآن کے نواہی ہیں۔ ”زجر“ کے معنی ہیں منع کرنا اور روکنا۔ پس نہی کا معنی طلب ترک نہیں جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں بلکہ نہی کا مدلول زجر اور روکنا ہی ہے جیسا کہ مرحوم آیت اللہ العظمیٰ بروجردی فرماتے تھے کہ: امر کسی کام کے کرنے پر وادار کرنے اور نہی اس سے روکنے کے معنی میں ہے۔

مندرجہ بالا فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے اوامر اور نواہی واضح اور آشکار ہیں اور جو بھی قرآن کی زبان سے آشنائی رکھتا ہو بخوبی ان اوامر و نواہی کو درک کر سکتا ہے۔

قرآن، راہنمائے فکر و عمل،

”قد خلفتموہ وراء ظهورکم“

(قرآن کو۔ ہدایت کا روشن منیار ہونے کے باوجود۔ تم نے پس پشت ڈال دیا)

جب امامت درہمبری جیسے مهم اور حساس مسئلے میں تم نے قرآن کو قابل اعتناء نہیں سمجھا اور رہبری اور قیادت کے لئے قرآن کے معین کردہ شرائط کو ٹھکرا دیا تو حقیقت میں تم نے قرآن سے روگردانی اختیار کی ہے اور قرآن کو متروک قرار دیا ہے اگرچہ تم فروغ دین، نماز، روزہ، اور حج کے مسائل میں قرآن پر عمل کرتے ہو لیکن امامت جیسے اہم مسئلے میں تم نے قرآن کے ساتھ بے اعتنائی برتی۔ اور یہ قرآن سے مکمل روگردانی کے مترادف ہے۔

”ارغبۃ عنہ تدبرون۔ تریدون۔ ام بغیرۃ تحکمون“

(کیا تم قرآن سے نفرت کے ساتھ منہ پھیر لیتے ہو یا کسی دوسری چیز کو حکم اور قضاوت کا معیار قرار دیتے ہو) اس عبارت کے نقل میں نسخوں میں اختلاف ہے بعض نسخوں میں ”تدبرون“ اور بعض میں ”تریدون“ ذکر ہوا ہے۔ اگر واقع میں ”تریدون“ صحیح ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ: کیا تم نے یہ ارادہ کیا ہے کہ قرآن سے منہ پھیر لیں؟ لیکن اگر ”تدبرون“ درست ہو اور شاید بہتر بھی یہی ہے تو حملے کا معنی یہ ہو گا کہ: کیا تم۔ نفرت کے ساتھ۔ قرآن سے منہ موڑنا چاہتے ہو اور اسے پس پشت ڈالنا چاہتے ہو؟ یعنی کیا تم نام نہاد اسلامی حکومت کے نام پر قرآنی حقائق کو پامال کرنے کے خواہاں ہو؟ ”ام بغیرۃ تحکمون“ یا تم قرآن کے علاوہ کسی دوسرے ملاک اور معیار کے مطابق حکم کرنا چاہتے ہو؟

”وبئس للظالمین بدلاً (۱)“

(ظالموں کے لئے کس قدر بری ہے وہ چیز کہ جس کو قرآن اور حق کے بدلے میں انہوں نے اختیار کیا ہے) حضرت زہراء (ع) اس قرآنی آیت سے استفادہ کرتے ہوئے ظلم کے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ آپ ’سقیفہ کی کاروائی‘ اس کے نتائج اور قرآن سے روگردانی کو ظلم کے روشن ترین مصداق جانتی ہیں اور اس کے عاملین کو ظالم۔

”ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ (۲)“

(جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کو اختیار کرے تو اس سے وہ دین قبول نہیں کیا جائے گا) بعض نسخوں میں ”ومن یشیع غیر الاسلام“ ذکر ہوا ہے لیکن ”ومن یبتغ غیر الاسلام“ صحیح نظر آتا ہے کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کلمات کو قرآن سے اقتباس فرمایا ہے اور وہاں پر ”ومن یبتغ“ مذکور ہے۔

۱۔ یہ عبارت سورۃ کھف کی آیت ۵۰ سے ماخوذ ہے۔

۲۔ سورۃ آل عمران / ۸۵

”وہو فی الآخرۃ من الخاسرین (۱)“

(اور وہ آخرت میں گھائے میں ہوں گے)

یہاں حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: تم نے جو قرآن سے منہ پھیر لیا ہے اور اس کے اوامر و نواہی پر عمل نہیں کرتے ہو درحقیقت اسلام سے خارج ہو چکے ہو، کیونکہ اسلام کی بنیاد تو قرآنی دستورات اور فرامین پر رکھی گئی ہے، اگر اسلام سے قرآن کو حذف کیا جائے تو پھر اسلام نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی، تم جو قرآنی تعلیمات کو چھوڑ چکے ہو اور اس پر عمل نہیں کرتے ہو تو تمہارا یہ عمل بالکل اس طرح ہے کہ تم نے اسلام کو خیر باد کہہ کر کسی دوسرے دین کو قبول کیا ہو۔

یہاں تک آپؐ نے اصل مسئلہ کو بیان فرما دیا ہے کہ: پیغمبر (ص) دفن بھی نہ ہوئے تھے کہ تم نے اپنا من پسند خلیفہ بنایا اور پیغمبر (ص) کے برحق جانشین کو خانہ نشین ہونے پر مجبور کر دیا اور قرآن کے واضح احکامات نیز پیغمبر اکرم (ص) کی تعلیمات کو پامال کر دیا ہے۔ اس کے بعد آپؐ فرماتی ہیں کہ اگر تم خلافت کی راہ کو منحرف کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو تو پھر آپؐ کو اپنی خلیفہ گری کے پیچھے جانا چاہئے تھا اور کم از کم پیغمبر (ص) کی عزت کو تو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بناتے، لیکن تم بہت بے شرم نکلے کہ غضب خلافت پر اکتفاء نہ کیا بلکہ فدک کو بھی غضب کر کے پیغمبر خدا (ص) کے اہل بیت علیہم السلام سے بھی گستاخی کی۔

انشاء اللہ آنے والے درس میں خطبے کے باقی ماندہ حصے پر گفتگو ہوگی۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ساتواں درس:

- ✽ خلیفہ تراشی اور اقدار کی تبدیلی
- ✽ مکر و فریب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ
- ✽ دوستی کے انداز میں دشمنی
- ✽ سختیوں پر صبر
- ✽ فدک، میراث پیغمبر (ص)
- ✽ آیات ارث اور انبیاء (ع)
- ✽ آیات ارث کے سمجھنے میں غلط فہمی کی وجوہات
- ✽ ارث کے مسئلے پر اتنی تاکید کیوں؟
- ✽ ارث سے آپ (ع) کی مراد کیا ہے؟
- ✽ حضرت زہراء (سلام اللہ علیہا) کی ابوبکر کو وارث نہ بننے

ثُمَّ لَمْ تَلْبَثُوا إِلَّا رَيْثَ أَنْ تَسْكُنَ نَفَرَتَهَا وَ يَسْلَسَ قِيَادَهَا، ثُمَّ أَخَذْتُمْ تَوَرُونَ
وَقَدْتَهَا وَ تَهيجُونَ جَمَرَتَهَا وَ تَسْتَجِيبُونَ لِهَتَافِ الشَّيْطَانِ الْغَوَى، وَ إِطْفَاءِ أَنْوَارِ
الدِّينِ الْبَجَلَى وَ إِهْمَادِ سُنَنِ النَّبِيِّ الصُّفَى، تَشْرَبُونَ حَسَوًا فِي اِرْتِفَاءٍ، وَ تَمْشُونَ
لِأَهْلِهِ وَ وَلَدِهِ فِي الْخَمْرَةِ وَ الضَّرَاءِ، وَ نَضِيرُ مِنْكُمْ عَلَى مِثْلِ حَزِّ الْمَدَى وَ وَخْزِ
السِّنَانِ فِي الْحِشَاءِ؛ وَ أَنْتُمْ الْآنَ تَزْعُمُونَ: أَنْ لَا إِرْثَ لَنَا، أَفَحُكْمُ الْجَاهِلِيَّةِ تَبْنُونَ وَ
مَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ؟ أَفَلَا تَعْلَمُونَ؟

بَلَى قَدْ تَجَلَّى لَكُمْ كَالشَّمْسِ الصَّاحِيَّةِ: أَنِّي إِبْنَتُهُ.
أَيُّهَا الْمُسْلِمُونَ! أَأَغْلِبَ عَلَى إِرْثِيهِ؟ يَا ابْنَ أَبِي قُحَافَةَ! أَنَّى كِتَابَ اللَّهِ أَنْ
تَرِثَ أَبَاكَ وَ لَا أَرِثَ أَبِي؟!! لَقَدْ جِئْتُ شَيْئًا فَرِيًّا [عَلَى اللَّهِ وَ رَسُولِهِ]! أَفَعَلَى عَمْدٍ
تَرَكْتُمْ كِتَابَ اللَّهِ وَ نَبَذْتُمُوهُ وَ زَاءَ ظُهُورَكُمْ؟ إِذْ يَقُولُ: ﴿وَ وَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ﴾، وَ
قَالَ فِيمَا افْتَضَّ مِنْ خَبَرِ يَحْيَى بْنِ زَكَرِيَّا عَلَيْهِ السَّلَامُ إِذْ قَالَ: ﴿فَهَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا
يَرِثُنِي وَ يَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ﴾^١

وَ قَالَ: ﴿وَ أُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ﴾^٢
وَ قَالَ: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَى﴾^٣
وَ قَالَ: ﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالدَيْنِ وَ الْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى
الْمُتَّقِينَ﴾^٤؛ وَ زَعَمْتُمْ أَنْ لَا حِظَّ لِي وَ لَا إِرْثَ مِنْ أَبِي وَ لَا رَحِمَ بَيْنَنَا، أَفَخَصَّكُمْ
اللَّهُ بِآيَةٍ أَخْرَجَ أَبِي [مُحَمَّدٌ ﷺ] مِنْهَا؟! أَمْ هَلْ تَقُولُونَ: إِنَّ أَهْلَ الْمِلَّتَيْنِ
لَا يَتَوَارَثَانِ؟! أَوَلَسْتُ أَنَا وَ أَبِي مِنْ أَهْلِ مِلَّةٍ وَاحِدَةٍ؟! أَمْ أَنْتُمْ أَغْلَمُ بِخُصُوصِ
الْقُرْآنِ وَ عُمُومِهِ مِنْ أَبِي وَ ابْنِ عَمِّي؟!

فَدُونُكُمَا مَخْطُومَةٌ مَرْحُولَةٌ، تَلْقَاكَ يَوْمَ حَشْرِكَ، فَنِعْمَ الْحَكَمُ اللَّهُ، وَ الزَّعِيمُ
[الْغَرِيمُ] مُحَمَّدٌ ﷺ، وَ الْمَوْعِدُ الْقِيَامَةُ؛ وَ عِنْدَ السَّاعَةِ يَخْسِرُ الْمَبْطُلُونَ، وَ لَا
يَنْفَعُكُمْ إِذْ تَنْدَمُونَ؛ وَ لِكُلِّ نَبِيٍّ مُسْتَقَرٌّ وَ سَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَ
يَجْلُ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُقِيمٌ.

١. نمل: ١٦.

٢. مريم: ٥ و ٦.

٣. انفال: ٤٥.

٤. نساء: ١١.

٥. بقره: ١٨٥.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

خلیفہ تراشی اور اقدار کی تبدیلی،

لوگوں کی قرآن سے بے رخی اور قرآن میں امامت اور رہبر کے لئے معین شدہ شرائط کو نظر انداز کرنے کی طرف اشارہ فرمانے کے بعد اب یہاں پہلے سے تعیین شدہ اہداف کی تکمیل کے لئے جلد بازی میں خلیفہ گردوں نے جو خلیفہ تراشی کی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپؐ فرماتی ہیں کہ:

”ثم لم تلبثوا الا ريث ان تسكن نفرتها“

(۔ رحلت پیغمبر (ص) اور قرآن سے منہ پھیرنے کے بعد۔ پھر تم نے صبر نہیں کیا

مگر اتنی دیر تک کہ خلافت کا سرکش اونٹ ساکت ہو جائے)

”ریث“ مقدار، لمحہ، لحظہ، ”نفور“ چوپائے کا دور ہونا، اور یہ حیوان کی سرکشی اور اس کا اپنے اوپر سوار نہ ہونے دینے کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جب لوگ اونٹ پر سوار ہونا چاہتے ہیں تو اونٹ چند لمحوں کے لئے سرکش بن جاتا ہے اور دور ہو جاتا ہے، اس وقت چند لمحوں کے لئے اونٹ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ اس کی سرکشی ختم ہو جائے پھر جا کر سوار ہو جاتے ہیں۔

حضرت زہراء (ع) بھی یہاں فتنہ خلافت کو اونٹ سے تشبیہ دیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ۔ پیغمبر (ص) کی رحلت کے بعد تم نے فوراً قرآن سے منہ پھیر لیا اور۔ خلیفہ تراشوں نے اتنا ہی صبر کیا کہ جس قدر کسی

اونٹ پر سوار ہونے کے لئے چند لمحوں کے لئے صبر کیا کرتے ہیں۔ وہ بھی اس لئے تھا کہ جلدی اور عجلت میں خلافت کے بت تراشے جائیں۔ اور پیغمبر (ص) کی عترت اور مہاجر و انصار کی بہت ساری شخصیات کو اطلاع دینے بغیر سقیفہ تشکیل دے کر خلیفہ مقرر کر دیا ہے۔

”ویسلس قیادھا“

(تم نے صبر نہیں کیا مگر اس حد تک کہ شتر خلافت کی لگام آسانی سے تمہارے ہاتھ آجائے)
 ”سلس“ کسی چیز کی روانی اور اس کے آرام ہونے کو کہتے ہیں جبکہ ”قیاد“ لگام اور باگ ڈور کو کہا جاتا ہے۔ یہاں پر بھی آپؐ نے فتنہ خلافت کو اونٹ سے تشبیہ دی ہے۔ اور فرماتی ہیں کہ پیغمبر (ص) کے بعد تم ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سرگرم عمل ہو گئے اور خلافت کی باگ ڈور کو سنبھال لیا اور اپنے اس عجلت زدہ کام میں نہ قرآن کا پاس رکھا اور نہ پیغمبر (ص) کے احکامات کا۔

”ثم اخذتم تورون وقدتها“

(خلافت پر قبضہ کرنے کے بعد تم نے فتنہ کے شعلوں کو بھڑکانا شروع کر دیا)
 ”وقدة“ وقود کا ہم معنی ہے یعنی ایندھن۔ یہاں بنت الرسول (ع) نے سقیفہ کے واقعے اور غضب خلافت کو اس آگ سے تشبیہ دیا ہے جس کو پہلے انگارے سے جلایا جائے پھر آہستہ آہستہ اسے مزید ایندھن فراہم کر کے بھڑکایا جائے، یعنی تم نے خلافت کی آگ کو سقیفہ میں جلایا اور اسی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ اپنی سرکشی، ظلم اور ستمگری نیز جنایتوں کے ذریعے اس آگ کے شعلوں کو مزید بھڑکایا۔

”وتہینجون جمرتها“

(اور تم ظلم کی اس آگ کے انگارے کو بھڑکانے اور پھیلانے میں مشغول ہو)
 جب کوئلے کا ٹکڑا جل کر سرخ ہوتا ہے تو اسے ”جمرة“ کہا جاتا ہے اس کو ”جمع“ ”جر“ ہے۔ ”تہیج“ جمرة ”آگ کے انگاروں کو ہوا دے کر اسے پھیلانے کو کہتے ہیں تاکہ دوسرے کوئلے بھی آگ پکڑ لیں۔ اس عبارت میں آپؐ فرماتی ہیں کہ جب تم غضب خلافت کے ذریعے اقتدار پر قابض ہو گئے تو اپنی حکومت اور ریاست تک محدود نہ رہے بلکہ ظلم و ستم کی آگ کو مزید پھیلا دیا ہے اور اہل بیتؑ سے

ان کا حق اور فدک غضب کر لیا ہے اور ان کو اپنے حملے کا نشانہ بنا کر آتش ظلم میں جھونک دیا ہے۔

”وتستجیبون لهتاف الشیطان الغوی“

(اور تم گمراہ و مردود شیطان کی آواز پر لبیک کہتے ہو)

یعنی جب شیطان تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے تو تم فوراً لبیک کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے ہو اور اس کے پیچھے چل پڑتے ہو۔

حضرت زہراء (ع) سقیفہ میں رونما ہونے والے حادثے کو، شیطان کی دعوت کا عملی جواب جانتی ہیں کیونکہ اسلام میں امامت و خلافت یعنی امت کی رہبری کے مسئلے میں انحراف اور کجی، سقیفہ کی سازش کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔

”واطفاء انوار الدین الجلی“

(اور تم نے صاف و شفاف دین مقدس اسلام کی روشن قندیلوں کو خاموش کرنے کی کوششیں کیں)
یعنی تم نے امامت و رہبری کے راستے میں انحراف کی بنیاد رکھی اور تم اس انحراف کے واسطے عملی طور پر یہ چاہتے تھے کہ خداوند کے نور، امامت، کو بجھا دیں۔

”واہماد سنن النبی الصفی“

(اور تم نے خدا کے برگزیدہ پیغمبر، محمد مصطفیٰ (ص) کے آثار اور سنت کو مٹانا شروع کر دیا ہے)
”اہماد“ یعنی بجھانا، مٹانا، مطلب یہ ہے کہ جب تم مسند خلافت پر آ بیٹھے تو درحقیقت اسی دن سے تم نے، اسلام کے اعلیٰ اقدار اور رسول خدا (ص) کے آثار کو مٹانا شروع کر دیا ہے تاکہ اسلام کے روشن نور کی روشنی میں کہیں تمہارے مکروہ چہرے پہچانے نہ جائیں اور تمہارے جرائم کی حقیقت حال سے لوگ بے خبری رہیں۔

مکرو فریب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ،

”تشریبون حسوا فی ارتقاء“

(۔ خلافت کے مفادات سے۔ تم بڑے آرام سے اور آہستہ آہستہ لطف اٹھا رہے ہو)

”ارتقاء“ کا لفظ باب افتعال کا مصدر ہے اور اس کی اصل ”رَغَوْرَغَوِیَارُ غَو“ ہے۔ دودھ کے جھاگ کو ”رغو“ کہا جاتا ہے۔ یہ مکر و فریب کے لئے ایک مثال ہے کیونکہ جب مکھن نکالنے کے لئے مشکیزہ وغیرہ میں دہی ڈال کر اس کو ہلایا جاتا ہے تو کچھ دیر بعد دہی کے اوپر جھاگ ابھر آتی ہے جو بعد میں مکھن کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ جب کوئی دھوکہ باز شخص کسی کو دھوکہ دینا چاہے تو اس سے کہتا ہے کہ: بھائی تیرے لئے تو یہ مکھن نقصان دہ ہے، لہذا میں پہلے اس جھاگ کو پی لیتا ہوں، آپ بعد میں خالص سی پیئیں، بس جو نہی گلاس اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو وہ آہستہ آہستہ پوری سی پی جاتا ہے۔ ”حسو“ اس پینے والی چیز کو کہا جاتا ہے جسے آہستہ آہستہ اور مزے سے پیا جائے۔

یہاں پر آپ تشبیہ سے استفادہ فرماتی ہیں۔ عربی زبان میں تشبیہات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ”تشریون“ یعنی تم خلافت کے مفادات سے لطف اندوز ہوتے ہو۔ ”حسوا“ یعنی آہستہ آہستہ اس کے تمام فوائد اور ثمرات سے استفادہ کر رہے ہو۔ ”فی ارتقاء“ یعنی اس بہانے کے ساتھ کہ ہم صرف ظاہری جھاگ سے اپنی پیاس بجھانا چاہتے ہیں۔ یعنی ہم مسلمانوں کو درپیش مشکلات اور فتنوں سے نجات دلانا چاہتے ہیں! اس قسم کی تشبیہ اور کنایہ سے حضرت زہراء (ع) کا مطلب یہ ہے کہ تم اسلام، اسلامی نظام کے تحفظ اور پاسبانی کے بہانے سے خلافت پر قابض ہوئے ہو۔ اسلام کی خدمت کے دعویدار بنے ہوئے ہو اور ایسے الفاظ کی آڑ میں خلافت کے مقام اور اختیارات سے غلط فائدہ اٹھا رہے ہو اور ہر خشک و تر کی طرف دست درازی کرنے لگے ہو۔ اس طرح اسلام کی خدمت کے بجائے خلافت سے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے کافی استفادہ کر رہے ہو اور تمام اسلامی اقدار کو اپنے اقتدار کے تحفظ اور بقاء پر قربان کر رہے ہو۔

دوستی کے انداز میں دشمنی،

”وتمشون لاهله وولده فی الخمرۃ والضراء“

(درختوں اور زمین کی پستی و بلندی کی آڑ میں۔ یعنی خفیہ اور آشکار طور پر۔ اہل بیت (ع) کے خلاف قدم اٹھا رہے ہو)

دشمن دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک دشمن تو وہ ہوتا ہے جو علی الاعلان دشمنی اور مقابلہ کرتا ہے، دوسرا دشمن جو زیادہ خطرناک ہوتا ہے وہ ہے جو خفیہ طریقے سے اور چھپ کر وار کرتا ہے اور کبھی یہ دوست کی شکل میں آکر موقع پاتے ہی کاری ضرب لگاتا ہے ایسے افراد انسان کے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ ابو بکر یہ نہیں سمجھتا تھا کہ میں اہل بیتؑ کا دشمن ہوں اور ان کی مخالفت کرنا چاہتا ہوں بلکہ بظاہر باتوں کی حد تک وہ حضرت زہراء (ع) کی تعظیم و تکریم کرتا تھا، لیکن موقع پاتے ہی کاری ضرب لگا دیتا تھا۔

”وتمشون“ تم قدم اٹھاتے ہو، ”لاھلہ وولده“ پیغمبر اسلام (س) کے اہل بیتؑ کے خلاف، لیکن خفیہ اور در پردہ۔ تم سامنے آکر اپنی دشمنی کا اظہار نہیں کرتے تاکہ کوئی یہ نہ پوچھے کہ تم پیغمبر (س) کی اکلوتی بیٹی کے مخالف کیوں ہو؟ بلکہ بظاہر تم کبھی دلسوزی اور عقیدت مندی کا اظہار بھی کیا کرتے ہو لیکن حالات کو مناسب پاتے ہیں خنجر گھونپ دیتے ہو۔

”تمشون لاھلہ وولده فی الخمرۃ“ خمرہ پردے اور گھنی جھاڑی کو کہا جاتا ہے، دشمن جب آشکار اور سامنے نہ ہو بلکہ اس طرح جھاڑیوں اور گھنے درختوں کے پیچھے چھپا ہوا ہو کہ انسان متوجہ ہی نہ ہو سکے اور اس طرح وہ اپنے رقیب کو غافل کر کے اچانک اس پر حملہ کر دے، تو اس قسم کے حملے کو خمرہ کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کے ذریعے آپؐ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ تم گھنی جھاڑیوں کی آڑ میں چھپ کر موقع کی تلاش میں رہتے ہو اور موقع پاتے ہی اہل بیتؑ کو اپنے حملے اور ظلم کا نشانہ بناتے ہو۔ لفظ ”ضراء“ کے دو معنی ہیں ایک گھنے درخت اور دوسرے کھڈا اور گرھا۔ دشمن حملے کے دوران کبھی درختوں، جنگلوں اور جھاڑیوں سے استفادہ کرتا ہے تو کبھی زمین کے نشیب و فراز سے حملے کے لئے فائدہ اٹھاتا ہے اور پست و گہرے کھڈے اور گرھوں میں خود کو چھپا لیتا ہے۔ پس اگر ضراء پہلے معنی میں استعمال ہوا ہو تو یہ لفظ خمرہ کے لئے عطف تفسیری (۱۱) ہو گا لیکن اگر دوسرا معنی مقصود ہو تو حملے کا مطلب یہ ہو گا کہ تم کبھی گھنے درختوں اور جھاڑیوں میں چھپ کر اور کبھی زمین دوز مورچوں میں گھس کر اہل بیتؑ کے خلاف مصروف

۱۔ وہ کلمہ یا جملہ جو کسی سابقہ جملے کی توضیح یا تشریح کے لئے لایا جائے، عطف تفسیری کہلاتا ہے۔

پیکار ہو (۲) پھر آپ جو ضرر ہیں لگاتے ہیں وہ کس قدر خطرناک ہوں گی؟ جس کی ضرب انسان کے بدن میں چاقو اور تلوار سے زیادہ کاری اور خنجر سے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اسی لئے آپ فرماتی ہیں کہ:

سختیوں پر صبر

”و نصبر منکم علی مثل حذ المدی“

(اور ہم مجبور ہیں کہ تمہارے خنجر کی کاٹ کا صبر سے مقابلہ کریں)

”مدی“ مدیہ کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں خنجر، ”حز“ کاٹنے اور قطع کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح خنجر جسم کو کاٹتا ہے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اسی طرح تمہاری طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم بھی ہمارے دل و جگر کو پارہ پارہ کر رہے ہیں، لیکن ہم صبر کر رہے ہیں تاکہ اسلام محفوظ رہے اور اسلام دشمن عناصر کو مفاد پرستی کا موقع نہ ملے۔

”نصبر منکم“ تمہارے ظلم و ستم پر ہم صبر کر رہے ہیں۔ ”علی حذ المدی“ ایسا صبر جو خنجر کی طرح کاٹتا ہے۔

”و وخز السنان فی الحشاء“

(اور جس طرح نیزہ کی انی دل و جگر میں چھبادی گئی ہو)

”وخز“ سوئی یا نیزہ کا بدن میں چھو دینا۔ ”حشاء، حشاء“ اندرون بدن، سینہ اور پسلیوں کے درمیان موجود اعضائے بدن کو کہتے ہیں۔

ہم تمہارے ظلم و ستم پر اس شخص کی طرح صبر کر رہے ہیں جس کے دل میں نیزہ کی انی چھودی گئی

۱۔ ٹمرہ، پردہ، کینہ و عداوت، مستی اور گھنی جھاڑیوں کے معانی میں استعمال ہوتا ہے اور مزاء کا ایک معنی ”وسیع کھلا میدان“ بھی ہے۔ لہذا شاید حضرت زہراءؑ کا مقصد یہ ہو کہ تم نے ہماری دشمنی اور عداوت اور حکومت کی مستی کی وجہ سے ہمارے خلاف وسیع پیچیدہ اور خفیہ سازش کا جھال بچھایا ہے اور اسی سازش پر عمل کرتے ہوئے تم کبھی آشکار اور کبھی خفیہ طور پر ہمارے خلاف میدان میں آتے ہو۔ خلافت اور فدک کا غصب اور اسی طرح پھر دوسرے مظالم اس سازش کا ٹھوس ثبوت ہیں۔

ہو، اگر ہم تمہاری طرح جاہ طلب اور صرف حکومت کی فکر میں ہوتے اور اسلام کے عظیم تر مفاد کا خیال نہ رکھتے تو شاید تمہارے ساتھ کوئی دوسرا رویہ اختیار کیا جاتا۔

فدک، میراث پیغمبر (ص)

”وانتم الآن تزعمون ان لارث لنا، افحكم الجاهلية تبغون“

(اور اب تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم پیغمبر (ص) سے ارث نہیں پاتے،

کیا تم نے جاہلیت کے قانون کو اختیار کر رکھا ہے؟)

تمہارے مظالم میں سے ایک ظلم یہ ہے کہ کہتے ہو کہ ہم - خاندان نبوت - پیغمبر (ص) سے ارث نہیں پاتے اور پیغمبر (ص) کی طرف جھوٹی نسبت دیتے ہو کہ آپ (ص) نے فرمایا: ”نحن معاشر الانبياء لانورث وما تركناه صدقة“ (یعنی، ہم انبیاء اپنے بعد ارث نہیں چھوڑتے، جو مال ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے!)۔ حقیقت میں یہ حدیث ابو بکر کی گھڑی ہوئی ہے تاکہ اسی بہانے سے فدک کو حضرت زہراء (ع) سے چھینا جائے۔ اس بارے میں عائشہ، حفصہ اور اوس بن حدثان نے بھی ابو بکر کی حمایت میں یہ گواہی دی کہ ہم نے یہ جملہ خود رسول خدا (ص) سے سنا ہے۔ ان کی اسی ملی بھگت اور غلط نسبت کی وجہ سے حضرت فاطمہ (ع) فرماتی ہیں کہ: ”وانتم الآن تزعمون“ یعنی تم ابھی یہ گمان کر رہے ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ جس کی حقانیت پر تمہیں یقین بھی نہیں۔

”زعم“ گمان کو کہتے ہیں یعنی کسی بات کے صحیح ہونے میں انسان کو شک ہو اور اس کی حقانیت پر یقین نہ رکھتا ہو بلکہ شک اور تردد کی حالت میں کوئی بات کہہ دے، یعنی زبان سے ایسی بات کہہ دے جسے دل جھٹلائے یا قبول نہ کرے (۱)۔

تاریخ نے یہ بات نقل کی ہے کہ جب ابو بکر کے مرنے کا وقت آیا اور لوگ اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے تو اس نے فدک غضب کرنے پر انتہائی پشیمانی کا اظہار کیا اور لوگوں سے کہا کہ اپنی بیعت واپس لے لو، اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ... خود ابو بکر بھی اس جعلی حدیث کی صحت کے قائل نہ تھا دوسری بات یہ ہے کہ ابو بکر فدک کے بارے میں حضرت زہراء (ع) کے استدلال اور احتجاج ==

”ان لا ارث لنا“ گمان کرتے ہو کہ ہم پنمیر (م) سے ارث نہیں پاتے! ”افحكم الجاهلية تبغون“ کیا جاہلیت کے قوانین کو اپنے لئے انتخاب کرتے ہو؟ جاہلیت کے دور میں لڑکیوں کو ارث سے محروم رکھتے تھے، میں نے کسی زمانے میں کہیں پڑھا تھا کہ برطانیہ میں بھی لڑکیوں کو ارث سے محروم رکھتے تھے اور جائیداد لڑکے کے نام منتقل ہوتی تھی تاکہ لڑکا لارڈ بن جائے، کیونکہ اگر دولت تقسیم کی جاتی تو لارڈ خاندانوں کے لاڈلے مطلوبہ جائیداد نہ ہونے کی بنا پر لارڈ نہیں بن سکتے تھے، بعض قبائلی خاندانوں میں بھی یہ رسم تھی کہ باپ کے باغات سے لڑکی کو ارث نہیں ملتا تھا، دور جاہلیت میں بھی یہی قانون نافذ تھا۔

”ومن احسن من الله حكما لقوم يوقنون (۱) افلا تعلمون“

(صاحبان یقین کے نزدیک خدا سے بہتر کون حکم کرتا ہے کیا تم نہیں جانتے ہو)

خداوند بزرگ در تر نے قرآن میں یہ حکم دیا ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں ارث پاتے ہیں یعنی تمام اولاد ارث کے مالک ہوں گے، یہ ایک قانون کلی ہے قرآن نے کسی بھی جگہ پر یہ نہیں فرمایا کہ لڑکی باپ کے ترکہ سے محروم ہوگی یا یہ کہ قانون ارث سے انبیاء مستثنیٰ ہیں، بلکہ بعض آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دوسرے لوگوں کی طرح انبیاء بھی ارث چھوڑ جاتے ہیں۔ اور ارث لیتے بھی ہیں۔

”بلى قد تجلى لكم كالشمس الضاحية، انى ابنته“

(ہاں! تم پر آفتاب عالیشان کی طرح روشن ہے کہ میں ہی پنمیر خدا (ص) کی بیٹی ہوں)

پس کیوں مجھے ارث سے محروم کر رہے ہو؟ تاریخ میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کہ ابو بکر نے ازواج سمیت دوسرے ورثہ کو پنمیر (م) کے ترکہ سے محروم کیا ہو، اسی لئے آپؐ فرماتی ہیں کہ ابو بکر کا یہ اقدام قرآنی آیات کی سراسر خلاف ورزی ہے کیونکہ آیات ارث کے عموم میں لڑکی بھی شامل ہے اور

== سے قانع ہو گیا اور اس بات پہ آمادہ ہو گیا کہ فدک کو ارث کے عنوان سے حضرت زہراءؑ کو واپس کر دیا جائے لیکن عمر نے حالات کو بھانپ لیا اور آپؐ کے حق میں فیصلہ دینے سے ابو بکر کو روک دیا۔

اسی عبارت مختصر فرق کے ساتھ سورۃ مائدہ کی آیت ۵۰/ سے ماخوذ ہے۔

سب جانتے ہیں کہ میں پیغمبر (م) کی بیٹی ہوں (۱)۔

”ایہا المسلمون! الغلب علی ارثیہ؟“

(اے مسلمانو! کیا میں اپنے ارث کے مسئلے میں بھی مغلوب ہو جاؤں؟)

”علی ارثیہ“ میں جو ”ہاء“ ہے وہ ”ہاء“ سکت ہے (۲) اور قرآن کریم میں بھی اسی ہاء سکت کے ساتھ ”کتابیہ (۳)“ اور ”حسابیہ (۴)“ کے الفاظ آئے ہیں کہ جن میں کتاب اور حساب پر ہاء سکت کا الحاق ہوا ہے (۵)۔

”یا بن ابی قحافة! افسی کتاب اللہ ان قرث اباک ولا ارث ابی؟“

(اے ابی قحاذ کے بیٹے! ابو بکر سے خطاب ہے۔ کیا کتاب خدا میں یہ بات ہے کہ تم تو اپنے باپ سے ارث لے سکتے

ہو اور میں اپنے باپ کا ارث نہیں لے سکتی؟) (۶)

۱۔ جناب باقر مقدسی نے اپنی فذک نامی کتاب میں، سید حیدر آمدی کے کشفول سے، امام جعفر صادقؑ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ: امام جعفر صادقؑ نے مفضل بن عمر سے فرمایا کہ: جب ابو بکر کی بیعت ہو گئی تو عمر نے اس سے کہا کہ علیؑ اور اہل بیت رسولؐ سے، خمس، فنی اور فذک کو چھین لے، کیونکہ جب لوگ یہ دیکھیں گے کہ علیؑ اور اہل بیتؑ خالی ہاتھ ہیں تو ان کو چھوڑ دیں گے اور تمہاری طرف آئیں گے! ابو بکر نے ایسا ہی کیا اور اہل بیتؑ کو اپنے حق سے محروم کر دیا!!! (فذک، دارالعلم للطباعة ص ۱۷۵)۔

۲۔ سکت، سکوت سے ماخوذ ہے اور اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جب کسی لفظ کو اپنے بعد والے لفظ سے جدا کرنا چاہیں تو پہلے لفظ کے آخر میں ہاء سکت لگاتے ہیں یہ بعض جگہوں میں لازم ہے اور بعض مقام پر جائز ہے۔ اگر لفظ کے آخر میں اضافت کا ایک حرف (مثلاً یا) ہو، جیسا کہ اس خطبے کے متن میں ”ارثیہ“ کا لفظ آیا ہے تو وہاں ہاء سکت کا اضافہ جائز ہے لازم نہیں۔

۳۔ سورۃ حاقہ / ۱۹ - ۲۵۔

۴۔ سورۃ حاقہ / ۲۰ - ۲۶۔

۵۔ حضرت زہراءؑ، مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کو بیدار کرنا چاہتی تھیں اسی لئے فذک کو ارث کے عنوان سے پیش کیا تاکہ رائے عامہ کے سامنے ابو بکر کے غلط افکار کی قلعی کھل جائے، مگر نہ بہت ساری روایات کے مطابق، رسول خداؐ نے اپنی زندگی میں ہی فذک کو بطور بخشش اور حبہ اپنی اکلوتی بیٹی کو سنبھال دیا تھا۔

۶۔ اس کلام کا پہلا حصہ بھی تمام مسلمانوں سے مربوط ہے کما تنے بڑے ظلم کو دیکھتے ہوئے بھی خاموش تماشائی بنے رہے، جبکہ اس جملہ میں ابو بکر کو مخاطب قرار دیا ہے اور اس کے بعد والے جملے میں پھر مسلمانوں کو مخاطب کرتی ہیں کہ: قرآنی احکامات کی تحریف کی جا رہی ہے اور تم خاموش بیٹھے ہو!!!

اگر قرآن معیار ہے تو قرآن نے ارث کے مسئلے میں پیغمبر (ص) اور دوسرے افراد میں کوئی فرق نہیں رکھا ہے۔

”لقد جنت شیناً فریاً۔ علی اللہ ورسولہ۔“

(بیشک تم نے۔ خدا و پیغمبر (ص) کی طرف۔ ایک آشکار جھوٹی نسبت دی ہے)

”فری“ واضح اور آشکارا جھوٹ کو کہا جاتا ہے اور یہ ”فری“ سے مشتق ہے اور ”فری“ تہمت اور جھوٹی نسبت دینے کو کہتے ہیں۔

ابوبکر اور اس کے ہمنواؤں نے بھی پیغمبر (ص) کی طرف یہ جھوٹی نسبت دی تھی کہ آپ (ص) نے فرمایا کہ: ہم انبیاء ارث نہیں چھوڑتے، حالانکہ آپ (ص) نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی! بنیادی طور پر یہ بات قرآنی آیات کی تصریح کے بالکل برخلاف ہے چونکہ ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح انبیاء بھی ارث چھوڑتے ہیں۔

”افعلی عمد ترکتم کتاب اللہ ونبذتموہ وراء ظہورکم“

(کیا جان بوجھ کر کتاب خدا کو چھوڑ چکے ہو اور اسے پس پشت ڈال دیا ہے؟)

قرآن صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ بیٹی باپ سے ارث پاتی ہے اور ارث چھوڑنے اور لینے میں انبیاء اور دوسرے لوگوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ (قرآن کی اس صریح دلالت کے مقابلے میں) کیا تم جان بوجھ کر پیغمبر (ص) کی طرف منسوب کر کے جعلی حدیث بنا رہے ہو؟ یا اپنی جہالت کی وجہ سے قرآن کو نظر انداز کر کے ایک من گھڑت روایت کو اپنی سیاست کا محور قرار دے رہے ہو؟!

آیات ارث اور انبیاء (ع):

ابوبکر اور دوسروں کی گھڑی ہوئی جعلی حدیث کے مقابلے میں حضرت زہراء (ع) قرآن کی چند آیات سے استدلال فرماتی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء بھی دوسرے انسانوں کی طرح اپنے بعد ارث چھوڑتے ہیں، لہذا آپ فرماتی ہیں کہ:

(۱) ”اذ یقول، وورث سلیمان داود (۱)“

(جہاں خداوند فرماتا ہے: اور سلیمان نے داود سے ارث پایا)

(۲) ”وقال فیما اقتص من خبر یحیی بن زکریا“

(اور۔ حضرت۔ یحیی بن زکریا کی داستان کے ضمن میں خدا فرماتا ہے)

”اذ قال، فہب لی من لدنک ولیاً یرثنی ویرث من آل یعقوب (۲)“

(جب زکریا نے خدا سے التجاء کی کہ۔ پروردگارا!۔ اپنی طرف سے مجھے ایک جانشین عنایت فرما جو مجھ سے

اور یعقوب کے خاندان سے ارث پائے)

”ولی“ یعنی وہ شخص جو کسی کے پیچھے آئے ”ولی میت“ کا معنی بھی یہی ہے کہ وہ شخص جو میت کے بعد آئے۔ اور اس کے باقیماندہ کاموں کو پورا کرے۔ ”ولایت“ اور ”تلو“ دونوں ایک ہی مادہ سے ہیں ”تلو“ یعنی وہ چیز جو کسی کے ساتھ رہے، ”والی“ کو اس لئے والی کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور ان کے اندر موجود کمی کو پورا کرتا ہے، اگر آقا اور بندے، دونوں کو اصطلاح اور بعض روایات میں ”مولی“ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، ولایت کے لفظ کا اصلی معنی ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے۔ اولاد کو اسی لئے ”ولی“ کہتے ہیں کہ وہ باپ کے بعد اس کی ذمہ داریوں کو نبھاتی ہیں (۳)۔

مذکورہ آیت میں حضرت زکریا علیہ السلام فرماتے ہیں کہ: ”فہب لی من لدنک ولیاً یرثنی ویرث من آل یعقوب“ پروردگارا! مجھے اپنی طرف سے ایک ولی عنایت فرما، جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے۔

حضرت زہراء (ع) نے یہ دو آیات ذکر فرمائیں، چونکہ یہ آیتیں، انبیاء کے ارث چھوڑنے پر دلالت رکھتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ قانون ارث میں انبیاء بھی شامل ہیں، اس کے بعد تین اور آیتیں جو شاہد کے

۱۔ سورہ نمل / ۱۶۔ ۲۔ سورہ مریم / ۵-۶۔

۳۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہونا، ضروریات کو پورا کرنا اور مرنے کے بعد کسی کامیت کے حقوق اور فرائض کو نبھانا، یہ عین چیزیں ولایت اور ولی کے اجزائے ترکیبی میں سے ہیں۔

طور پر ذکر فرماتی ہیں، قانون ارث کی عمومیت پر دلالت کرتی ہیں کہ رشتہ دار ایک دوسرے سے ارث پاتے ہیں اور قانون ارث میں کوئی قید اور تخصیص موجود نہیں ہے۔ آپ کا مقصد یہ ہے کہ ان آیتوں کے ذریعے ابو بکر اور دوسرے جعلی حدیثیں بنانے والوں کو رد کریں اور ان کی جھوٹ کی قلعی کھول دیں۔

(۳) ”وقال، واولوا الارحام بعضهم اولیٰ ببعض فی کتاب اللہ (۱)“

(اور خداوند ارشاد فرماتے ہیں کہ: خدا کی کتاب کی رو سے بعض رشتہ دار دوسرے بعض پر مقدم اور اولیٰ ہیں) یہ آیت بھی ارث کے قانون کلی پر دلالت رکھتی ہے۔ حضرت زہراء (ع) اس آیت کے عموم سے استدلال فرماتی ہیں کہ: قانون ارث میں پیغمبر اسلام (س) اور دوسروں میں کوئی فرق نہیں ہے، لیکن یہ افراد عموم قرآن سے متناقض روایت سے کیوں استدلال کرتے ہیں؟

(۴) ”وقال، یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین (۲)“

(اور ارشاد ربانی ہے کہ:

تمہاری اولاد کے بارے میں خدا تمہیں یہ وصیت کرتا ہے کہ بیٹے کو دو بیٹیوں کے برابر حصہ دیا جائے) یہ آیت شریفہ بھی عام طور پر ارث میں بیٹے اور بیٹیوں کے حصے کو مقرر کرتی ہے۔

(۵) ”وقال، ان ترک خیراً الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقاً علی المتقین (۳)“

(اور خداوند فرماتا ہے کہ:-

اگر کسی کے مرنے کا وقت قریب آجائے۔ اور وہ کوئی مال چھوڑ کے جا رہا ہو تو اس کو چاہئے کہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں نیکی۔ کچھ مال انہیں دینے کی وصیت کرے، یہ پرہیزگاروں پر ایک ذمہ داری ہے (۴)“

۱۔ سورۃ انفال / ۷۵۔ ۲۔ سورۃ نساء / ۱۱۔ ۳۔ سورۃ بقرہ / ۱۸۰۔

۴۔ اس آیت میں میت کے اموال کو خیر سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے مال کے بارے میں والدین اور تمام رشتہ داروں کو اصولی طور پر، کسی حد تک ذی حق تسلیم کیا گیا ہے، اگرچہ بعض مفسرین اسے آیات ارث کے ذریعے فسوخ قرار دیتے ہیں، مگر اس آیت کریمہ کی بنیاد پر حضرت زہراءؑ اموال پیغمبرؐ کی بہ نسبت خود کو حقدار سمجھتی ہیں کیونکہ آپؐ یقیناً پیغمبرؐ کی رشتہ دار۔ اور اکلوقی بیٹی تھیں۔ چاہے وہ ارث کے عنوان سے ہو یا کسی اور عنوان سے۔

”و زعمتم ان لا حظوة لى، ولا ارث من ابى ولا رحم بيننا (۱)“

(اور تم نے یہ خیال کیا کہ:۔ پیغمبر (ص) کے ترکہ میں۔ میرا کوئی حق نہیں، مجھے اپنے باپ سے ارث نہیں ملے گا

اور ہمارے درمیان کوئی رشتہ داری ہی نہیں ہے؟)

یہاں ایک ادبی نکتہ عرض کر دوں کہ عربی زبان میں کبھی مضاعف (۲) اور ناقص (۳) ایک دوسرے کی جگہ پر استعمال ہوتے ہیں۔ بطور نمونہ قرآن کی یہ آیت: ”ما انزلنا عليك القرآن لتشتق (۴)“ میں ”لتشتق“۔ جو کہ ناقص ہے۔ اصل میں لتشق تھا۔ یعنی اصل میں مضاعف تھا اور مضاعف کی جگہ پر ناقص ذکر ہوا ہے۔ حضرت زہراء (ع) کے کلام میں بھی ”حظوة“ اصل میں ”حظ“ تھا یعنی ناقص مضاعف کی جگہ پر آیا ہے البتہ دونوں حصہ اور فائدہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

یہاں آپؐ فرماتی ہیں کہ: دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی میرے پدر بزرگوار کا ارث ملنا چاہئے کیونکہ قانون ارث کے عموم میں، میں بھی شامل ہوں، مجھے اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، لیکن تم یہ خیال کرتے ہو کہ قانون ارث تو تمہارے لئے ہے اور ہم اس میں شامل نہیں ہیں! لہذا مجھے یہ حق نہیں کہ اپنے باپ سے میراث پاؤں۔ گویا ہمارے درمیان کوئی رشتہ داری ہی نہیں ہے!۔

آیات ارث کے سمجھنے میں غلط فہمی کی وجوہات،

(۱) ”افخضكم الله بآية اخرج ابى۔ محمد (ص) منها؟“

(کیا خدا نے کسی آیت کو تمہارے ساتھ مخصوص کر دیا ہے اور میرے پدر۔ بزرگوار محمد (ص)۔ کو اس سے خارج کیا ہے؟)

۱۔ ممکن ہے کہ:۔ یہاں آپؐ گزشتہ عین آیتوں کی تطبیق کرنا چاہتی ہوں اس طرح کہ۔ ”لا حظوة لى“ کا جملہ آیت للذكر مثل حظ الانثيين کی طرف اور ”ولا ارث من ابى“ کا جملہ آیت ”ان ترک خیراً...“ کی طرف اور ”ولا رحم بیننا“ کا جملہ آیت ”اولوا الارحام...“ کی طرف اشارہ ہو۔

۲۔ مضاعف اس لفظ کو کہا جاتا ہے جس کا دوسرا اور تیسرا حرف ایک ہی جنس سے ہو جیسے ”مدد“ جو ادا غام ہو کر ”مد“ بن گیا ہے۔
۳۔ ناقص اس کلمہ کا نام ہے کہ جس کے لام الفعل یعنی آخری حرف علت ہو یعنی واو، یاء اور الف میں سے ایک ہو جیسے رى۔

۴۔ سورہ طہ / ۲

(۲) ”ام هل تقولون ان اهل الملتين لا يتوارثان؟“

(یا یہ کہتے ہو کہ: دو دین و مذہب کے ماننے والے ایک دوسرے سے ارث نہیں پاتے؟)

جب حضرت زہراء (ع) ان آیات کو لوگوں کے لئے بیان کرنے کے بعد فرماتی ہیں کہ: یہ آیات صراحت کے ساتھ اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء بھی دوسرے انسانوں کے طرح ارث چھوڑتے تھے اور قانون ارث، ایک عام قانون ہے، اب بتائیں کہ ان آیات کا آپ کیا جواب دیں گے؟ کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ آیات مقصود پر دلالت نہیں کرتیں بلکہ یہ صرف امت کے ساتھ مخصوص ہیں اور خود رسول خدا (ص) خدا کے اس قانون اور حکم سے مستثنیٰ تھے؟ یا یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرا مذہب اور دین، رسول خدا (ص) کے مذہب اور دین سے الگ ہے۔ یعنی کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ نعوذ باللہ میں اسلام سے پھر چکی ہوں اور اسلام سے خارج ہو چکی ہوں تاکہ تم یہ بتا سکو کہ پیغمبر اسلام (ص) تو مسلمان تھے اور کوئی کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا؟ اب تم اس بارے میں کیا جواب دو گے؟

”اولست انا وابی من اهل ملة واحدة“

(کیا میں اور میرا باپ ایک ہی مذہب و ملت سے تعلق نہیں رکھتے؟ اور کیا ہم دونوں مسلمان نہیں ہیں؟۔)

یہ دوسرا فرض مذکورہ فرض کی تشریح ہے کہ مثلاً العیاذ باللہ، آنحضرت (ص) اور حضرت زہراء (ع) ایک مذہب پر ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے درمیان توارث بھی نہ ہو۔

(۳) ”ام انتم اعلم بخصوص القرآن وعمومه من ابی وابن عمی“

(کیا قرآن کے عام اور خاص کے بارے میں

تم میرے والد گرامی (ص) اور چچا زاد علیؑ کے مقابلے میں زیادہ علم رکھتے ہو؟)

اگر وہ یہ دعویٰ کر دیتے کہ آیات ارث ہمیں قبول ہیں کہ رشتہ دار ایک دوسرے سے ارث پاتے ہیں۔ اور یہ بھی قبول ہے کہ آپؐ اور پیغمبر (ص) ایک ہی دین و مذہب کے پیروکار ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ آیات ارث کی تخصیص ہوئی ہے۔ اس کا دائرہ محدود کر دیا گیا ہے کہ۔ انبیاء اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں وہ ارث اور میراث نہیں رکھتے بلکہ جو کچھ چھوڑ کے جاتے ہیں وہ صدقہ ہے، لہذا ان کے اس

دعوے کے جواب میں فرماتی ہیں کہ: تم جو یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ عموم قرآن کی یہاں تخصیص ہوئی ہے تو یہ بتاؤ کہ قرآن کے اسرار و رموز اور عام و خاص کے بارے میں کیا تم میرے والد گرامی رسول خدا (ص) اور چچا زاد علی علیہ السلام سے زیادہ علم و آگاہی رکھتے ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اس شخص کو جانتے ہو لیکن پیغمبر (ص) کے دھی اور بھائی علی (ع) اس سے بے خبر ہیں؟!

ارث کے مسئلے پر اتنی تاکید کیوں؟

فدک کو حضرت زہراء علیہا السلام کبھی "نخلہ" یعنی ہبہ و بخشش کے عنوان سے اور کبھی ارث کے عنوان سے یاد فرماتی ہیں۔ منجملہ اسی خطبے کے اس حصے میں آپ ارث کے مسئلے پر کافی تاکید فرماتی ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے قانون ارث کی عمومیت کو اس طرح ثابت کرنے پر زور دیتی ہیں کہ اس کی عمومیت میں انبیاء بھی شامل ہیں۔ اس مسئلے پر اتنی تاکید اور اس کو اہمیت دینے کے اسباب میں سے اہم ترین اسباب یہ ہو سکتے ہیں:

۱۔ (مقام نبوت کا دفاع): ابوبکر اور دوسرے چند افراد نے ایک جعلی حدیث گھڑ لی اور اس کی نسبت رسول خدا (ص) کی طرف دے دی۔ وہ جعلی حدیث کچھ یوں تھی۔ "ہم انبیاء ارث نہیں چھوڑتے بلکہ جو کچھ ہم چھوڑ کے جاتے ہیں وہ صدقہ ہے۔" چونکہ یہ جعلی حدیث ارث سے مربوط آیات قرآنی کے سراسر خلاف تھی اور پیغمبر اکرم (ص) جیسی عظیم شخصیت کی طرف ایسی حدیث کی نسبت دینا آپ (ص) کے اوپر سراسر ظلم اور نا انصافی تھی۔ لہذا حضرت زہراء (ع) نے آیات قرآنی کے حوالے سے سب سے قبل یہ ثابت کیا کہ یہ حدیث جعلی ہے۔

۲۔ (دشمن کی دلیل کا توڑ): ابوبکر اور عمر فدک کے بارے میں اسی جھوٹی حدیث کا حوالہ دے کر ارث کے مسئلے کو اچھال رہے تھے اور کہتے تھے کہ خود رسول خدا (ص) نے فرمایا کہ ہم ارث نہیں چھوڑتے، بنا بریں فدک تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے اور حضرت زہراء (ع) اس پر کوئی حق نہیں رکھتی ہیں، لہذا آپ نے چاہا کہ خود ان کی اپنی دلیل سے ہی ان کو رسوا کریں، اور آپ فرماتی ہیں کہ کیا تم

قبول کرتے ہو کہ فدک رسول (ص) کے زمانے میں فتنی مسلمین میں شامل نہیں تھا اور رسول خدا (ص) کی ملکیت تھی اور ابھی قرآن کی آیات کے مقابلے میں تم ایک جھوٹی حدیث نقل کر رہے ہو تو جان لو کہ۔ تمہاری یہ باتیں، نص قرآن کے خلاف ہیں اور حقیقت میں تم قرآن اور حق کی راہ سے منحرف ہو چکے ہو اور اپنے سیاسی مفادات کی خاطر، حدیث گھڑنے کے مذموم فعل کے مرتکب ہوئے ہو (۱)۔

ارث سے آپ (ع) کی مراد کیا ہے؟

ارث سے مراد آیات سے تمسک کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی مراد وہی اصطلاحی اراث ہے۔ جو ماں باپ کے مرنے کے بعد انسان کو ملتا ہے۔ لیکن ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اراث کے لفظ سے آپ کا ہدف صرف اصطلاحی اور فقہی کتابوں میں مذکور اراث نہ ہو بلکہ ہر وہ چیز ہو جو ماں باپ کی طرف سے اولاد کو ملتی ہے، چاہے ان کی زندگی میں ہی ہو یا بعد از وفات کے بعد اراث اور ترکہ کے عنوان سے ملتی ہو۔ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ آپ کا مقصد صرف فقہی کتابوں میں مذکور اراث نہیں ہے بلکہ اس سے وسیع تر معنی میں آپ نے اراث کے لفظ کو استعمال کیا ہے اور نحلہ وہبہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس طرح آپ کے کلمات میں جو تضاد دکھائی دیتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس خطبے کی ایک جگہ پر فدک کو وہبہ اور نحلہ کے طور پر اور خطبے کے بعد والے حصے میں اراث کے عنوان سے یاد فرماتی ہیں۔ اس سے بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم اراث کو اپنے وسیع اور کلی مفہوم میں لیں اور یہ کہیں کہ آپ کا مقصد ہر وہ چیز ہے جو ماں باپ کی طرف سے اولاد کو ملتی ہے، چاہے وہ زندگی میں ہو یا ان کی وفات کے بعد، تو اس صورت میں اراث کے معنی میں ”نحلہ“ اور فقہی کتابوں میں مذکور ”اراث“ دونوں شامل ہو جاتے ہیں۔

۱۔ علامہ مجلسیؒ اس سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ”آپؐ نے فدک کے وہبہ ہونے کا دعویٰ فرمایا، آیات قرآن پیش کیں اور حضرت علیؓ اور ام ایمنہؓ نے گواہی دی لیکن ابو بکرؓ نے اسے رد کر دیا، لہذا آپؐ نے اراث کے مسئلہ کو، ضروریات دین میں سے ایک کے عنوان سے پیش کیا اور اس مسئلہ پر قرآنی آیات سے استدلال فرمایا تاکہ ابو بکر کے لئے انکار کے دروازے بند ہو جائیں۔

بحار الانوار۔ طبع قدیم۔ ج ۸ ص ۱۳۰۔

البتہ کچھ شواہد ایسے بھی ہیں جو اس بات کی تائید کرتے ہیں، ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ شیعہ اور سنی دونوں نے نقل کیا ہے کہ جب آیہ ”وَأْتِذَا الْقُرْبَىٰ حَقُّهُ (۱۱)“ (یعنی اے رسول!) قریبی رشتہ داروں کا حق ادا کر دو)، نازل ہوئی تو رسول خدا (س) نے حضرت زہراء (ع) کو بلا کر انہیں فدک عنایت فرمایا (۲)۔

پنجمیر خدا (س) کے اپنی حیات میں فدک، حضرت زہراء (ع) کو بخشنے اور ان کے حوالے کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی لفظ ارث سے مراد وہ ارث نہیں ہے جو ہمارے درمیان مشہور ہے، کیونکہ اگر آپ کا مقصد اصطلاحی ارث ہوتا تو رحلت پنجمیر (س) کے بعد فدک آپ کو مل جاتا، حالانکہ رسول خدا (س) نے اپنی حیات طیبہ میں رحلت سے چند سال پہلے ہی فدک حضرت زہراء کو بخش دیا تھا۔

۲۔ ایک دوسری روایت میں ذکر ہوا کہ: ایک دن امیر المؤمنین علیہ السلام ابو بکر پر وارد ہوئے، ابو بکر مسجد میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ارد گرد مہاجرین و انصار کا ایک گروہ بیٹھا ہوا تھا اس وقت امیر المؤمنین (ع) نے ابو بکر کو مخاطب کر کے فرمایا: ”یا ابابکر! لم منعت فاطمہ میراثہا من رسول اللہ وقد ملکته فی حیاة رسول اللہ“ (۱) (اے ابو بکر! فاطمہ زہراء (ع) کو پنجمیر (س) کی میراث سے کیوں روکا ہے حالانکہ فاطمہ (ع) پنجمیر خدا (س) کی زندگی میں ہی اس کی مالک تھیں) یہاں حضرت علی (ع) ایک ہی عبارت اور جملہ میں لفظ ارث کو استعمال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پنجمیر خدا (س) کی زندگی میں ہی حضرت زہراء (ع) فدک کی مالک تھیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی (ع) کے کلام میں ارث سے مراد صرف وہ ارث نہیں ہے جو ہم سمجھتے ہیں۔ کہ جو ماں باپ کے مرنے کے بعد اولاد کو ملتا ہے بلکہ یہ لفظ اس سے کہیں وسیع تر معنی رکھتا ہے اور والدین کی زندگی میں دی جانے والی چیزوں کو بھی ارث کہا جاتا ہے۔ اگر آپ کا مقصد اصطلاحی ارث ہی ہوتا تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ رحلت پنجمیر (س) کے بعد فدک حضرت زہراء (ع) کو ملے، حالانکہ حضرت علی (ع) فرماتے ہیں کہ: ”قد ملکته فی حیاة رسول

۱۔ سورۃ اسراء (بنی اسرائیل) ۲۶/۱۔

۲۔ مزید اطلاع کے لئے ”دراسات فی ولایۃ الفقیہ وفقہ الدولۃ الاسلامیہ“ ج ۲ ص ۳۲۹ کے بعد کے صفحات کی طرف رجوع کریں۔

۳۔ الاحتجاج ج ۱ ص ۲۳۷۔

اللہ یعنی پیغمبر (س) کی حیات طیبہ ہی میں حضرت زہراء (ع) فدک کی مالک تھیں۔

۳۔ تاریخ گواہ ہے کہ فدک کے علاقے میں حضرت زہراء (ع) کی طرف سے چند مزدور اور کاشتکار متعین تھے، جب ابو بکر نے آپ سے فدک چھیننے کا فیصلہ کیا تو اس نے اپنے چند آدمیوں کو بھیجا تاکہ وہ حضرت زہراء (ع) کے کاشتکاروں کو وہاں سے نکال دیں!

تاریخ کی اس گواہی سے۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اکرم (س) کی وفات سے پہلے ہی فدک حضرت فاطمہ زہراء (ع) کے قبضے میں تھا، ایسی بات نہیں تھی کہ رسول خدا (س) کی رحلت کے بعد آپ کو فدک ملا ہو (۱)۔

ان شواہد اور قرائن کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ خطبے میں موجود ارث کے لفظ سے اصطلاحی ارث مراد نہیں ہے جو باپ کے انتقال کے بعد اولاد کو ملتا ہے اس سے ہر وہ چیز مقصود ہے جو والدین کی جانب سے اولاد کو ملتی ہے، چاہے وہ ان کی زندگی میں اولاد کو ملے یا ان کے مرنے کے بعد۔ اس مطلب پر اہل عرف کا روزہ مرہ کا استعمال بھی شاہد ہے مطلب واضح ہونے کیلئے ہم ایک مثال دیتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب کو ذہانت اور صلاحیت اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہے یا یہ کہ شجاعت اور دلیری اس کو اپنے باپ سے میراث میں ملی ہے تو ان دو مثالوں سے یہ مراد نہیں ہے کہ باپ مر گیا ہو اور بیٹے کو ذہانت، صلاحیت اور شجاعت ترکہ میں ملی ہو، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اگرچہ اس کا باپ زندہ ہے لیکن اس کو باپ کا ہوش اور اس کی صلاحیت، میراث میں ملی ہے، یعنی باپ کے نطفے میں جو

۱۔ ممکن ہے کوئی یہ اعتراض کرے کہ حضرت زہراء کی طرف سے جو مزدور اور کاشتکار وہاں متعین تھے شاید وہ پیغمبر کی رحلت کے بعد آپ نے متعین فرمائے ہوں۔ یعنی رحلت پیغمبر کے فوراً بعد آپ نے اپنے مزدور بھیج کر قبضہ کیا ہو اور اپنی ملکیت میں شامل فرما لیا ہو، اس طرح خطبے میں ارث سے مراد اصطلاحی ارث ہو تو اس میں کیا اعتراض ہے؟

اس اعتراض کے جواب میں یہ کہنا چاہئے کہ پیغمبر اکرم کی رحلت کے فوراً بعد فدک غصب کیا گیا ہے اور یہ بعید نظر آتا ہے کہ حضرت زہراء نے ان بحرانی دور اور مصیبت کے ایام میں، فدک کے وسیع علاقے کے لئے کاشتکار پیدا کر کے وہاں بھیجے ہوں۔ اس کے علاوہ شیعہ سنی روایات اس بات پر تصریح کرتی ہیں کہ رحمۃ للعالمین نے اپنی زندگی میں ہی فدک حضرت زہراء کو بخش دیا تھا اور آپ نے اپنے بابا کی زندگی میں ہی فدک پر قبضہ کر کے وہاں اپنی طرف سے نمائندے اور کاشتکار متعین فرمائے تھے۔

سلول "Cellule" تھے وہ اس بات کا سبب بنے ہیں کہ باپ کی صلاحیتیں بیٹے میں منتقل ہو جائیں۔ ان مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہر اس چیز کو ارث کہا جاتا ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہو جائے، خواہ وہ پہلی نسل کی زندگی میں ہی کیوں نہ ہو (۱)۔

حضرت زہراء (ع) کی ابوبکر کو وارننگ،
حضرت زہراء (ع)۔ ابوبکر کو اس خیانت کے انجام بد سے خبردار کرتے ہوئے۔ خطبے کو آگے بڑھاتی ہیں کہ:

”فدونکھا مخطومة مرحولة تلاقک يوم حشرک“
(پس۔ اے ابوبکر۔ فدک کی اس ادٹنی۔ کو لے لو، حالانکہ اس کی نکیل تمہارے ہاتھ میں ہے
اور اس پر کجاہ کس دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ۔ تم سے قیامت کے دن ملاقات کرے)

۱۔ آیت اللہ شہید صدرؒ اپنی ”فدک“ نامی کتاب میں فرماتے ہیں کہ: میراث سے مراد وہی اصطلاحی میراث ہے اور اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ دوسرے علماء کی طرح یہ کہیں کہ آپؐ نے پہلے فدک کو نخلہ یا ہبہ کے عنوان سے یاد فرمایا اور بعد میں۔ جب اے رد کیا گیا تو۔ فدک پر ارث کا دعویٰ فرمایا بلکہ طبعی ترتیب یہ ہے کہ ”پہلے حکمرانوں کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں، ارث کے مسئلے کو پیش کیا جائے جو اسلام کے قطعی احکامات میں سے ایک ہے تاکہ اس کے ذریعے اپنے غضب شدہ حق کو واپس لے سکیں کیونکہ میراث میں، فدک، خمس اور پیغمبر کا کل ترکہ شامل ہے، جبکہ ہبہ کا دعویٰ تو صرف فدک تک ہی محدود ہے لہذا پہلے مرحلے میں کامیاب نہ ہونے کی صورت میں ہبہ ہونے کے اعتبار سے فدک کے مسئلے کو اٹھایا جائے۔“ فدک فی تاریخ ص ۸۷۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ: فدک ایک یہودی نشین علاقہ تھا جو اسلحہ اور طاقت (لشکر کشی) کے ذریعے فتح نہیں ہوا تھا بلکہ وہاں کے یہودیوں نے پیغمبرؐ کے حوالے کر دیا تھا اور اکثر فقہاء کے نزدیک ایسی زمینیں خود پیغمبر اکرمؐ کی ملکیت ہوتی ہیں نہ کہ تمام مسلمانوں کی۔ بنا بریں فدک پر قانون ارث لاگو ہونا ہے کیونکہ پیغمبرؐ کی زوجات، خود زمین سے ارث نہیں پاتیں اور اس قسم کے اموال کی وارث خود: محض حضرت زہراءؑ بن جاتی ہیں، البتہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ”خالصہ جات“ یعنی وہ تمام اموال جو بغیر کسی جنگ کے، مصالحت کے ذریعے پیغمبرؐ کے ہاتھ آئے ہوں وہ سب، پیغمبر اکرمؐ کے مقام منصب اور زعامت کے ساتھ مخصوص ہوں اور پیغمبرؐ کے بعد ان کو برحق حکومت النبیہ کے اختیار میں ہونا چاہیے تھا اور اس الٹی حکومت۔ کا امین اور سربراہ۔ حضرت علیؑ اور پیغمبرؐ کے خاندان عصمت و طہارت کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ فدک کے مسئلے میں حکمرانوں نے پر حضرت زہراءؑ کا اعتراض بھی درحقیقت امامت اور امت کی =

اس وقت عربوں کی زندگی میں اونٹ کی بہت اہمیت تھی اور ان کی زندگی اونٹ سے ہی وابستہ تھی، اسی لئے عربی زبان میں بہت ساری چیزوں کو اونٹ سے تشبیہ دیا جاتا ہے۔

حضرت زہراء (ع) بھی یہاں فدک کو ایک ایسے اونٹنی سے تشبیہ دیتی ہیں کہ جس کے ناک میں نکیل اور پشت پر کجاوہ کس کر سواری کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، چونکہ عرب لوگ اونٹ پر سوار ہوتے وقت اس کو نکیل بھی ڈالتے تھے اور پالان بھی کس دیتے تھے، جہاں آپ ابو بکر سے خطاب کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: اے ابو بکر! سواری کے لئے آمادہ۔ فدک کی۔ اس اونٹنی کو لے لو اور اس پر سوار ہو کر جس قدر چاہتے ہو سواری کرو اور اسے دوڑاؤ اور اس سے استفادہ کرو!۔ اور یہ جان لو کہ۔ قیامت نامی ایک چیز بھی ہے وہاں تمہارے امور کا حساب و کتاب ہوگا۔

”فدونکما“ دونک اسم فعل (۱) ہے اور اس کا معنی دھمکی کے ساتھ امر کرنا ہے یعنی۔ ابھی۔ اس کو لے لو۔ بعد میں پتہ چلے گا۔ یہاں جو ”ہاء“ کی ضمیر ہے وہ فدک کی طرف پلٹتی ہے، یعنی فدک کو لے لو۔ ابھی فدک پر قبضہ کر لو۔ ”مخطومة، خطام“ کا اسم مفعول ہے اور خطام، نکیل کو کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اس حال میں کہ فدک کے اونٹ کی نکیل تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ ”مرحولہ“ رحل کا اسم مفعول ہے۔ رحل پالان، کجاوہ کو اور ”مرحولہ“ کجاوہ لگا کر سواری کے لئے آمادہ اونٹنی کو کہا جاتا ہے۔ ”تلقاک یوم حشرک“ اس وقت حشر کے دن تم سے ملاقات کرے گی، یعنی تجھے قیامت کے دن فدک کے بارے میں جواب دینا ہوگا۔

”فنعلم الحکم اللہ“

(پس خدا بہترین فیصلہ کرنے والا اور حاکم ہے)

وہاں خداوند متعال قاضی ہوگا، وہاں تو غلط پروپیگنڈہ اور سازش نہیں کر سکے گا اور وہاں خدا خود

== سربراہی اور سرپرستی کے غصب پر احتجاج تھا، وہی مقام امامت حقہ کہ جس کے ہاتھ میں فدک کا ہونا بھی لازم تھا۔ ابو بکر نے اس پر ناجائز قبضہ جمایا اور مغالطہ کھڑے کر کے خود کو حکومت حقہ الہیہ کا مصداق قرار دیا اور لوگوں کو بھی اسی پر فریب استدلال کھڑے کر دیا۔

۱۔ اسم فعل ایسے کلمات کو کہتے ہیں جو لفظ کے اعتبار سے اسم ہو مگر فعل کا معنی دیتا ہے۔

ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا۔

”والغريم۔ الزعيم۔ محمد (ص)“

(اور اس دن مدعی۔ یار ہبر۔ حضرت محمد (ص) ہوں گے)

یہ جملہ دو طرح سے نقل ہوا ہے۔ بعض نسخوں میں ”الزعیّم“ اور دوسرے بعض نسخوں میں ”الغريم“ ذکر ہوا ہے۔ ”زعیّم“ یعنی رہبر اور پیشوا، یعنی قیامت کے دن پیشوا اور رہبر محمد مصطفیٰ (ص) ہوں گے اور تجھے اس کے اہل بیت پر ڈھائے گئے مظالم کا جواب دینا ہوگا۔ ”غريم“ طلب کرنے والا مدعی، یعنی قیامت کے دن تمہارے مقابلے میں رسول خدا (ص) ہوں گے جو خدا کی عدالت میں۔ تم سے پوچھیں گے کہ فدک کو جسے میں نے اپنی بیٹی کو بخشا تھا تم نے کیوں غضب کیا؟ اس وقت تم جوابدہ ہو گے۔

”والموعدا لقیامة“

(ہماری ملاقات کا وقت قیامت کا دن ہوگا)

ممکن ہے ان دو جملوں کی ابتداء میں بھی نعم کا لفظ موجود ہو تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ پیغمبر اکرم (ص) کہتے اچھے مدعی یا رہبر ہوں گے اور قیامت کا دن کتنا اچھا ملاقات کا وقت ہوگا، کیونکہ قیامت کے روز عدالت میں محمد مصطفیٰ (ص) جیسی شخصیت کے سامنے بغیر کسی تحریف کے تمام حقائق صاف اور آشکار ہو جائیں گے۔

”وعند الساعة يخسر المبطلون“

(اور قیامت کے دن اہل باطل نقصان اٹھائیں گے)

”خسران“ اصلی سرمایہ کو نقصان پہنچے تو اسے خسران کہا جاتا ہے۔ پس اہل باطل جنہوں نے زندگی کی تجارت سے نہ صرف کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ایمان کے اصلی سرمایہ سے بھی محروم ہو گئے ہیں یہ لوگ واقعی خسران کا شکار ہوئے ہیں۔ یہاں حضرت زہراء (ع) سورۃ جاثیہ کی آیت ۲۷ پر نظر رکھتی ہیں اور سقیفہ کے جیالوں کو اس آیت شریفہ کا مصداق قرار دیتی ہیں کہ قیامت کے دن تم متوجہ ہو گے کہ خسران عظیم سے دوچار ہو چکے ہیں۔

”ولا ینفعکم اذ تندمون“

(اس دن جس قدر پشیمانی کا اظہار کرو گے کوئی فائدہ نہیں ہوگا)

یہاں اصحاب سقیفہ اور ابو بکر کے حامیوں کو قرآن کی چند آیتوں کے ذریعے خبردار کرتی ہیں۔

”ولکل نباء مستقر (۱)“

(ہر خبر۔ حادثہ۔ کے لئے ایک قرار گاہ اور ٹھہرنے کا مقام ضروری ہے)

”وسوف تعلمون من یاتیه عذاب یخزیہ (۲)“

(اور عنقریب معلوم ہوگا کہ۔ خدا کا۔ رسوا کن عذاب، کس پر نازل ہوگا)

یہ آیت اصل میں قوم نوح علیہ السلام سے مربوط ہے۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کس پر عذاب نازل ہوگا، ایسا عذاب جو ذلیل و رسوا کر دے۔

مفسرین کا کہنا ہے کہ ”عذاب یخزیہ“ سے مراد وہی دنیوی عذاب ہے جو طوفان کی شکل میں قوم نوحؑ پر نازل ہوا تھا اور مذکورہ جملہ کے بعد آپؑ جو یہ فرماتی ہیں کہ ”ویحل علیہ عذاب مقیم“ قیامت کے عذاب سے مربوط ہے، کیونکہ قیامت کے عذاب میں کفار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔

”ویحل علیہ عذاب مقیم (۳)“

(اور کس پر ہمیشہ رہنے والا عذاب نازل ہوگا)

سقیفہ والوں کو قوم نوحؑ سے تشبیہ دینے کی علت شاید یہ ہو کہ جس طرح قوم نوحؑ دنیا و آخرت دونوں میں عذاب خداوندی میں مبتلا ہوئی اسی طرح سقیفہ کے باغیوں پر قیامت کا دائمی عذاب نازل ہوگا اور ساتھ ساتھ دنیا میں بھی وہ ذلت و رسوائی سے دوچار ہوں گے۔

۱۔ یہ جملہ سورۃ النعام کی آیت ۶۷ سے ماخوذ ہے۔ شاید اس سے مراد قیامت کے حتمی عذاب کا وعدہ ہو، کیونکہ قیامت کے دن دنیا کے حوادث اور کاموں کا تسلسل ختم ہو جائے گا ہر چیز اور حادثے کا اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر تسلسل رک جاتا ہے۔ حضرت زہراءؑ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ یہ تمہارے مظالم، ریاست اور حکومت ایک دن نابود ہو جائیں گے اور ہر چیز کی واقعیت جیسا کہ وہ ہے ظاہر ہو جائے گی۔

۲۔ سورۃ ہود آیت ۳۹ سے ماخوذ ہے۔

اگر ماضی اور حال میں مسلمانوں کی بد بختی اور ذلت کے علل و اسباب کی صحیح اور دقیق جستجو کی جائے تو معلوم ہو گا کہ ان تمام بد بختیوں اور مشکلات کی جڑیں، صدر اسلام میں رونما ہونے والے حادثات، امامت کے مسئلے میں انحراف اور اس کے بعد کے واقعات میں پائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں ان تمام بد بختیوں اور گمراہیوں کا اصلی سبب، امامت کے خلاف سقیفہ میں رونما ہونے والی بغاوت ہی نظر آئے گی۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ



آٹھواں درس :

- ✽ انصار سے کچھ باتیں
- ✽ سیاست اور موقف میں تبدیلی
- ✽ رحلت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ) کے معاشرتی اثرات
- ✽ قرآن میں رحلت رسول (ص) کی پیش گوئی
- ✽ خدا کا قانون موت اور انبیاء (ع)
- ✽ انصار سے حضرت زہراء (ع) کا شکوہ
- ✽ انصار کی مجاہدانہ خدمات

ثُمَّ رَمَتْ بِطَرْفِهَا نَحْوَ الْأَنْصَارِ فَقَالَتْ [لَهُمْ]:

يَا مُؤَمَّرَ النَّقِيبَةِ [الْفِتْيَةِ] [الْبَقِيَّةِ] وَأَعْضَادَ الْمِلَّةِ وَحَضَنَةَ الْإِسْلَامِ، مَا هَذِهِ
الْغَمِيرَةُ فِي حَقِّي وَالسُّنَّةَ عَنْ ظِلَامَتِي؟ أَمَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَبِي يَقُولُ: «الْمَرْءُ
يُحْفَظُ فِي وَلَدِهِ؟ سَرْعَانَ مَا أَخَذْتُمْ وَعَجَلَانَ ذَا إِهَالَةٍ، وَلَكُمْ طَاقَةٌ بِمَا أَحَاوَلُ،
وَقُوَّةٌ عَلَى مَا أُطْلِبُ وَأَزَاوَلُ؛ أَتَقُولُونَ مَاتَ مُحَمَّدٌ ﷺ؟ فَخُطِبَ جَلِيلٌ، اسْتَوْسَعَ
وَهُنَّهْ وَاسْتَنْهَرَ فَتَفَهَ وَانْفَتَحَ رَتَقُهُ وَاطْلَمَتِ الْأَرْضُ لِغَيْبَتِهِ، وَكَسَفَتِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ،
وَانْتَشَرَتِ النُّجُومُ لِمُصِيبَتِهِ، وَاكْدَتِ الْأَسَالُ، وَخَشَعَتِ الْجِبَالُ، وَاضْيَعُ
الْحَرِيمُ، وَأَزِيلَتِ الْحَرَمَةُ عِنْدَ مَنَاتِهِ، فَتِلْكَ وَاللَّهِ النَّازِلَةُ الْكُبْرَى، وَالْمُصِيبَةُ
الْعُظْمَى، لَا مِثْلَهَا نَازِلَةٌ، وَلَا بَائِقَةٌ عَاجِلَةٌ، أُعْلِنَ بِهَا كِتَابُ اللَّهِ جَلَّ ثَنَاؤُهُ فِي
أَفْنِيَّتِكُمْ، فِي مَمْسَاكِكُمْ وَمُضْبِحِكُمْ، هَتَافًا وَصَرَخًا، وَتِلَاوَةً وَأَلْحَانًا؛ وَلِقَبْلِهِ مَا
حَلَّ بِأَنْبِيَاءِ اللَّهِ وَرُسُلِهِ، حَكَمَ فَصَلَ وَقَضَاءَ حَتَمٍ: «وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ
فَلَنُيْضِرَّ اللَّهُ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ» ١

إِيهَا بَنِي قَيْلَةَ! أَأَهْضَمُ تَرَاثَ أَبِي؟ وَ أَنْتُمْ بِمَرَأَى مِنِّي وَمَسْمَعٍ، وَ مُنْتَدِي
وَمَجْمَعٍ؛ تَلْبِسُكُمْ الدَّعْوَةُ، وَ تَشْمَلُكُمْ الْخَبْرَةُ وَ أَنْتُمْ ذَوُو الْعَدَدِ وَالْعُدَّةِ، وَالْأَدَاةِ
وَالْقُوَّةِ، وَ عِنْدَكُمْ السُّلَاحُ وَ الْجُنَّةُ؛ تَوَافِيكُمْ الدَّعْوَةُ فَلَا تَجِيبُونَ، وَ تَأْتِيَكُمْ
الصَّرِخَةُ فَلَا تَغِيثُونَ، وَ أَنْتُمْ مَوْصُوفُونَ بِالْكَفَاحِ، مَعْرُوفُونَ بِالْخَيْرِ وَالصَّلَاحِ، وَ
النَّخْبَةِ الَّتِي انْتَخَبْتُمْ، وَ الْخَيْرَةَ الَّتِي اخْتِيرْتُمْ لَنَا أَهْلَ الْبَيْتِ.
قَاتَلْتُمُ الْعَرَبَ، وَ تَحَمَّلْتُمُ الْكَدَّ وَ التَّعَبَ، وَ نَاطَحْتُمُ الْأُمَمَ وَ كَافَحْتُمُ الْبُهَمَ؛
لَا تَبْرَحُ أَوْ تَبْرَحُونَ، نَأْمُرُكُمْ فَتَأْمُرُونَ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

انصار سے کچھ باتیں،

حضرت زہراء (ع) نے مسجد میں ابو بکر اور اس کے پاس موجود لوگوں کو اپنے مستدل اور عتاب آمیز خطاب کے بعد انصار کو مخاطب کر کے چند باتیں بیان فرمائیں۔ شاید کہ وہ بیدار ہو جائیں اور حالات کی گہرائیوں کو درک کر سکیں۔

”ثم رمت بطرفہا نحو الانصار“

(پھر آپ (ع) انصار کی طرف متوجہ ہوئیں)

”طرف“ آنکھ اور دیکھنے کے بعد آنکھ بند کر لینے کے معنی میں آتا ہے۔ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار مسجد کے ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے اور آپؐ ان کی طرف متوجہ ہوئیں اور انہیں مخاطب قرار دے کر فرمایا کہ:

”فقلت لہم۔ یا معشر النقیبة۔ الفتیة، البقیة۔“

(پھر ان سے فرمایا کہ: اے وہ گروہ جو صاحب نفوذ حضرات۔ جو ان مرد حضرات، گزرے ہوئے لوگوں کی یادگار حضرات) آپؐ کا یہ کلام تین طرح سے نقل ہوا ہے۔ بعض نسخوں میں ”النقیبة“ بعض میں ”الفتیة“ اور بعض نسخوں میں ”البقیة“ ذکر ہوا ہے۔

اگر ”يامعشر النقيبة“ صحيح ہو تو اس کے معنی ہوں گے کہ اے صاحب نفوذ اور با اثر جماعت،
 ”نقباء کا بھی یہی معنی ہے۔“ الفتية کا معنی بھی جوانان اور جوانمرد حضرات ہے جبکہ اگر ”البقيّة“
 صحيح ہو تو یہ معنی ہو گا کہ اے گزشتہ لوگوں کی یادگار جماعت، کیونکہ مسلمانوں اور انصار کے بعض لوگ یا
 تو فوت ہو چکے تھے یا شہادت کے عظیم مرتبہ پر فائز ہو چکے تھے اور جو زندہ تھے وہ ان کی یادگار شمار ہوتے
 تھے۔

بہر حال آپ انصار کی طرف متوجہ ہوئیں اور انہیں مخاطب کر کے فرمایا: اے با اثر گروہ، اے
 جوانمرد گروہ اور اے گزرے ہوئے لوگوں کی یادگار۔

”واعضاد الملة“

(اور۔ اے دین و شریعت کے بازو)

”اعضاد“ عضد کی جمع ہے اور عضد کا معنی ہے بازو۔ انصار کو شریعت اسلام کے قوی بازو اس لئے
 قرار دیا کہ انسان اپنی طاقت و قدرت کو بازو کے ذریعے استعمال کرتا ہے اور اسی بازو کے ذریعے انسان
 اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور انسان پر ہونے والے حملوں اور دوسرے ضروری حالات میں بازو
 اس کی مدد کرتا ہے۔ یہاں حضرت زہراء (ع) انصار سے فرماتی ہیں کہ تم ہی تھے جو دین و شریعت کے بازو
 کی حیثیت سے اسلام کا دفاع اور اس کی مدد کرتے تھے۔

”وحضنة الاسلام“

(اے اسلام کو پناہ دینے والو۔ اور اسلام کے محافظو!۔)

”حضر اور حصن“ پناہ گاہ کو کہتے ہیں۔ ”حق الاحتضان“ بھی اسی وجہ سے ہے یعنی بچے کو پناہ دینے
 اور اس کی حفاظت کا حق۔

حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ اسلام تمہاری پناہ اور تمہارے ہی دامن میں پروان چڑھا ہے اور
 پیشرفت کی ہے، کیونکہ انصار اسلام کی حفاظت کا سبب بنے تھے انہوں نے پیغمبر (ص) کے ساتھ عہد
 دپیمان باندھا اور پیغمبر (ص) کو مدینہ آنے کی دعوت دی اور پہلی بار اسلامی حکومت تشکیل دی، دراصل

انصار کا ایثار و قربانی ہی تھا کہ جس کی وجہ سے مسلمان اس قابل بنے کہ اسلام کے نو خیز پودے کو تناور درخت میں تبدیل کریں۔ اسی وجہ سے آپؐ ان کو خطاب کر کے فرماتی ہیں کہ: ”وحضنة الاسلام“ یعنی، اے وہ گروہ اور جماعت، جس نے اسلام کو پناہ دی اور اسلام نے تمہارے دامن میں ترقی کی اور وسعت پائی۔

”ما هذه الغمیزة فی حقی؟“

(پنمیر (ص) کے ساتھ اتنے وفادار ہوتے ہوئے۔ میرے حق میں یہ کمزوری کیوں؟)

”غمیز“ یعنی کمزوری۔ یہاں حضرت زہراء (ع) انصار کی توبیخ اور سرزنش کرتی ہیں کہ جب میری باری آئی اور مجھ پر ظلم ہوا تو تم نے کمزوری کا مظاہرہ آخر کیوں کیا؟ حالانکہ تم اسلام کے قوی بازو تھے۔ اسلام نے تمہارے دامن میں پرورش پائی تھی، تم ہمیشہ رحمۃ للعالمین (ص) کے فرمانبردار رہتے تھے، لیکن ابھی اپنے پنمیر (ص) کی عترت پر یہ سارے ظلم ہو رہے ہیں لیکن تم خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو! آخر یہ خاموشی کیوں؟ حریم اہل بیت (ع) سے دفاع کیوں نہیں کرتے ہو؟!

”والسنة عن ظلامتی؟“

(میرے اوپر ہونے والے مظالم کو دیکھتے ہوئے۔ تم کیوں اونگھ رہے ہو)

”سنة“ یعنی اونگھنا، قرآن میں بھی مذکور ہے کہ: ”لا سنة ولا نوم (۱۱)“ (یعنی، خدا کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ وہ سوتا ہے) ”ظلامۃ“ یعنی وہ چیز جسے ظالم نے مظلوم سے چھین لیا ہو اور مظلوم اس کے حصول کے لئے کوشش میں مصروف ہو۔ یہاں ”ظلامۃ“ فدک یا خود حکومت اور امامت کی طرف اشارہ ہے۔

آپؐ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ۔ اے گروہ انصار۔ میرے اوپر ظلم و ستم ہوا ہے اور اس بارے میں تم خواب غفلت میں کیوں سو رہے ہو؟ ابو بکر اور عمر اپنی من مانی کر رہے ہیں اور تم اعتراض کرنے کے بجائے اپنے آپ کو خواب غفلت میں مبتلا کئے ہوئے ہو؟!

”أما کان رسول اللہ یقول، المرء یحفظ فی ولده؟“

(کیا۔ میرے بابا۔ رسول خدا (ص) نہیں فرمایا کرتے تھے کہ: اولاد کے ضمن میں انسان کی حفاظت ہوتی ہے؟) اگر کسی فوت ہونے والے انسان کے حقوق اور شخصیت کی حفاظت اور احترام مقصود ہو تو اس کی اولاد کی عزت و احترام کا خیال رکھو کیونکہ اولاد ان کی یادگار ہوتے ہیں، اب اگر تم حضرت ختی مرتبت (س) کا احترام کرنا چاہتے ہو تو تم پر لازم ہے کہ پیغمبر (س) کی عزت کا احترام کرو اور اہل بیت کے حقوق کا دفاع کرو۔ اسی لئے ہم سادات کا احترام کرتے ہیں کیونکہ حقیقت میں یہ پیغمبر (س) کی عزت و تکریم شمار ہوتی ہے (۱)۔

سیاست اور موقف میں تبدیلی،

”سرعان ما حدثتم“

(تم نے انتہائی جلد بازی سے اپنی روش بدل لی)

”سرعان“ اور ”عجلان“ دونوں انتہائی جلدی کے معنی میں اسم فعل ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ تم پیغمبر (س) کے ساتھ رہے، حق کے ہمراہ رہے لیکن اچانک تم بدل گئے اور اپنی روش بھی بدل دی ہے، سیاسی حالات سے تم متاثر ہو گئے ہو اور ایسے امور انجام دیے ہیں کہ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

”وعجلان ذالہالة“

(اور کتنی جلدی، تمہاری چربی، تمہارے ناک سے بہہ گئی ہے)

۱۔ جیسا کہ بیان کیا ہے کہ سادات کا احترام لازمی ہے اور ان کا احترام محفوظ رہنا چاہئے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ حقوق کے لحاظ سے دوسرے افراد سے فرق رکھتے ہوں اور ایک قسم کی نسلی برتری اور امتیاز کے مالک ہوں کیونکہ اسلامی احکام کی نظر میں، حقوق کے لحاظ سے معاشرے کے تمام افراد برابر اور مساوی ہیں، اسی لئے سادات کا احترام لازم ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ نسلی بنیاد پر۔ خدا کے ہاں کسی خاص مقام اور قرب کے حامل ہوں، کیونکہ قرآن فرماتا ہے کہ ”ان اکرم عند اللہ التقی“ (خدا کے نزدیک سب سے بستر وہ ہے جو زیادہ حقیقی ہو) اسی طرح رسول خدا نے فرمایا کہ: قریش کے آزاد اور آقا کو ایک کالے حبشی پر کوئی برتری نہیں مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔ ہاں! سادات پیغمبر کی اولاد اور یادگار ہیں، آپ کے ساتھ نسبی پیوند رکھتے ہیں اور آپ کے فرمان کے مطابق کہ ”المرء بحفظ فی دلدہ“ سادات کا احترام ہونا چاہئے اور ان کی عزت و حرمت کا پاس رکھنا لازم ہے کیونکہ اولاد کی عزت و حرمت اصل میں باپ ہی کی عزت و حرمت ہے۔

”عجلان“ اسم فعل ہے، ”ذا“ اسم اشارہ اور عجلان کا فاعل جبکہ ”اھالہ“ ”ذا“ کی تمیز اور منصوب ہے۔ ”اھالہ“ یعنی چربی۔

بڑے لوگ ہمیشہ اپنے زمانے کی متداول مثالوں سے استفادہ کرتے ہیں، یہاں پر حضرت زہراء (ع) بھی عرب کی مشہور ضرب المثل ”عجلان ذاہالہ“ سے استفادہ کرتی ہیں۔ اس تمثیل کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ: کسی آدمی کے پاس ایک کمزور اور قریب المرگ بکرا تھا اور اس کے ناک سے رینٹ، مسلسل بہتا تھا کسی نے اس سے کہا کہ: بھی تمہارا بکرا اتنا کمزور کیوں ہے اور اس کے ناک سے کیا بہہ رہا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ: ”یہ بکرے کی چربی ہے جو بھگل کر اس کے ناک سے بہہ رہی ہے، اسی وجہ سے بکرا کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اس موقع پر اس سے یہ کہا گیا کہ ”عجلان ذاہالہ“ یعنی کس قدر جلدی اس کی چربی اس کے ناک سے نکل رہی ہے اور تیرا بکرا دم توڑ رہا ہے۔ اس کے بعد ضرب المثل کے طور پر یہ جملہ اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو بہت جلدی انجام پائے یا انتہائی عجلت میں اپنی حالت اور روش بدل دے۔

در اصل اس ضرب المثل کے ذریعے حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: پیغمبر اسلام (س) کی رحلت کے بعد تم انتہائی تیزی کے ساتھ بدل گئے ہو اور مفاد پرست اور کردار سے عساری افراد کی شکل میں تبدیل ہو گئے ہو کہ جو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ حق پامال ہو رہا ہے لیکن چند روزہ دنیوی زندگی کی خاطر خاموش تماشا بنے ہوئے ہو (۱)۔

آپ (ع) اپنے خطبے کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتی ہیں کہ:

”ولکم طاقة بما احوال“

(حالانکہ تم میں اتنی طاقت ہے کہ جس چیز کو میں چاہتی ہوں۔ اسے انجام دیں۔)

۱۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں علم لغت کے بعض ماہرین کے اس قول کو نقل کرتے ہیں کہ: ”مذکورہ ضرب المثل، آئندہ آنے والے ناخوشگوار حوادث کی خبر دینے کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے“ یہ بات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: ”بعید نہیں کہ آپؐ اس مثل کفریہ امت مسلمہ پر آنے والی ان مصیبتوں اور حوادث کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں جو غصب خلافت کے بعد امت کا مقدر بن گئے تھے۔ بحار الانوار۔ طبع قدیم۔ ج ۸ ص ۲۲۰۔

یعنی: اگر آپ ابوبکر کے مقابلے میں آجائیں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، تم میں ابوبکر کو خلافت سے برطرف کرنے کی طاقت اور قدرت موجود ہے لیکن تم سلام و صلوات کے ذریعے اس کی رکاب پکڑے ہوئے ہو، حالانکہ ابوبکر کی نوکر شاہی نے تمہاری سادہ لوحی سے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ اسلام اور اسلامی حکومت کے نام پر تمہیں دھوکہ دیا ہے اور امامت درہمیری کی راہ کو منحرف کر دیا ہے اور تم اس راہ میں ان کے آلہ کار بن گئے ہو۔

”وقوة على ما اطلب واذاول“

(جس چیز کو میں بار بار۔ تم سے۔ طلب کر رہی ہوں۔ اس کے حصول کے لئے تم میرا ساتھ دینے کی۔ طاقت رکھتے ہو)

”مزادلہ“ کسی چیز کو بار بار طلب کرنا۔

آپؐ فرماتی ہیں کہ: تم اتنا تو کر سکتے ہو کہ جس ہدف کو لے کر میں آگے بڑھ رہی ہوں اس کے حصول کی خاطر میرا ساتھ دو اور میرا دفاع کرو، لیکن تم خاموش بیٹھے ہو! اہل بیتؑ کے حقوق کے لئے آپؐ کی سعی پیہم اور اس راہ میں موجود خطرات کے سامنے آپؐ کی استقامت اور ثابت قدمی، اس حملے سے بخوبی معلوم ہوتی ہے۔

کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ پیغمبر (ص) دفات پاگئے ہیں اور وحی کا سلسلہ بند ہو گیا ہے لہذا ابھی ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی!!

اس قسم کے توہمات کو دور کرنے کے لئے آپؐ فرماتی ہیں کہ:

”اتقولون مات محمد۔ صلى الله عليه واله وسلم۔؟“

(کیا تم یہ کہو گے کہ: محمد (ص) دفات پاگئے ہیں۔ اب ہم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟)

حق کے دفاع میں جو تم سستی اور کالمی سے کام لے رہے ہو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ پیغمبر (ص) اس دنیا سے چلے گئے ہیں اور اس کے بعد تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ یہ تو انتہائی تعجب خیز بات ہوگی، کیونکہ پیغمبر (ص) کے چلے جانے سے حق کے مقابلے میں تمہاری ذمہ داریاں تبدیل نہیں ہونیں۔ پیغمبر (ص) کی دفات اگرچہ اتنی عظیم مصیبت ہے کہ اس کی شدت قابل وصف نہیں،

لیکن اس سے تمہاری ذمہ داری تبدیل نہیں ہوتی اور حق اور امامت حقہ کے دفاع کی مسئولیت تم سے سبکدوش نہیں ہوتی۔

رحلت رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاشرتی اثرات،

”فخطب جلیل“

(پس۔ رحمۃ للعالمین (م) کی رحلت۔ ایک بہت بڑی مصیبت ہے)

”خطب“ کسی اہم اور بڑی چیز کو کہا جاتا ہے۔

(۱) ”استوسع وهنه- وهيه-“

(اس مصیبت کی وجہ سے جو کمزوری۔ یا شکاف۔ وجود میں آیا ہے وہ بہت وسیع اور زیادہ ہے)

بعض نسخوں میں مذکورہ عبارت ”وهنه“ اور بحار میں ”وهيه“ ذکر ہوئی ہے۔ پہلی عبارت کے مطابق معنی یہ ہو گا کہ رحمۃ للعالمین (م) کی رحلت کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو کمزوری پیدا ہوئی ہے وہ بہت بڑی اور وسیع ہے، جبکہ بحار کی عبارت کے مطابق معنی یہ ہو گا کہ آنحضرت (م) کی وفات سے مسلمانوں میں جو جدائی اور شکاف پڑا ہے وہ بہت وسیع ہے، کیونکہ ”رمی“ کے وزن پر ”وهی“ جدائی اور شکاف کے معنی میں ہے۔

آپؐ فرماتی ہیں کہ: رسول خدا (م) کی وفات کے بعد امت کی صفوں میں جو شکاف پڑا وہ بہت وسیع اور گہرا ہے، امت مسلمہ کے اندر جتنے بھی فرقے وجود میں آئے اور مسلمان اختلاف و افتراق کا شکار ہوئے ان سب کا سبب، سقیفہ کی بغاوت اور امامت کی راہ سے انحراف ہی ہے۔

(۲) ”واستنہر فتقه“

(اس مصیبت کی وجہ سے پایا جانے والا۔ افتراق بہت وسیع ہے)

”استنہر، نہر“ سے مشتق ہے اور وسعت اور زیادہ کے معانی میں آتا ہے جبکہ ”فتق“ جدائی اور پارہ پارہ ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ جملہ بھی مسلمانوں کے درمیان رحلت پیغمبر (م) کے بعد واقع ہونے

والے ان فتنوں اور جدائیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو دن بدن بڑھتے چلے گئے۔

(۳) ”وانفتق رتقه“

(اور وحدت و یکجہتی۔ کاشیرازہ۔ بکھر گیا)

”انفتاق“ شکاف پڑنا، ٹکڑے ٹکڑے ہونا۔ ”رتق“ وحدت اور یکجہتی۔

قرآن مجید میں ہے کہ: ”... ان السحوات والارض كانتا رتقا ففتقناهما (۱)“ (یعنی بے شک آسمان اور زمین ایک دوسرے سے متصل تھے، ہم نے انہیں جدا کر دیا) یہ آیہ کریمہ اپنے ظاہری معنی کے ذریعے، علم ہیئت کے موجودہ نظریے کی تاکید کرتی ہے کہ کسی زمانے میں زمین سمیت پورا نظام شمسی آتشیں شعلے کی شکل میں آپس میں متحد تھا پھر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر مخصوص مداروں پر گردش کرنے لگا، پھر وہ منجمد ہو گیا اور کرہ زمین میں انسانی زندگی کے لئے مناسب ماحول وجود میں آیا۔

(۴) ”واظلمت الارض لغيبتہ“

(اور پیغمبر (ص) کی غیبت۔ رحلت کی وجہ سے زمین تاریک ہو گئی)

یعنی، پیغمبر اسلام (ص) کی وفات کے ساتھ ہی، خالص اسلام، عدالت، صداقت اور حقیقت کی روشنی ماند پڑ گئی اور مفاد پرستی، جاہ طلبی، ریاکاری اور افتراق کی تاریکی پھیل گئی۔

(۵) ”وکسفت الشمس والقمر“

(نیز چاند اور سورج کو گرہن لگ گیا۔)

یہ رحمت للعالمین (ص) کے نور ہدایت سے محرومی اور نفاق کی ظلمت چھا جانے کی طرف کنایہ ہے۔

”کسف“ لازم و متعدی دونوں طریقے سے استعمال ہوتا ہے، البتہ اگر معلوم کے صیغے میں ہو تو لازم

ہے لیکن اگر مجہول پڑھا جائے تو متعدی ہے۔

یہاں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ پیغمبر اکرم (ص) کی وفات کی وجہ سے سورج گرہن اور چاند گرہن

آگ لگ گیا۔ آپ کا مقصود یہ نہیں کہ اس دن واقعاً گرہن لگ گیا ہو بلکہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ

رحلت پنجم (م) کی وجہ سے۔ دنیا آپ (م) کے نور ہدایت سے محروم ہو کر۔ تاریک اور ظلمت کدہ بن گئی ہے۔

(۶) ”وانتشرت النجوم لمصیبتہ“

(آپ (م) کی مصیبت کی وجہ سے ستارے پراکندہ و منتشر ہو گئے ہیں)

یہ تعبیریں آپ (م) کے مصائب کی شدت اور گہرائی کو بیان کرتی ہیں کہ آپ (م) کی وفات سے پورا نظام خلقت متاثر ہوا اور ایک قیامت برپا ہو گئی (۱)۔

(۷) ”واکدت الآمال“

(اور امیدیں، ناامیدی میں تبدیل ہو گئیں)

”اکدت“ کی اصل ”کدی“ ہے اور اس کے معنی ہیں بے فائدہ اور بیہودہ چیز۔

مسلمانوں نے رسول خدا (م) کے ساتھ کافی امیدیں وابستہ کی ہوئی تھیں اور بہت ساری تمنائیں اور آرزوئیں رکھتے تھے اور آپ (م) کی رحلت کی وجہ سے وہ ناامید ہو گئے۔ قرآن اور خود رسول خدا (م) کے وعدوں کے مطابق مسلمان یہ آرزو رکھتے تھے کہ روئے زمین تمام انسان، مسلمان بن جائیں اور عدالت کی طرف رجوع کریں اور کرہ ارضی پر عدالت و یکتا پرستی کا پرچم لہرائیں، لیکن رحمۃ للعالمین (م) کی وفات اور چند مفاد پرست افراد کی جاہ طلبی اور ریاست طلبی کے نتیجے میں حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ مسلمانوں کی تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور توحید و عدالت کے پرستار سازش کا شکار ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔

(۸) ”وخشعت الجبال“

(اور پہاڑ خاشع ہو گئے)

آپ کا یہ کلام کنایہ ہے پہاڑوں کے خاشع۔ و عاجز۔ ہونے سے۔ یہاں دو مقصد ہو سکتے ہیں:

۱۔ آپ کے کلمات قیامت کی صفت میں نازل شدہ ان قرآنی آیات سے ماخوذ ہیں کہ ”اذا الشمس کورت و اذا النجوم انکدرت و...“
آپ نے رحلت رسول کے عظیم حادثے کو قیامت کے حادثے سے تشبیہ دی ہے۔

۱۔ رسول خدا (س) کی رحلت کی مصیبت اتنی عظیم اور کمر شکن تھی کہ پہاڑ بھی اپنی رفعت و استقامت کے باوجود اس مصیبت کے سامنے عاجز و درماندہ دکھائی دیتے ہیں۔

۲۔ وہ افراد جو رسول خدا (س) کی زندگی میں پہاڑوں کی طرح سینہ تان کر حوادث و مشکلات کا مقابلہ کرتے تھے ابھی سستی اور کمزوری میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

(۹) ”واضح الحریم“

(اور۔ پیغمبر (س) کا حریم ضائع ہو گیا)

سیاست باز حکمرانوں نے حالات ایسے خراب کر دیئے کہ اہل بیت عصمت و طہارت کے جو حریم رسول (س) تھے، کی توہین کی اور ان کی حرمت کو ضائع کیا گیا، وہ ہستیاں جو قرآن، معارف اسلامی اور دین و مکتب کی حامی اور مددگار تھیں اور دشمن کے خطرے سے اسلام کو محفوظ رکھتی تھیں، خود توہین اور وحشیانہ حملوں کا نشانہ بن گئیں۔

(۱۰) ”وازيلت الحرمۃ عند مماتہ“

(اور۔ اہل بیت (ع) پیغمبر (س) کی حرمت آنحضرت (ص) کی وفات کے بعد پامال کی گئی)

تم نے اپنی ان حرکتوں کے ذریعے پیغمبر (س) کے گھر کی حرمت ختم کر دی کیونکہ حقیقت میں آنحضرت (س) اور حضرت علی (ع) کا گھر، اسلام کا مرکز تھا لیکن تم نے رحلت رسول (س) کے بعد چند بے نام و نشان افراد مامور کئے تاکہ وہ اسلام اور خلافت کے دفاع کے نام پر اہل بیت کی حرمت کو پامال کریں اور حضرت فاطمہ زہراء (ع) کے حق میں گستاخی کریں۔

در اصل۔ ان لوگوں نے اپنی ان غیر سنجیدہ حرکتوں کے ذریعے۔ حرمتوں کو پامال کیا اور تاریخ اسلام میں ہونے والے بے شمار مظالم کی بنیاد رکھی۔

”فتلك واللہ النازلة الكبرى والمصيبة العظمیٰ“

(پس خدا کی قسم، یہ حادثہ، بہت بڑی مصیبت اور فاجعہ ہیں)

حضرت زہراء (ع) بغیر کسی معیار کے صرف مبالغہ کے لئے نہیں فرماتی ہیں کہ رحلت پیغمبر (س) کے

بعد جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ امت کے لئے بہت بڑا فاجعہ اور ایک عظیم مصیبت ہیں۔ اگر ہم ان واقعات کا صحیح تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام، عدالت اور خلافت کے نام پر جتنے بھی ظلم و ستم، تحریفیں اور مظالم مسلمانوں کے درمیان پائے جاتے ہیں ان کی جڑیں اور اسباب، سقیفہ اور رحلت پیغمبر (ص) کے بعد خلیفہ تراشی کی وجہ سے ہیں۔

”لا مثلہا نازلۃ“

(اس مصیبت کی مانند اور کوئی مصیبت نہیں)

کیونکہ یہ بڑی مصیبت اور اس کے بعد والے واقعات ہی تاریخ اسلام میں ہونے والے ان جرائم کا بنیادی سبب بنے جو بنی امیہ اور بنی عباس کی نام نہاد اسلامی حکومتوں کے ذریعے انجام پائے۔

”ولا بائقۃ عاجلۃ“

(اور دنیا کی کوئی مصیبت بھی رحلت پیغمبر (ص) جیسی نہیں)

”بائقۃ“ بہت بڑی مصیبت کو کہا جاتا ہے۔

قرآن میں رحلت رسول (ص) کی پیش گوئی،

”اعلن بھا کتاب اللہ جل ثناؤہ فی افنیتمکم“

(اس حادثے کا اعلان کتاب اللہ جل ثناؤہ نے تمہارے گھروں کے اطراف میں بیان کر دیا تھا)

آپؐ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: اگرچہ پیغمبر اکرم (ص) کی وفات ایک عظیم حادثہ تھی لیکن خداوند جل جلالہ نے آپ (ص) کے انتقال سے قبل ہی اس کی خبر دے دی تھی۔ دراصل موت کوئی نئی بات نہیں، آپؐ سے پہلے کے انبیاءؑ بھی اس دنیا سے چلے گئے ہیں، لہذا کوئی یہ خیال نہ کرے کہ پیغمبر (ص) کے چلے جانے کے بعد اب بات ختم ہو گئی ہے اور تمہارے کندھوں پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ موت ایک طبعی چیز ہے اور رحلت رسول (ص) کی وجہ سے تمہاری ذمہ داری میں تبدیلی نہیں آتی۔ اور تم حق و حقیقت کے دفاع سے آزاد نہیں ہو گئے۔

”اعلن بھا“ رحلت رسول (م) کی خبر دی ہے ”کتاب اللہ جل ثناؤہ“ اللہ جل ثناؤہ کی کتاب قرآن نے ”فی افنیتم“ تمہارے گھروں کے اطراف میں۔ ”فناء“ کی جمع ”افنیہ“ ہے اور اس کا معنی گھر کے سامنے کا میدان یا صحن ہے۔

شاید یہ جملہ اس بات کی طرف کنایہ ہو کہ: تم مہاجرین اور انصار بظاہر قرآن کی تلاوت تو کرتے رہتے تھے اور تمہارے گھر کے اندر اور ارد گرد کے گھروں سے تلاوت قرآن کی آواز بلند ہوتی رہتی تھی تو کیا خدا نے اسی قرآن کے اندر نہیں فرمایا تھا کہ: ”اَفَاَنْ مَاتَ اَوْ قَتَلَ اَنْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ؟“ (۱) (یعنی کیا اگر رسول خدا (م) کا انتقال ہو جائے یا آپ (م) قتل کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی سابقہ حالت (جاہلیت) کی طرف پلٹ جاؤ گے؟) اگر تم قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور قرآن سے آشنا تھے تو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم رحلت پیغمبر (م) کے بعد مکمل طور بدل گئے ہو اور قرآنی تعلیمات کو پامال کر رہے ہو؟ شاید یہ کلام عمر کی طرف اشارہ ہو کہ منقول ہے کہ جب اسے رحلت پیغمبر (م) کی خبر ملی تو وہ بھڑک اٹھا اور کہنے لگا کہ ”پیغمبر (م) کو بھی کیا موت آتی ہے؟“ اسے کہا گیا کہ قرآن نے پیغمبر (م) کی وفات کی خبر دی ہے اور تم یہ کہہ رہے ہو کہ: پیغمبر (م) کو بھی کیا موت آتی ہے؟ (۲)۔

عمر اپنے آپ کو مقدس ظاہر کرنے کے لئے کبھی کبھار ایسے کام کیا کرتا تھا۔ تاریخ نے ایک اور نمونہ بھی نقل کیا ہے کہ اس نے لوگوں کو اپنے بچوں کا نام محمد رکھنے سے رد کا تھا اور کہتا تھا کہ اگر ہر علاقے میں ہر بچے کا نام محمد رکھ دیا جائے تو اس سے آنحضرت (م) کی توہین اور بے احترامی ہوگی؟!

”فی ممساکم ومصبحکم“

(تم دن اور رات کو قرآن پڑھتے تھے۔)

”صبح“ اور ”مساء“ یہ دونوں مصدر یا اسم مکان کے معنی میں آتے ہیں۔ بہر صورت اس کا معنی

۱۔ سورۃ آل عمران / ۱۴۴۔
۲۔ بعض مؤرخین کا نظریہ ہے کہ: عمر کی یہ بات ایک سیاسی حربہ تھی کیونکہ اس وقت تک سقیفہ کے سازشی گروپ، خلیفہ تراشی کے مسئلے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے لہذا عمر اپنی اس بات کو ذریعہ یہ چاہتا تھا کہ فیصلہ ہونے تک پیغمبر کی وفات کو پوشیدہ رکھا جائے لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفہ کے بارے میں فیصلہ ہونے کے بعد فوراً وفات پیغمبر کا اعلان ہوتا ہے اور سقیفہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتا ہے۔

ہے صبح اور رات کا وقت۔ مقصود یہ ہے کہ تم روز و شب قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور قرآن کی تعلیمات سے آشنا تھے۔

”هتافاً و صرفاً و تلاوة و الحافاً“

(- نیز تم قرآن کو بلند آواز میں، گریہ و زاری کے ساتھ، معمولی تلاوت اور لحن و نحو بصورتی کے ساتھ پڑھتے تھے۔) یعنی، تمہارا ایک گروہ قرآن کی بلند آواز میں تلاوت کرتا تھا، بعض نالہ و فریاد اور گریہ و زاری کے ساتھ پڑھتے تھے بعض اور معمول کے مطابق تلاوت کرتے تھے جبکہ بعض لوگ اچھی آواز میں لحن کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔

”الحان“ اگر ہمزہ کو زبر کے ساتھ پڑھیں تو لحن کی جمع ہے اور معنی ہو گا اچھی آواز، اور اگر ہمزہ کو کسر کے ساتھ پڑھیں تو سمجھانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی تم میں سے بعض افراد ایسے بھی تھے جو قرآن کی تلاوت کے علاوہ اس کی تفسیر اور دوسروں کو سمجھاتے بھی تھے۔

خلاصہ یہ کہ: قرآن کی آواز۔ تم ہر وقت ہر جگہ اور مختلف انداز سے۔ سنتے رہتے تھے اور جانتے تھے کہ رسول خدا (ص) ایک دن وفات پا جائیں گے۔ اگرچہ آپ (ص) کی رحلت ایک عظیم سانحہ تھی لیکن کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ قرآن نے بھی اس کی اطلاع دی تھی۔ بنا بریں رحلت رسول (ص) کی وجہ سے۔ تمہاری ذمہ داری ختم نہیں ہوتی ہے۔

خدا کا قانون موت اور انبیاء (ع)

”و لقبلہ ما حل بانبياء اللہ و رسلہ؟“

(اور اس سے پہلے بھی خدا کے انبیاء اور رسل پر کیا گزری ہے؟)

پیغمبر اسلام (ص) سے قبل دوسرے انبیاء پر کیا آن بنی تھی سوائے اس کے کہ وہ سب موت سے ہم آغوش ہوئے؟ پس موت ایک نئی چیز نہیں تھی اور پیغمبر اسلام (ص) کو بھی دوسرے لوگوں اور انبیاء کی طرح ایک دن اس دنیا کو الوداع کہنا تھا۔

” حکم فصل وقضاء حتم “

(۔ قانون موت۔ خدا کا قطعی حکم اور حتمی قضاء۔ میں سے ایک۔ ہے)

موت خدا کا حتمی اور ناقابل تغیر قانون ہے اور تمام انسانوں نے مرنا ہے۔ قرآن کریم میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ: ”کل نفس ذائقة الموت (۱)“ (ہر نفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے) اور رسول خدا (س) بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھے۔

حضرت فاطمہ (ع) یہاں اس آیت کریمہ کی تلاوت فرماتی ہیں جو رحلت پیغمبر (س) کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔

”وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل، اَفَاَنْ مَاتَ او قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ (۲)“

(محمد (س) صرف اللہ کا رسول ہے اس سے پہلے سے بھی کئی رسول گزرے ہیں۔

اگر ہمارا حبیب۔ وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم جاہلیت کی طرف واپس پلٹ جاؤ گے؟)

در اصل قرآن میں خداوند یہ بات بتا دینا چاہتا ہے کہ رحلت رسول (س) کے بعد لوگ اپنے ماضی (یعنی جاہلیت کے آداب و رسوم) کی طرف پلٹ جائیں گے، ہماری بعض روایات میں موجود ہے کہ: ”ارتد الناس بعد رسول الله الا ثلاثة۔ او اربعة۔“ (پیغمبر کے بعد سوائے تین یا چار آدمیوں کے باقی تمام لوگ اپنے ماضی کی طرف پلٹ گئے تھے) بعض روایات میں تین افراد اور بعض میں چار افراد کا ذکر ہوا ہے کہ وہ دین پر ثابت قدم رہے، شیعہ اور اہل سنت کی روایات کی کتب میں، صحیح بخاری میں مذکور ہے کہ:

”قیامت کے دن رسول خدا (س) دکھیں گے کہ ان کے اصحاب کو شمال (جہنم) کی طرف لے جا رہے ہیں۔ آپ (س) دعا کریں گے کہ ”یا رب اصحابی“ پروردگارا! یہ میرے اصحاب ہیں انہیں نجات دے تو خدا فرمائے گا کہ: ”انک لاتدری ما احدثوا بعدک“ آپ (س) نہیں جانتے کہ تمہارے بعد ان لوگوں نے کیا کیا ہے، تو پیغمبر اکرم (س) فرمائیں گے کہ: ”وکنت علیہم شہیداً ما دمت فیہم،

فلما توفيتني كنت انت الرقيب عليهم“ جب تک ان کے درمیان میں زندہ رہا ہوں میں خود ان کے اعمال و کردار کا گواہ تھا لیکن جب تو نے میری جان لے لی ہے تو، تو خود ان کے اعمال و کردار کو دیکھ رہا تھا“ (۱)۔

یہ حدیث صحیح بخاری اور سنن ترمذی دونوں میں ہے اور اس بات پر دلالت رکھتی ہے کہ پیغمبر (م) کے بعد آپ (م) کے بہت سارے صحابی بدل گئے اور رسول خدا (م) کی راہ و روش سے منحرف ہو گئے، لیکن مجھے۔ اہل سنت بھائیوں پر۔ تعجب ہوتا ہے کہ وہ اصحاب کی اتنی حامی بھرتے ہیں اور ان کے اقوال کو حجت مانتے ہیں! حالانکہ صحیح بخاری اور سنن ترمذی میں جو ان کی معتبر کتابوں میں سے ہیں، ایسی روایات موجود ہیں جو صراحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ پیغمبر (م) کی وفات کے بعد بہت سارے اصحاب نے رنگ بدلا اور قیامت کے دن جہنم میں جائیں گے۔ ایسی روایات اور صحابہ کے ایسے کردار کے باوجود۔ کس منطق کی بنیاد پر اہل سنت، صحابہ کے اقوال کو حجت مانتے ہیں اور سنت رسول (م) کی طرح اس پر اعتماد کرتے ہیں؟ جو افراد۔ اسلام کو پشت کر کے۔ جاہلیت کی طرف پلٹ کر چلے گئے ہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ انہوں نے خدا کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ انہوں نے خود کا نقصان کیا ہے۔ اسی لئے آپ آئیہ شریفہ کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

”ومن ينقلب على عقبيه فلن يضر الله شيئا“

(جو شخص اپنی ایڑی کے بل پیچھے پلٹ جائے تو وہ ہرگز خدا کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا)

”سيجزى الله الشاكرين (۲)“

(اور خداوند عنقریب شکر گزار بندوں کو۔ ان کی حق پر پائیداری اور نیک اعمال کا۔ اجر عنایت فرمائے گا) جس آئیہ کریمہ سے حضرت زہراء (ع) نے تمسک فرمایا ہے وہاں خداوند متعال، اپنی نعمتوں کے مقابلے میں ناشکرے اور شکر گزار دونوں قسم کے افراد کی حالت بیان فرماتا ہے، ناشکرے اور ناسپاس

۱۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۴۷ سورۃ المدہ کی تفسیر کے ضمن میں، سنن ترمذی ج ۵ ص ۴۲ سورۃ انبیاء کی تفسیر کے ضمن میں۔

۲۔ سورۃ آل عمران / ۱۴۴

بندوں کے بارے میں فرمایا کہ: جو شخص اسلام اور پیغمبر اسلام (م)۔ کہ جو درحقیقت رحمۃ للعالمین (م) ہیں۔ کی نعمت کو پانے کے بعد دوبارہ جاہلیت کا رخ کرے اور اسلامی اقدار کو پامال کرے، اسے جانتا چاہئے کہ اس فعل سے خود اس کو نقصان ہوگا اور وہ خدا کا کچھ پگاڑ نہیں سکتا۔ البتہ جو شکر گزار رہے اور پروپیگنڈوں سے متاثر ہو کر۔ جاہلیت کی طرف واپس لوٹنے کے بجائے۔ حق و حقیقت کا دفاع کرے، ان کے بارے میں خدا فرماتا ہے کہ وہ عنقریب نیک جزا پائے گا۔

انصار سے حضرت زہراء (ع) کا شکوہ:

”ایہا بنی قیلہ!“

(اے قیلہ کے فرزندو! تم سے یہ بات بہت بعید تھی)

”ایہا“ ہیحات کے معنی میں اسم فعل ہے اور کسی چیز یا کام کے دور ہونے اور بعید ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ”قیلہ“ ایک عورت کا نام ہے کہ اس و خرنج کے قبائل، اسی عورت کی نسل سے تھے۔ دراصل انصار انہی دو قبیلوں کے افراد پر مشتمل تھے اور انہی لوگوں نے پیغمبر (م) کی بیعت کی اور آنحضرت (م) کو مدینہ۔ اس وقت کے یثرب۔ میں تشریف لانے کی دعوت دی اور آپ (م) نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد وہاں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔

یہاں حضرت زہراء (ع) انصار کو مخاطب قرار دیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ: ”ایہا بنی قیلہ“ (قیلہ کے فرزندو! تم سے یہ بات بہت بعید تھی۔ کہ تم حق کی حمایت کے بجائے ظالم کے حامی بن جاؤ۔)

”اٰھضم تراث ابی؟“

(کیا میں اپنے بابا کی میراث میں بھی مظلوم ہوں اور اس سے محروم رہوں؟)

یعنی، کیا حالات اس حد تک ابتر ہو چکے ہیں کہ ایک مسلمان معاشرے میں پیغمبر (م) کی اکلوتی بیٹی اس قدر ظلم سے لیکن کوئی اس کا دفاع نہ کر سکے؟!

”وانتم بمرءى منى ومسمع ومنتدى ومجمع“

(در حالانکہ تم میری آنکھوں کے سامنے ہو، تمہاری باتیں میں سنتی ہوں اور ہم ایک ہی مقام میں ہیں!)
 ”متدی“ باب افتعال مادہ ”ندی“ سے اسم مکان ہے اور جمع ہونے کی جگہ (جلسہ گاہ، ہال) کو کہا جاتا ہے۔ ”دار الندوة“ بھی اجتماع کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

آپ فرماتی ہیں کہ: تم میرے سامنے ہو، میں تمہاری باتوں کو سنتی ہوں، ہم ایک ہی جگہ پر جمع ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ مجھ پر ظلم ہو رہا اور میرا حق پامال ہو رہا ہے اور میں تمہیں مدد کے لئے پکار رہی ہوں اور تم اسے سنتے ہی نہیں ہو! یعنی ماضی میں ہم ایک ساتھ تھے ہمارا محاذ اور دشمن ایک تھا۔ تمہارا پیغمبر (س) کے ساتھ دفاعی معاہدہ بھی تھا۔ لیکن سیاسی حالات نے تمہیں اس قدر بدل دیا ہے کہ میرا حق ضائع ہو رہا ہے اور تم یا تو دفاع کرنا ہی نہیں چاہتے یا دفاع کرنے کی سکت نہیں رکھتے؟!

”تلبسکم الدعوة وتشملکم الخبرة“

(میری دعوت تم تک پہنچ رہی ہے اور حالات سے تم باخبر ہو!)

یعنی، تم بخوبی جانتے ہو کہ ہمارے اوپر کیا مظالم ہوئے اور کس قدر ہماری حرمت پامال ہوئی۔ ظلم کے خلاف ہماری مدد اور حمایت کرنے کی، میں نے تمہیں دعوت دی ہے، تمہیں پکارا ہے لیکن تم خاموش رہے۔ لہذا تم نہ تاریخ کو یہ جواب دے سکتے ہو اور نہ ہی خدا کی عدالت میں یہ عذر پیش کر سکتے ہو کہ زہراء (ع) پر ہونے والے مظالم کا ہمیں علم نہ تھا۔

”وانتم ذوو العدد والعدة والاداة والقوة“

(حالانکہ تم افرادی قوت، وسائل اور سیاسی نفوذ کے اعتبار سے قوی اور طاقتور ہو!)

”عدة“ یعنی، افرادی قوت، ”عدة“ یعنی، ہر وہ چیز جو انسان کی طاقت کا باعث بنے جیسے اجتماعی مقام اور با اثر ہونا وغیرہ ”اداة“ یعنی، اسباب و وسائل ”قوة“ یعنی، طاقت اور قدرت۔

مقصود یہ ہے کہ تمہاری آبادی زیادہ ہے اور تم جنگی ساز و سامان اور دوسرے اسباب و وسائل سے بھی یلیس ہو اور اپنے معاشرے میں نفوذ بھی رکھتے ہو اس طرح تم ہر لحاظ سے اس بات کی طاقت رکھتے ہو۔ کہ حق کی حمایت کرو۔ لیکن تم اپنے پیغمبر (س) کی یادگار بیٹی پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھتے ہوئے بھی خاموش

تماشائی بنے بیٹھے ہو!!

”وعندكم السلاح والجنة“

(حالانکہ تمہارے پاس اسلحہ اور ڈھال بھی موجود ہے)

”جہنہ“ یعنی، ڈھال، مقصود یہ ہے کہ تم جنگی ساز و سامان کے اعتبار سے بھی لیس اور آمادہ ہو، پس حکومت وقت کی طاقت سے کیوں ڈرتے ہو؟

”توافيكم الدعوة، فلا تجيبون!“

(پے درپے تمہیں دعوت دی جا رہی ہے لیکن تم جواب نہیں دیتے!)

اس محلے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین (ع) اور حضرت فاطمہ زہراء (ع) نے لوگوں کو بار بار دعوت دی تھی لیکن ان کی دعوت پر کسی نے توجہ نہیں دی تھی اور لبیک کہنے سے گریز کیا تھا۔ پس یقیناً ان کے پاس خدا کے سامنے کوئی عذر نہیں ہے، کیونکہ اہل بیت (ع) پر ہونے والے مظالم سے آگاہ تو تھے لیکن خوف و ہراس یا مقام و منصب اور مادی مفادات کی لالچ میں ساکت ہو گئے تھے۔

”وتاتيكم الصرحة، فلا تغيثون!“

(ہماری فریاد اور استغاثہ کی آواز تم تک پہنچ رہی ہے لیکن تم کوئی جواب نہیں دیتے ہو!)

صدائے استغاثہ سے مراد، حضرت زہراء (ع) اور امیر المؤمنین (ع) کے خطبات اور ان سے تعاون کی دعوت ہے۔

انصار کی مجاہدانہ خدمات،

”وانتم موصوفون بالكفاح، معروفون بالخير والصلاح“

(حالانکہ تم جنگجوئی و شجاعت اور خیر و صلح کے لحاظ سے شہرت رکھتے ہو!)

ڈھال کے بغیر دشمن سے لڑنے کو ”کفاح“ کہا جاتا ہے اور یہ ان کی شجاعت اور شہامت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، یعنی تم دلیر اور نڈر تھے لیکن آج تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ڈرتے ہو؟

”والنخبة التي انتخبت“

(اور تم انتخاب شدہ اور برگزیدہ لوگ تھے)

یعنی، تم معمولی انسان نہ تھے بلکہ صاحب کردار اور قد آور شخصیات تھے اور اس طرح تم ملت کے برگزیدہ افراد مانے جاتے تھے۔

”والخيرة التي اختيرت لنا اهل البيت“

(اور تم وہ برگزیدہ قوم ہو جو ہم اہل بیت کے لئے انتخاب ہوئے ہو)

یعنی، عام لوگوں کے درمیان تم میں کچھ خصوصیات پائی جاتی تھیں تم پیغمبر (ص) اور ہمارے حامی و مددگار تھے اور ہماری حمایت کرتے تھے۔ اس طرح تم اہل بیت کا مخصوص گروہ اور ان کی پارٹی کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ لیکن تم اچانک بدل گئے ہو اور ہم سے روگردانی اختیار کر لی ہے۔

”قاتلتم العرب وتحملتم الكد والتعب“

(تم نے عرب کے مشرک، سرغنوں سے جنگ لڑی اور سختیاں اور مشکلات برداشت کیں)

یعنی، اسلام کی خدمت میں تم طویل اور درخشان خدمات کے حامل ہو، خطرناک مواقع پر تم حاضر رہے، عرب کے سرداروں سے جنگیں لڑیں اور اس راہ میں مشکلات، مصائب اور سختیاں برداشت کیں۔

”ناطحتم الامم وكافحتم البهم“

(مشرک قوموں سے جنگیں لڑیں اور ہڈی اور ہٹ دھرم جنگجوؤں کا مقابلہ کیا)

”ناطح“ یعنی، سنگ مارنا، یہ جنگ و جہاد کے لئے کنایہ کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ ”بہم“ ”بہتہ“ کی جمع ہے اور ایسے دلیر و نڈر افراد کو کہا جاتا ہے جو ہٹ دھرم ہوں اور منطق و استدلال سے عاری اور اچانک مشتعل ہو کر حملہ کر دیتے ہوں۔

آپ (ع) کا مقصد یہ ہے کہ تم گروہ انصار، سرکشی، بگاڑ اور انحراف کے مقابلے میں جہاد کرنے والے تھے، قوموں کی جہالت و گمراہی کے بارے میں بے تفاوت نہ تھے اور لا ابالی نہ تھے، تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا اور اس راہ میں خطرات کی پردہا بھی نہیں کیا کرتے تھے، لیکن آج حکمران

ٹولے کی انحراف، بگاڑ اور اسلام، قرآن اور سنت رسول (ص) کے نام پر ظلم و ستم پر تم خاموش کیوں ہو؟
 تماشا کیوں دیکھ رہے ہو؟ یہاں تک کہ تم حق و عدالت، مظلوم کی حمایت اور اسلامی اقدار کی تجدید
 حیات کے لئے دعوت دینے والے اہل بیتؑ کے ہمنوا ہونے اور ان کے ساتھ تعاون کرنے سے
 کتراتے ہو، آخر کیوں؟

”لَا نَبْرَحُ أَوْ تَبْرَحُونَ، تَامِرْكُمْ فَتَاتَمَرُونَ“

(۔ جبکہ ماضی میں۔ جب بھی ہم۔ پیغمبر (ص) اور اہل بیت (ع)۔ تمہیں کوئی حکم دیتے تو تم اطاعت کرتے تھے۔)
 ”لَا نَبْرَحُ أَوْ تَبْرَحُونَ“ ہم اور تم ہمیشہ سے ایسے ہی رہے کہ ”تَامِرْكُمْ فَتَاتَمَرُونَ“ جب ہم تمہیں حکم دیتے
 تھے تو تم اس کی اطاعت کرتے تھے۔ اس طرح تمہاری یہ حالت تھی کہ اپنی ہستی کو بھی اسلام اور رسول
 خدا (ص) پر قربان کر دیتے تھے اور ہمیشہ ہم اہل بیتؑ کے فرمانبردار تھے آج کس طرح تمہیں گوارا
 ہے کہ ہمارے اوپر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے جائیں اور تم خاموش رہو اور ہم تم سے جتنی بھی مدد اور
 تعاون کی درخواست کریں، تم جواب بھی نہ دو؟

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

نواں درس:

- ✽ اسلام کی کامیابی میں اہل بیت (ع) کا کردار
- ✽ انقلاب کے بعد رجعت پسندی کے آثار
- ✽ محافظہ کار اور عہد شکن افراد کا انجام
- ✽ خاموشی کی وجہ، دنیا پرستی اور راحت طلبی ہے
- ✽ جاہلیت کی طرف بازگشت
- ✽ سوز دل اور اتمام حجت
- ✽ سازش کے خاتمے کی تصویر کشی

حَتَّى إِذَا دَارَتْ بِنَا رَحَى الْإِسْلَامِ، وَ دَرَّ حَلَبُ الْأَيَّامِ، وَ خَضَعَتْ ثَغْرَةُ
[نَمْرَةٍ] الشُّرْكِ، وَ سَكَنَتْ فُورَةُ الْإِفْكِ، وَ خَمَدَتْ نِيرَانُ الْكُفْرِ، وَ هَدَأَتْ دَعْوَةُ
الْهَرَجِ، وَ اسْتَوْسَقَ نِظَامُ الدِّينِ، فَأَنْتَى حَزَنُكُمْ بَعْدَ الْبَيَانِ؟ وَ أَسْرَزْتُمْ بَعْدَ الْإِعْلَانِ؟
وَ نَكَضْتُمْ بَعْدَ الْإِقْدَامِ؟ وَ أَشْرَكْتُمْ بَعْدَ الْإِيمَانِ؟ بِؤْسًا لِقَوْمٍ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ
عَهْدِهِمْ، وَ هَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ، وَ هُمْ بَدَّءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ، أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللَّهُ أَحَقُّ
أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ.

أَلَا وَ قَدْ أَرَى أَنْ قَدْ أَخْلَدْتُمْ إِلَى الْخَفْضِ وَ أَبْعَدْتُمْ مَنْ هُوَ أَحَقُّ بِالْبَسْطِ
وَ الْقَبْضِ وَ أَقْوَاهُمْ عَلَيْهِ، وَ خَلَوْتُمْ بِالدَّعَةِ، وَ نَجَوْتُمْ بِالضِّيقِ مِنَ السَّعَةِ [وَ نَجَوْتُمْ
مِنَ الضِّيقِ بِالسَّعَةِ]، فَمَجَجْتُمْ مَا وَعَيْتُمْ، وَ دَسَعْتُمْ الَّذِي تَسَوَّغْتُمْ، فَإِنْ تَكْفُرُوا
أَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ.

أَلَا وَ قَدْ قُلْتُ مَا قُلْتُ هَذَا عَلَى مَعْرِفَةٍ مِنْى بِالْخَذَلَةِ [الْجَذَلَةِ] الَّتِي
خَامَرَتْكُمْ وَ الْغَدْرَةَ الَّتِي اسْتَشْعَرَتْهَا قُلُوبُكُمْ؛ وَلَكِنَّهَا فَيْضَةُ النَّفْسِ، وَ نَفْثَةُ الْغَيْظِ،
وَ خَوَرُ الْقَنَاةِ وَ بَثَّةُ الصُّدْرِ، وَ تَقْدِمَةُ الْحُجَّةِ؛ فَذُوقُوا نَكْمُوهَا فَاحْتَقِبُوهَا دَبْرَةَ الظَّهْرِ،
نَقْبَةَ الْخَفِّ، بَاقِيَةَ الْعَارِ، مُوسُومَةَ بَغْضَبِ اللَّهِ [الْجَبَّارِ]، وَ شِنَارَ الْأَبَدِ، مُوَصُولَةَ
بِنَارِ اللَّهِ الْمُوقَدَةِ الَّتِي تَطْلُعُ عَلَى الْأَفْتِدَةِ؛ فَبِعَيْنِ اللَّهِ مَا تَفْعَلُونَ؟ وَ سَيَعْلَمُ الَّذِينَ
ظَلَمُوا أَيْ مُنْقَلِبٍ يَنْقَلِبُونَ؛ وَ أَنَا ابْنَةُ نَذِيرٍ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ، فَاعْمَلُوا
إِنَّا عَامِلُونَ، وَ انْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس میں ہم نے کہا کہ حضرت زہراء (ع) نے انصار سے فرمایا کہ: تم نے مشرک عرب سرداروں سے جنگیں لڑیں، زحماتیں اور تکالیف برداشت کیں، غیر مسلمان قوموں سے مقابلہ کیا، سرکش، ضدی اور دلیر پہلوانوں سے جہاد کیا، جب بھی رسول خدا (ص) یا ہم اہل بیت میں سے کوئی تمہیں حکم دیتے تو تم اس کی اطاعت کرتے تھے، حریم اہل بیت کا دفاع کرتے تھے، لیکن ابھی تمہیں کیا ہوا ہے کہ اچانک بدل گئے ہو، رحلت رسول (ص) کے بعد ہمارے اوپر بے شمار ظلم و ستم ہو رہے ہیں، ہمارا حق چھینا گیا ہے، تم خاموش ہو اور ہم جتنا بھی تمہیں پکار رہے ہیں تم کوئی جواب نہیں دے رہے ہو اور خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو!!

اب آپ خطبے کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

اسلام کی کامیابی میں اہل بیت (ع) کا کردار:

”حتی اذا دارت بنا ریح الاسلام“

(تم پیغمبر (ص) اور اہل بیت (ع) کے وفادار رہے۔)

یہاں تک کہ ہماری کوششوں کی وجہ سے اسلام کی چکی کا پتھر متحرک ہو گیا)

یعنی، اسلام طاقتور، متحرک اور فعال ہو گیا، یہ کامیابیاں، رسول خدا (س)، حضرت علی (ع)، اہل بیت اور دوسرے سارے مسلمانوں کے ایثار کا ثمر تھیں۔

(۱) ”ودر حلب الایام“

(دنیا میں خیر و برکت دودھ کی طرح فراوان ہوتی)

یعنی، اسلام کے سائے میں خیر و برکت کی فراوانی ہوتی، جب کوئی بھیڑ بکری، گائے یا اونٹنی دودھ دیتی ہے تو یقیناً وہ خیر و برکت کا باعث ہوتی ہے۔

حضرت زہراء (ع) نے اپنے اس کلام میں، اسلام کی کامیابی اور پیشرفت کو تھن سے دودھ جاری ہونے کی حالت سے تشبیہ دی ہے، یعنی آنحضرت (س) اور مسلمانوں کی تکالیف نیز مسلمانوں کی پیغمبر خدا (س) و اہل بیت کی پیروی کی سبب سے دنیا، خیر و برکت سے بھر گئی، اسلام مستحکم ہوا، شرک، نفاق، کفر اور جاہلیت کے آداب و رسوم معاشرے سے بالکل ختم ہو گئے۔

(۲) ”وخصعت نعرۃ۔ ثغرة الشکر“

(شرک کی ناک خاک پر گر دی۔ یا شرک نے گھٹنے ٹیک دیے۔)

حضرت زہراء (ع) کا یہ کلام دو طرح سے نقل ہوا ہے: بعض نسخوں میں ”نعرۃ“ کے ساتھ مذکور ہے۔ ”نعرۃ“ ناک کو کہا جاتا ہے اور کنایۃ تکبر اور غرور کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بنا بریں ”خصعت نعرۃ الشکر“ کا معنی یہ ہو گا، شرک کو ذلت اٹھانا پڑی، یعنی مشرکین کی ناک خاک پر گر گئی اور انہوں نے اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

البتہ بعض دوسرے نسخوں میں ”ثغرة“ کا لفظ ہے اور اس کا معنی یہ ہے، گلہ کا نچلا حصہ یا سینہ۔ اس زمانے میں جب اپنے حریف کو شکست دینا مقصود ہوتی تھی تو وہ کوشش کرتے تھے کہ دشمن کو سینہ کے بل زمین پر لٹا دیا جائے، جیسا کہ آج کل کشتی میں کامیاب ہونے کے لئے اپنے حریف کو پیٹھ کے بل زمین پر لٹا دینے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح حریف اپنی شکست تسلیم کر لیتا ہے۔ یہاں چاہے اصل میں ”نعرۃ الشکر“ ہو یا ”ثغرة الشکر“ مقصود یہ ہے کہ مشرکین نے اسلام کے مقابلے میں

شکست کھائی اور تسلیم ہو گئے اور معاشرے سے شرک اور اس کے آثار مٹ گئے۔

(۳) ”وسكنت فورة الافك“

(اور جھوٹ و تہمت کا طوفان خاموش ہو گیا)

”فورة“ بھڑکنے اور مشتعل ہونے کو کہتے ہیں، حملے کا لفظی معنی یہ ہے کہ جھوٹ اور باطل کی طغیانی ختم ہوئی اب کسی ابوسفیان اور ابو جہل کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ اسلام کے مقابلے میں علم بغاوت بلند کریں اور لوگوں کی جہالت اور حماقت سے فائدہ اٹھا کر ان پر حکومت کریں۔

(۴) ”وخذت نيران الكفر“

(اور الحاد کی آگ بجھ گئی)

”نیران“ آگ کو اور ”خمود“ آگ کے شعلوں کے نابود ہونے کو کہتے ہیں۔ تمہارے اتحاد و یکجہتی اور تمہاری پیغمبر (م) اور ہم اہل بیت کی پیروی اس بات کا سبب بنی کہ مشرکین اسلام کے سامنے تسلیم ہو جائیں اور کفر کی آگ نیز جھوٹ و فریب کی طغیانی خود بخود ختم ہو جائے۔

(۵) ”وهداك دعوة الهدج“

(فتنہ و آشوب کی موجیں رک گئیں)

تمہارے ایثار اور قربانی نیز تمہاری پیغمبر (م) کی پیروی کے نتیجے میں فتنہ و آشوب کی جانب بلانے والوں کی آوازیں دب گئیں اور آج کی اصطلاح میں ”آناشیزم“ کے حامی خاموش ہو گئے۔ فسادِ سرداروں کی طاقت مضاعف ہو گئی اور لوگوں کو حق و عدالت کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی آزادی مل گئی۔

(۶) ”واستوسق نظام الدين“

(اور دین کا نظام حکومت ہم آہنگ و برقرار ہو گیا)

”استیساق (۱)“ یعنی متصل، منظم اور مرتب ہونا۔ مقصد یہ ہے کہ بہت ساری جنگوں، زحمتوں اور

۱۔ استیساق مثل وادی ہے اصل میں استوساق باب استفعال کا مصدر تھا اعلال کی وجہ سے استیساق بنا، کیونکہ اگر واد ساکن ہو اور اس سے پہلے کسرہ ہو تو وہ یاء میں بدل جاتی ہے۔

کافی جدوجہد کے بعد نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کا دینی نظام حیات منظم ہو گیا اور اسلامی حکومت برقرار ہو گئی اس طرح اسلام کو عظمت و شوکت ملی۔

انقلاب کے بعد رجعت پسندی کے آثار:

(۱) ”فانی حرتم بعد البیان؟“

(پس ان بیانات کے بعد تم حیران کیوں ہو۔ یا حق سے کیوں روگردانی کر رہے ہو؟۔)

بعض نسخوں میں ”جرتم“ مذکور ہے بنا بریں معنی یہ ہو گا کہ حق واضح ہونے کے بعد پھر تم جرم اور ظلم کا ارتکاب کیوں کرتے ہو، لیکن اس معنی کے بجائے وہی ”حرتم“ والا جملہ صحیح ہے، ”حرتم، حار، یحور“ اور ”حار، یحار“ دونوں سے آیا ہے اور حیرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مذکورہ کلام کا مقصد یہ ہے کہ: امامت درہمبری اور اس کے شرائط کے بارے میں قرآن اور رسول خدا (س) کے واضح بیانات کے بعد تم کیوں متحیر ہو؟ گویا رحلت رسول (س) کے بعد وہ لوگ ایک قسم کی حیرت اور تذبذب کا شکار تھے، ان کی اسی حیرت اور تذبذب سے، عمر اور ابوبکر کے گردہ نے غلط استفادہ کیا تھا، ”فانی حرتم“ تم کیوں متحیر ہو؟ ”بعد البیان“ حق کے واضح ہونے کے بعد، قرآن اور پیغمبر اسلام (س) کے بیانات اور ان کی ہدایات کے بعد حیرت و سرگردانی کی کوئی وجہ ہی نہیں بلکہ حق و حقیقت کی شناخت میں کسی قسم کی حیرت اور تذبذب کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

البتہ ”حور“ رجوع کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے بنا بریں مذکورہ جملے کا مطلب یہ ہو گا کہ حقیقت کے بیان اور حق واضح ہونے کے بعد، تم حق سے کیوں پھر گئے اور تم نے باطل کی طرف کیوں رجوع کیا؟

(۲) ”واسررتم بعد الاعلان؟“

(آشکار کرنے کے بعد چھپاتے کیوں ہو؟)

چونکہ یہ جملہ پہلے حملے پر عطف ہے لہذا ”انی“ اس حملے کی ابتداء میں بھی آئے گا۔ مقصد یہ ہے کہ: تم

نے غدیر خم میں علی الاعلان حضرت علی علیہ السلام کی حمایت کی تھی اور آشکارا ان کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی اس کے بعد آج تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ علی الاعلان حق کی حمایت نہیں کرتے ہو؟
 ”واسررتم“ یعنی حق کے بیان کے سلسلے میں کیوں خفیہ طریقوں کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ ”بعد الاعلان“
 خصوصاً چند دن قبل حق کی واضح اور آشکار حمایت کرنے کے بعد اور،

(۳) ”ونکصتم بعد الاقدام؟“

(حق کی طرف رخ کرنے کے بعد کیوں پیچھے ہٹ گئے ہو؟)

”نکص و نکوص“ پیچھے ہٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تم تو سوچ سمجھ رکھنے والے، حقائق کی تشخیص کرنے والے اور حق کی راہ میں کوشش اور قیام کرنے والے تھے۔ آخر کیا ہوا ہے کہ آج تم پیچھے ہٹ گئے ہو اور خاموش تماشائی بنے بیٹھے ہو؟ اور حق کی حمایت سے گریزاں ہو، تمہارا کیا خیال ہے کہ ان انحرافات کے بارے میں تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟

(۴) ”واشركتم بعد الايمان“

(اور ایمان لانے کے بعد تم کس طرح مشرک بن گئے ہو؟)

حق کو پہچاننے کے بعد اس کا دفاع نہ کرنا بھی شرک کی ایک قسم ہے، شرک صرف ذات اور صفات میں کسی کو خدا کا شریک بنانے میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی اطاعت کرنا بھی شرک کی ایک قسم ہے کہ جس سے خدا نے منع کیا ہو یا اس کی اجازت نہ دی ہو، کیونکہ اطاعت بھی ایک قسم کی عبادت اور پرستش ہے اور عبادت صرف اور صرف خدا کی ہونی چاہئے۔ پیغمبر (ص) اور امام (ع) کی اطاعت دراصل خدا کی اطاعت میں شامل ہے کیونکہ خدا نے ہی ان کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے۔

حضرت زہراء (ع) مسجد میں موجود سامعین سے فرماتی ہیں کہ: کسی زمانے میں تم صحیح اور خالص ایمان کے مالک تھے، آج کیوں اپنے عقیدہ کے برخلاف ایک باطل حکومت کے ساتھ تعاون کرتے ہو؟ اور اس باطل حکومت کی اطاعت کر کے شرک کے مرتکب ہوتے ہو؟

اعتدال پسند اور عہد شکن افراد کا انجام ،

حضرت فاطمہ زہراء (ع) قرآنی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے خطبے کو جاری رکھتی ہیں۔

”يُؤْسَأُ لِقَوْمٍ يُكْفِرُوا اِيْمَانِهِمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ (۱)“

(جہاد و برباد ہو وہ قوم جو اپنی قسموں کو توڑتی ہے وہ بھی عہد و پیمان باندھنے کے بعد تاکہ اسلام کا دفاع کریں۔)

”وَهُمْ اَبَاخَرَجِ الرَّسُولِ وَهُمْ بَدَّءُ وَكَمْ اَوَّلُ مَرَّةٍ (۲)“

(انہوں نے رسول خدا (ص) کو مدینہ سے باہر نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا

اور انہی لوگوں نے تمہارے خلاف سازش کی ابتداء کی ہے)

یہ آیہ سورہ توبہ کی آیت کا ایک حصہ ہے جو مدینہ کے یہودیوں کی عہد شکنی اور سازش کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور حضرت زہراء (ع) اس آیت کو سقیفہ کے عہد شکن گروہ پر تطبیق کر رہی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ (ع) کی نظر میں ان کی خیانت، یہود مدینہ کی خیانت سے کمتر نہ تھی۔

”اتَخْشَوْنَهُمْ فَاَلَيْسَ اِلٰهُكُمْ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ (۳)“

(کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ حالانکہ خدا سزاوارتر ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر تم با ایمان ہو)

یعنی، کیا تم ان چند لوگوں سے ڈرتے ہو جو سقیفہ میں جمع ہو گئے ہیں اور ڈرامائی انداز میں خلیفہ انتخاب کیا ہے اگر تم خدا پر یقین اور ایمان رکھتے ہو تو خدا اس بات کے لئے زیادہ سزاوار ہے کہ تم صرف اسی سے ڈرو۔

خلاصہ یہ کہ صحابہ لیبر قسم کے افراد تھے لہذا حکومت وقت کے ساتھ ظاہری طور پر ہم آہنگ ہو کر حق اور حضرت علی (ع) کی حمایت نہیں کرتے تھے یہاں حضرت زہراء (ع) ان کی سرزنش کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے شکوہ بھی کرتی ہیں اور فرماتی ہیں تم صرف کھاپی کر آرام کرنا چاہتے ہو اور حق سے دفاع کی راہ میں اپنے آرام و سکون کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہو۔

کسی زمانے میں ڈیموکریٹ اور حزب تودہ کے درمیان زبردست مقابلہ تھا تو کسی سے پوچھا گیا کہ تم

ڈیموکریٹ پارٹی کے رکن ہو یا حزب تودہ کے، تو اس نے جواب دیا کہ بھئی! میں عیالدار ہوں۔ اب صحابہ کے لئے کوئی فرق نہیں تھا کہ حکومت حضرت علی (ع) کے ہاتھ میں رہے یا ابوبکر کے ہاتھوں میں۔ البتہ ان کے لئے جو چیز اہم تھی وہ آسائش اور آرام دہ زندگی تھی، اسی لئے ہر آنے والی حکومت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے تھے!۔

خاموشی کی وجہ، دنیا پرستی اور راحت طلبی ہے۔

”الاوقدارى ان قد اخلدتم الى الخفض“

(آگاہ رہو! میں جانتی ہوں کہ تم نے ہمیشہ عیاشی اور آسائش کو اپنا یا ہے)

”خفض“ یعنی، عیاشی اور آسائش۔ حضرت زہراء (ع) کا مقصد یہ ہے کہ تم اب مبارزہ اور جہاد کو چھوڑ چکے ہو اور راحت کے ساتھ عیاشی کی زندگی گزارنا چاہتے ہو! ”اخلدتم“ کے لفظ سے شاید یہ سمجھانا مقصود ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے دنیا کے دلدادہ بن گئے ہو جس کے نتیجے میں ایثار و قربانی کی صفت کو تم کھو چکے ہو۔

”وابعدتم من هو احق بالبسط والقبض واقويهم عليه“

(خلافت سے اس شخص کو تم نے دور رکھا جو اسلامی ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے میں سب سے زیادہ حقدار تھا)

اور سب سے زیادہ اس پر طاقت رکھتا تھا)

امیر المؤمنین (ع) کا اسلام میں جو مقام تھا، اس لحاظ سے اسلامی حکومت اور خلافت کے آپ (ع) ہی حقدار تھے لیکن تم نے ایسے لوگوں کو اقتدار تک پہنچایا جو اس کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

یہاں کلمہ ”احق“۔ جو کہ اسم تفضیل ہے۔ کا یہ معنی نہیں کہ دوسرے افراد بھی اس منصب کی اہلیت رکھتے تھے لیکن حضرت علیؑ زیادہ حقدار تھے۔ بلکہ انحصار کے لئے ہے، یعنی تمام مسلمانوں میں آپؐ کی ذات مبارک ہی ایسی تھی جو اس منصب کی حقدار تھی باقی کسی میں بھی اس مقام کی اہلیت نہیں پائی جاتی تھی۔ اور یہ جملہ اس آیہ شریفہ کی مانند ہے کہ:

”اذلک خیر ام جنۃ الخلد (۱)“ (- کیا یہ دنیا کی دلہنگی - بہتر ہے یا بہشت جاویدان ؟) اس آئیہ شریفہ کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس پست دنیا کے ساتھ محبت اور دلہنگی بھی اچھی چیز ہے لیکن اس کے مقابلے میں بہشت زیادہ بہتر ہے - ایسی بات ہرگز نہیں - بلکہ آئیہ کا مقصد یہ ہے کہ صرف بہشت جاویدان ہی بہتر اور اچھی ہے اور جتنی بھی خوبیاں اور کمالات ہیں وہ جنت میں ہیں - دنیا میں نہیں - یہاں پر بھی حضرت زہراء (ع) جو فرماتی ہیں کہ: اسلامی ریاست کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے حضرت علیؑ ”احق“ تھے یعنی آپؑ کے علاوہ اس مقام کا کوئی اہل ہی نہ تھا: آپؑ کا مقصد یہ نہیں کہ غاصبین خلافت بھی اہلیت رکھتے تھے لیکن مولائے متقیان (ع) اس کے زیادہ اہل تھے -

”وخلوتم بالدعة“

(تم نے سکون، آسائش اور عیش و نوش کی وجہ سے خلوت نشینی اختیار کی)

”دعہ“ جنگ، سختی و زحمت کے مقابلے میں ہے سکون اور راحت طلبی کو ”دعہ“ کہا جاتا ہے۔ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی بے تفاوتی اور آسائش نے ہی غضب خلافت کی راہ ہموار کی تھی، کیونکہ اگر اسلامی اقدار و اہداف سے لوگ وفادار ہوتے تو چند اقتدار کے بھوکے لوگوں کو اس بات کی جرات نہ ہوتی کہ وہ عوام فریبی اور دین، قرآن اور سنت رسول (ص) سے تمسک اور دفاع کے نام پر امامت کی راہ کو منحرف کر دیں اور امامت کو بادشاہت میں تبدیل کرنے کی راہ ہموار کریں۔ حضرت زہراء (ع)، حضرت علیؑ کو خلافت اور امت کی رہبری سے دور رکھنے کی علت، لوگوں کے سکون اور دنیا پرستی کو قرار دیتی ہیں۔

”ونجوتم بالضيق من السعة“

(اور تم نے وسعت و کشادگی سے - فرار کر کے - تنگ جگہ میں پناہ لے لی ہے)

یعنی، تم نے اس چیز کو چھوڑ دیا جس میں وسعت اور کشادگی تھی اور ایسی جگہ پر چلے گئے جو تنگ ہے۔ مقصود یہ ہے کہ تم نے برحق اور الہی حکومت کو چھوڑ دیا جس میں عدالت اور حق کے لئے وسعت تھی اور باطل حکومت کا رخ کیا جو انسان کے لئے تنگی اور سختی کا سبب ہے، اس طرح تم نے اپنے آپ کو چند خود

خواہ اور جاہ طلب افراد کی خواہشات نفسانی کا شکار بنایا ہے
 البتہ یہ جملہ بحار الانوار میں دوسری عبارت کے ساتھ ذکر ہوا ہے جو زیادہ مناسب نظر آتا ہے،
 چونکہ اپنے ما قبل سے مطابقت رکھتا ہے:

”ونجوتم من الضيق بالسعة“

(اور تم نے خود کو تنگی اور سختی سے آسائش اور وسعت کی طرف نجات دی)
 یعنی، اگر حق کی حمایت کرتے تو یقیناً ابو بکر اور عمر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا اور تم تنگی، سختی اور دباؤ کا
 شکار ہوتے، لیکن حق کی حمایت کے راستے میں موجود سختیوں سے تم نے اپنے آپ کو نجات دلائی اور
 ان کی ہمراہی میں راحت و سکون کی زندگی اپنائی!!

”فمجبتم ما وعيتم“

(اس طرح جو کچھ تم نے جمع کیا تھا اسے ہوا میں اڑا دیا)
 ”مج“ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو انسان تھوک کر منہ سے باہر پھینکتا ہے۔ جیسے کوئی منہ میں پانی بھر
 لے اور اس کو باہر پھینک دے۔ مقصود یہ ہے کہ: خالص ایمان جو تمہارا معنوی سرمایہ تھا اور تم نے دل
 کی گہرائیوں میں محفوظ کیا ہوا تھا سیاست کا رخ بدلتے ہی اور امتحان کا وقت آتے ہی تم نے اس کا سودا
 کیا اور الٹی کر کے دور پھینک دیا اور حق کو پا مال کیا

جاہلیت کی طرف بازگشت:

”ودسعثم الذی توغتم“

(اور جو کچھ تم نے کھایا اسے نکال باہر پھینکا)
 ”دسعث“ اونٹ اور جانوروں کی جگالی۔ اور منہ بھر قے کرنے۔ کو کہا جاتا ہے جبکہ ”تسوع“ اس
 خوشگوار چیز کو کہا جاتا ہے جس کو کھانے کے بعد قے کے ذریعے دوبارہ باہر نکالے۔
 اس تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت کو حاصل کرنے اور دل کی گہرائیوں میں اتارنے کے

بعد تم نے اسے اپنے سے دور کر دیا اور جس قدر تم نے۔ پیغمبر (س) کی زندگی میں ایمان اور انسانیت کے اعتبار سے۔ ترقی کی تھی ابھی اسی قدر دوبارہ انحطاط اور تنزل کا شکار ہو گئے ہو۔

”دسعتّم“ واپس لوٹا دیا ہے ”الذی تسو غنّم“ اس چیز کو جسے تم نے خوشی اور مزے سے حلق میں اتارا تھا، یعنی جس ایمان کو تم نے خوشی اور معنوی لذت کے ساتھ قبول کیا تھا اسے مسترد کر دیا، اس طرح تم ایک قسم کے کفر و ارتداد کے مرتکب ہو گئے جیسا کہ روایت میں بھی آیا ہے کہ: ”ارتد الناس بعد رسول الله الاثلاثه - او اربعة -“ (پیغمبر (س) کے بعد سوائے تین۔ یا چار۔ افراد کے، باقی سب مرتد ہو گئے) البتہ جس طرح ایمان کے درجات ہیں اسی طرح کفر و ارتداد کے بھی مراتب ہیں۔ کفر و ارتداد کے خفیف مراتب، مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ جمع ہو سکتے ہیں کیونکہ ہر گناہ اس بات کی علامت ہے کہ انسان، خدا کی خدائی، قدرت، قیامت پر مکمل یقین نہیں رکھتا یا اگر یقین رکھتا بھی ہے تو اس یقین میں کمی آگئی ہے۔ عدم یقین کا یہ مرض جس قدر بڑھتا جائے گا کفر و ارتداد کے مراتب بھی شدید تر ہوتے جائیں گے اور آخری درجے پر آکر انسان اصطلاحی مرتد بن جاتا ہے۔

”فان تکفروا انتم ومن فی الارض جمیعاً فان الله لغنی حمید (۱)“

(پس اگر تم اور روئے زمین کے تمام لوگ کافر ہو جائیں۔ تو خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

کیونکہ خداوند غنی اور صاحب حمد ہے)

”کفر“ کا لغوی معنی پردہ اور ڈھانپنا ہے۔ لیکن شرعی اصطلاح میں خدا کے منکر کو کافر کہا جاتا ہے۔ کفر کے مراتب ہیں، کبھی انسان واقعی اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے اور خدا و پیغمبر (س) کا انکار کر دیتا ہے، اس صورت میں کافر سے مربوط احکام اس پر لاگو ہوں گے۔ جو فقہی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اور کبھی انسان ایمان کے بعض مراتب اور درجات کو پامال کرتا ہے، اس کو بھی کافر کہا جاتا ہے یعنی اس کے ایمان کے بعض مراتب ڈھانپے گئے ہیں اس طرح کفر کے بلکے اور

خفیف مرتبہ کے حامل شخص کو بھی کافر کہا جاتا ہے (۱)۔

”فان کفرتم انتم ومن فی الارض جمیعاً“ اگر تم اور روئے زمین پر بسنے والے تمام لوگ کافر بن جائیں ”فان اللہ لغنی حمید“ خدا بے نیاز اور صاحب حمد ہے۔ خدا کو تمہاری ضرورت نہیں، ایسا خیال نہ کریں کہ اپنے کفر کے ذریعے خدا کو نقصان پہنچا سکیں، نہیں ایسا ہرگز نہیں بلکہ تم صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاؤ گے۔

سوز دل اور اتمام حجت،

اس کے بعد حضرت زہراء (ع) اپنے خطبے کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: یہ بات تمہیں بتادوں کہ اگر میں یہاں آکر خطبہ دیتی ہوں اور فدک اور میرے اور میرے شوہر کے غضب شدہ حقوق کے بارے میں تم سے خطاب اور عتاب کرتی ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ تم سے توقع رکھتی ہوں کہ تم میری اور امیر المؤمنین (ع) کی بدد کرو گے، نہیں ایسی امید نہیں رکھتی ہوں، کیونکہ میں تمہیں پہچان چکی ہوں اور جانتی ہوں کہ تم حق کی خاطر، خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہیں ہو! بلکہ میں درد دل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اتمام حجت بھی کرنا چاہتی تھی، اسی لئے آپ فرماتی ہیں کہ:

”الا وقد قلت ما قلت هذا علی معرفة منی بالخذلة التي خامرتکم“

(آگاہ رہو! جو کچھ مجھے کہنا تھا کہہ دیا ہے اور میں نے یہ جانتے ہوئے کہ تم ہماری مدد نہیں کرو گے یہ خطاب کیا ہے

اور یہ آپ کا حامی نہ ہونا تمہاری روح کی گہرائیوں تک پہنچ چکا ہے)

”خذله“ یعنی کسی کو بے سہارا چھوڑ دینا، کسی کی مدد نہ کرنا ”مخامرة“ یعنی مخلوط ہونا۔ کوئی چیز دوسری

چیز میں اس طرح حل ہو جائے کہ اس کا جزء بن جائے۔

۱۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار، طبع قدیم، ج ۸ ص ۱۲۳ میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ”ممکن ہے یہاں کفر سے مراد شکر کے مقابلے میں کفران نعمت ہو، جیسا کہ اس آیت شریفہ میں ایسا ہی ہے کہ ”واذناذن ربکم لئن شکرتم لازیدنکم ولن کفرتم ان عذابی لشدید“ جب خدا نے اعلان کیا کہ اگر تم شکر گزار ہو گے تو نعمتوں میں اضافہ کروں گا لیکن اگر کفران نعمت کرو گے تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے۔

آپؐ فرماتی ہیں کہ میں جانتی ہوں کہ تم ہماری مدد نہیں کرو گے اور یہ۔ تعاون نہ کرنا۔ تمہاری روح کا جز بن چکا ہے اور ذات سے مخلوط ہو چکا ہے۔ ”علی معرفة منی بالخذلة“ یعنی تمہارے ساتھ نہ دینے کو میں جانتی تھی ”التي خامرتكم“ اور یہ ہماری مدد نہ کرنے کا رجحان، تمہاری روح سے گھل مل چکا ہے اور اس کا جز بن گیا ہے۔ یعنی اقدار سے بے اعتنائی اور حکمران ٹولے کے مظالم سے بے تفاوتی، گویا تمہاری ذات کا جز بن چکی ہے اور اس نے تمہیں مخصوص حالت میں بدل ڈالا ہے اور تمہاری یہ۔ سستی۔ اور بے اعتنائی اور لا ابالی ایک عارضی صفت نہیں ہے کہ جس کے تبدیل ہونے کی امید رکھی جائے۔

”والغدرۃ التي استشعرتھا قلوبکم“

(اور میں اس بے وفائی کو بھی جانتی تھی جو تمہارے دلوں میں اتر چکی ہے)

”غدر“ ترک کرنے، چھوڑنے کے معنی میں ہے۔ قرآن شریف میں بھی ارشاد ہوا ہے کہ: ”ما لهذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة الا احصينا“ (یعنی یہ کیسا۔ نامہ عمل۔ لکھا ہوا ہے کہ جس میں چھوٹی۔ سے چھوٹی اور بڑی سے۔ بڑی چیز کو بھی لکھا گیا ہے، یعنی سب اعمال اس میں لکھ دیئے گئے ہیں) اس آئے کریمہ میں ”لا يغادر“ ”لا یتَرَک“ کے معنی میں آیا ہے یعنی کسی چیز کو چھوڑا نہیں گیا بلکہ سب کو ذکر کیا گیا ہے۔

آپؐ کے اس جملے میں لفظ ”الغدرۃ“ وفا کے مقابلے میں آیا ہے۔ ”وفا“ یعنی عہد و پیمان پر عمل کرنا جبکہ ”غدرۃ“ یعنی عہد و پیمان پر عمل نہ کرنا اور اسے چھوڑ دینا۔ آپؐ فرماتی ہیں کہ: تمہارے دلوں میں جو بے وفائی اور خیانت تھی اسے میں۔ پہلے سے۔ جانتی ہوں۔

”شعار“ اندر پہننے والے۔ جسم سے چپکے ہوئے۔ لباس کو کہا جاتا ہے جبکہ ”دثار“ اوپر پہننے والے لباس کو کہا جاتا ہے۔ ”شعار، شعر“ سے مشتق ہے اور اس لباس کو کہا جاتا ہے جو انسان کو جسم پر اگنے والے بالوں سے چپکا ہوا ہو۔ اسی طرح ”شعار“ ہر اس بات اور نعرہ کو بھی کہا جاتا ہے جس پر دل سے

یقین رکھتا ہو، بالکل ہمارے اکثر نعروں کے برخلاف جسے ہم صرف زبان سے جاری کرتے ہیں اور اس کے مطابق عمل نہیں کرتے، اگر ہم زبان سے "امریکہ مردہ باد" کا نعرہ لگائیں لیکن عمل میں امریکی مصنوعات خریدیں اور ہمارا کردار و رفتار اور اخلاق امریکہ کے معیار کے مطابق ہو تو اس وقت "امریکہ مردہ باد" کہنا صرف دکھاوا اور ریاکاری ہے اسے نعرہ نہیں کہا جاسکتا۔ لہذا حقیقی نعرہ وہ بات ہے جو انسان کے دل و جان سے نکلی ہو اور انسان کو میدان عمل میں لے آئے۔ دراصل نعرہ عمل کا پیش خیمہ ہے۔

یہاں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: "استشعرتہا قلوبکم" یعنی بے وفائی اور ہمارے ساتھ خیانت تمہارا شعار اور اندرونی لباس بن چکے ہیں اور یہ صفت تمہارے دل و جان میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ تم ہماری مدد کرنے والے نہیں ہو لیکن اس کے باوجود تم سے خطاب کر رہی ہوں تاکہ اپنے درد دل اور سوز جگر کا اظہار کر سکوں۔

”ولکنہا فیضۃ النفس“

(لیکن یہ سارے شکوے، پیمانہ صبر لبریز ہونے کا نتیجہ تھے)

جب کوئی برتن پانی سے لبریز ہو جاتا ہے تو برتن سے پانی گرنا شروع ہو جاتا ہے اس حالت کو فیضان کہا جاتا ہے۔ انسان بھی اس برتن کی طرح ہے کہ جب اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے تو دل میں موجود غم و غصہ ابلنے لگتا ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے اور انسان کی اس حالت کو "فیضان النفس" کہا جاتا ہے۔

حضرت فاطمہ زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: میرے دل میں اس قدر غم و غصہ اور سوز و گداز ہے کہ اب پیمانہ صبر لبریز ہو کر چھلک رہا ہے اسی لئے آتی ہوں تاکہ خطبہ پڑھوں۔

”ونفثۃ الغیظ“

(اور یہ ساری باتیں۔ جوش غضب اور اندرونی پریشانی۔ کا اظہار۔ تھا)

جب انسان غضبناک ہوتا ہے تو ایک عرصہ تک اپنے غصے اور غضب کو چھپا کے رکھتا ہے لیکن جب غصہ اور پریشانی حد سے بڑھ جاتی ہے تو پھونک مارنا اور آہ کو نا شروع کر دیتا ہے، اس حالت کو

اصطلاح میں "نفث" یا "نفخ" کہا جاتا ہے "نفث" اور "نفخ" میں یہ فرق ضرور ہے کہ "نفث" میں منہ سے پانی کے قطرے بھی ساتھ نکلتے ہیں اور "نفخ" میں خالی ہوا خارج ہوتی ہے۔

"ونفثه الغیظ" یعنی یہ باتیں، جوش غضب اور دلی پریشانی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔

"وخور القناتہ"

(اور نیزہ کی انی کند اور بیکار ہے۔ کہ جس کی وجہ سے میں یہ باتیں کر رہی ہوں۔)

"خور" یعنی ٹوٹ جانا، کند ہونا، کمزور ہونا "قناتہ" یعنی نیزہ کی انی۔ آپؐ نے اپنے مقصد کو بہتر سمجھانے کے لئے تشبیہ سے کام لیا ہے۔ "خور القناتہ" یعنی نیزہ کا کند ہو کر ناقابل استفادہ ہونا، جب نیزہ کی انی کند ہو کر ناقابل استفادہ ہو جائے اور دشمن کے مقابلے میں کوئی اور چارہ بھی نہ ہو تو آہستہ آہستہ انسان کا صبر و حوصلہ ساتھ دینا چھوڑ دیتا ہے۔ لہذا حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: میرے اوپر جو ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے گئے۔ اور علیؑ جیسا اسلحہ، مظلوموں کی تلوار اور اسلحہ، اسلام کے اہم تر مفادات کی خاطر کند ہو کر نیام میں ہے۔ تو اس حالت نے مجھے تڑپا دیا اور مضطرب و بے تاب ہو کر میں یہاں پہنچی ہوں تاکہ تمہیں اپنے درد دل سے آگاہ کروں۔

حضرت زہراء (ع) اگرچہ معصوم تھیں لیکن پھر بھی ایک انسان ہیں جیسا کہ وہ بھوک و پیاس کا احساس کرتی تھیں بالکل اسی طرح جب آپؐ اسلام کے اندر ہونے والے انحرافات کو دیکھتی تھیں تو آپؐ کے غم و غصہ میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ صبر و بردباری کا یہ بلند پہاڑ جوش غیظ و غضب نے آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑا۔

"وبثۃ الصدر"

(تاکہ اپنے درد دل اور سوز و گداز کا اظہار کر سکوں)

"بث" یعنی واقف کرنا، آشکار کرنا، پراکندہ حالی۔

یہاں مقصود یہ ہے کہ میں تمہیں اپنے درد دل اور رنج و غم سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔ قرآن میں بھی۔ "بث" پراکندہ حالی اور آشکار کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

”انما اشکو بٹی وحزنی الی اللہ (۱)“ (میں اپنے غم واندوہ اور پراکندہ حالی کی شکایت صرف خدا سے کرتا ہوں)۔

”وتقدمة الحجة“

(تاکہ تم پر اتمام حجت کر سکوں)

یعنی، میں نے ان باتوں کے ذریعے صرف اپنے درد دل اور غم واندوہ کا اظہار کیا ہے اور تم پر اتمام حجت۔ وگرنہ فداک اور خلافت تو معلوم ہے کہ ہمیں نہیں دو گے اور تم ایسے افراد نہیں ہو جو ہماری مدد کرو۔

سازش کے خاتمے کی تصویر کشی،

”فدونکموها“

(پس۔ فداک۔ پر قابض رہو)

اس سے قبل بھی آپؐ نے فرمایا تھا کہ: فداک (۲) کو کجاہ کسا ہوا اور لگام ہاتھ میں لیا ہوا اونٹ سمجھ کر اس پر سوار ہو جاؤ اور جس قدر چاہو اسے دوڑاؤ اور یہ جان لو کہ قیامت نامی کوئی دن بھی ہے۔ آپؐ یہاں پر بھی فرماتی ہیں کہ: فداک پر قابض ہو جاؤ اور اسے اپنی ملکیت میں داخل کر دو، لیکن یہ تمہیں بتائی ہوں کہ تمہارے لئے یہ کام آسان نہ ہو گا کیونکہ قیامت تک، انسانی تاریخ اس حقیقت کو بیان کرتی رہے گی اور تم رسوا ہوتے رہو گے، قیامت کے دن بھی خدا اور رسول خدا (س) کے سامنے جواب دینا پڑے گا۔

”فاحتقبوها“

(پس اس بار اور وزن کی رسی کو پالان پر مضبوطی سے باندھ لو)

”حقب“ اس رسی کا نام ہے کہ جسے اونٹ کے شکم کے نیچے سے نکال کر لدے ہوئے سامان کو

۱۔ سورۃ یوسف / ۸۶۔

۲۔ ممکن ہے یہاں ضمیر ”ہا“ سے خلافت مراد ہو۔

مضبوطی سے باندھ دیا جاتا ہے۔

”احتقبوها“ یعنی پالان اور اس پر لادے ہوئے سامان کو باندھ دو، پھر اس کو اونٹ کے شکم کے نیچے سے رسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دو، لیکن یہ یاد رکھو کہ یہ اونٹ جس طرح تم سمجھتے ہو عیوب سے خالی نہیں ہے (۱) کیونکہ:

”دبرۃ الظہر“

(اس کی پیٹھ زخمی ہے)

یعنی خلافت کی اونٹنی سے جس طرح تم سواری لینا چاہتے ہو وہ تمہیں سواری نہیں دے گی۔

”نقبۃ الخف“

(اس کی ٹانگیں کمزور اور ناتواں ہیں)

”خف“ یعنی اونٹ کی ٹانگیں، ”نقب“ یعنی سست اور کمزور، ”نقبۃ الخف“ یعنی اونٹ کی ضعیف اور کمزور ٹانگیں۔

واضح سی بات ہے کہ جب اونٹ کی ٹانگیں سست، ضعیف اور کمزور ہوں تو وہ زیادہ دور تک نہیں چل سکتا۔ مقصد یہ ہے کہ فدک یا خلافت اس راہوار اونٹ کی طرح نہیں ہے جو بے عیب ہو اور تم آسانی سے اس پر سوار ہو سکو۔

”باقیۃ العار“

(اس کا ننگ دعار تمہارے لئے ہمیشہ باقی رہے گا)

آنے والی نسلیں یہ کہیں گی کہ مسلمانوں کے خلیفہ نے، پیغمبر (ص) کی۔ اکلوتی۔ بیٹی کا مسلم حق غضب کیا اور اس پر قبضہ جمالیا ہے یا یہ کہ اس نے۔ اہلیت نہ رکھتے ہوئے بھی۔ خلافت کو غضب کیا ہے۔

۱۔ جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے بحار میں فرمایا ہے کہ: باب افعال سے ”احتقبوها“ کے بجائے باب افعال سے ”احتقبوها“ زیادہ مناسب ہے لیکن جو لفظ روایت میں مذکور ہے اور معنی کے اعتبار سے، اکٹھا کر کے باندھنے کے معنی میں آتا ہے وہ ”احتقبوها“ ہی ہے ”ہاء“ کی ضمیر سے فدک یا خلافت مراد ہے اور ایک ایسی معیوب اونٹنی سے تشبیہ دی گئی ہے جو سوار ہونے کے لئے آمادہ کی گئی ہو۔

”موسومة بغضب الله - الجبار۔“

(خدا کے غضب کا داغ اس پر لگ چکا ہے)

”موسومہ، دسم“ کا اسم مفعول ہے۔ ”دسم“ گرم لوہے سے کسی کی جلد پر نشان لگانے کا نام ہے

اور ”موسومہ“ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر مذکورہ نشان لگ چکا ہو۔

یعنی، تم نے سوچے سمجھے بغیر جو قدم اٹھایا ہے اور چند مفاد پرست عناصر کے گرد جمع ہو کر ہر چیز کو تنہا دھنسنے کر دیا ہے اس کے اثرات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے بلکہ یہ لوہے سے لگائے ہوئے داغ کی علامت کی طرح ہمیشہ باقی رہے گا۔

”وشنار الابد“

(تمہارے لئے۔ دائمی ننگ در سوائی کا باعث بنے گا)

”موصولة بنار الله الموقدة“

(فدک یا خلافت کا غضب۔ تمہیں خداوند کے۔ قہر و غضب کے۔ بھڑکتے شعلوں تک پہنچا دے گا)

”التي تطلع على الافئدة“

(وہ آگ جو دلوں پر چھا جائے گی۔ یعنی دل کو بھی جلا دے گی۔)

یعنی فدک یا خلافت کا غضب کرنا۔ تم جس قدر آسان اور زود گزر سمجھتے ہو ایسا نہیں بلکہ۔ دنیا میں

تمہاری رسوائی اور قیامت میں خدا کے۔ دردناک۔ عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب بنے گا۔ یہ جملہ بعینہ قرآن سے ماخوذ ہے (۱)۔

”فبعين الله ما تفعلون“

(تم جو کچھ کر رہے ہو اسے خداوند دیکھ رہا ہے)

یہ۔ ساری خیانتیں اور مظالم کہ۔ جن کے تم مرتکب ہو رہے ہو اسے خداوند دیکھ رہا ہے اور اس پر

گواہ ہے۔ یعنی تم یہ خیال نہ کرو کہ تم نے جو ظلم و ستم کئے ہیں اس سے خدا غافل ہے اور خدا اسے نہیں

جانتا، بلکہ خدا تمہاری ہر حرکت اور تمہارے تمام کاموں کو دیکھ رہا ہے اور اس سے آگاہ ہے۔ پھر آپؐ۔
ظالموں کو انجام بد سے متعلق۔ قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

”وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ (۱)“

(ستم کار لوگ عنقریب جان لیں گے کہ ان کا انجام کیا ہوگا)

”وَاَنَا ابْنَةُ نَذِيرٍ لَكُمْ، بَيْنَ يَدَيَّ عَذَابٍ شَدِيدٍ“

(میں اسی پیغمبر کی بیٹی ہوں جو تمہیں خدا کے سخت۔ اور دردناک۔ عذاب سے ڈرانے کے لئے آیا تھا)

رسول خدا (س) آئے تھے تاکہ تمہیں سخت ترین عذاب سے ڈرائیں اور میں اسی پیغمبر (س) کی بیٹی
ہوں، پس تم خدا سے ڈرو۔ اور مجھ پر ظلم نہ کرو۔!

”فَاعْلَمُوا أَنَا عَامِلُونَ وَانْتَظِرُوا أَنَا مُنْتَظَرُونَ (۱)“

(تم جو چاہو کرو، ہم بھی اپنا کام کر گزریں گے۔ قیامت اور خدا کے عذاب کا۔ تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں)
یہ جملہ بھی قرآن سے ماخوذ ہے اور یہاں جو امر کے دو صیغے آئے ہیں ”فَاعْلَمُوا“ اور ”وَانْتَظِرُوا“ یہ
دھمکی دینے کے معنی میں آتے ہیں۔ دراصل آپؐ اس دور کے لوگوں کو یہ بتانا چاہتی تھیں کہ آج تم جو
کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو اور جس قدر ظلم و ستم کر سکتے ہو کرو، لیکن یہ جان لو کہ قیامت کے دن ان تمام کاموں
کا جواب دینا پڑے گا اور وہاں خدا ہر ایک سے حساب لے گا۔

یہاں تک پہنچ کر مسجد میں حضرت زہراء (ع) کی تقریر ختم ہوتی ہے اور اس کے بعد ابو بکر آپؐ کے
جواب میں کچھ مطالب بیان کرتا ہے اور پھر دوبارہ آپؐ تقریر فرماتی ہیں کہ جس کے بارے میں انشاء
اللہ آنے والے درس میں بحث کریں گے۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

۱۔ سورۃ شعراء / ۲۲۷۔

۲۔ سورۃ صود / ۱۲۱۔ ۱۲۲۔

دسواں درس :

- ✽ گزشتہ بحث کا خلاصہ
- ✽ ابوبکر کی ریاکارانہ باتیں
- ✽ ابوبکر کی زبانی، عترت رسول (ص) کا مقام
- ✽ غصب فدک کی عوام فریبانہ توجیہ
- ✽ ملت کا ارادہ یا پانچ آدمیوں کی ذاتی خواہش
- ✽ ابوبکر کو حضرت فاطمہ (سلام اللہ علیہا) کا جواب
- ✽ سقیفہ کے سرداروں کی خیانت
- ✽ دشمنوں کے شبہات اور قرآن
- ✽ ابوبکر کا نیا حربہ

فَأَجَابَهَا أَبُو بَكْرٍ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُثْمَانَ، وَقَالَ: يَا بِنْتَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، لَقَدْ كَانَ أَبُوِي بِالْمُؤْمِنِينَ عَطُوفًا كَرِيمًا، رَوُوفًا رَحِيمًا؛ وَعَلَى الْكَافِرِينَ عَذَابًا أَلِيمًا، وَعِقَابًا عَظِيمًا؛ إِنَّ عَزْوَنَاهُ وَجَدْنَاهُ أَبَاكَ دُونَ النِّسَاءِ، وَأَخَا إِلْفِكَ دُونَ الْأَخْلَاءِ؛ أَثَرُهُ عَلَى كُلِّ حَمِيمٍ، وَسَاعِدُهُ فِي كُلِّ أَمْرٍ جَسِيمٍ؛ لَا يُجِبُكُمْ إِلَّا سَعِيدٌ وَلَا يُبْغِضُكُمْ إِلَّا شَقِيٌّ بَعِيدٌ؛ فَأَنْتُمْ عِثْرَةُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَالْخَيْرَةُ الْمُتَتَجَبُّونَ، عَلَى الْخَيْرِ أَدِلَّتْنَا، وَإِلَى الْجَنَّةِ مَسَالِكُنَا؛ وَأَنْتِ يَا خَيْرَةَ النِّسَاءِ، وَابْنَةُ خَيْرِ الْأَنْبِيَاءِ، صَادِقَةٌ فِي قَوْلِكَ، سَابِقَةٌ فِي وَفُورِ عَقْلِكَ، غَيْرُ مَرْدُودَةٍ عَنْ حَقِّكَ، وَلَا مُضْدُودَةٌ عَنْ صِدْقِكَ؛ وَاللَّهُ مَا عَدَوْتُ رَأَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، وَلَا عَمِلْتُ إِلَّا بِإِذْنِهِ، وَإِنَّ الزَّائِدَ لَا يَكْذِبُ أَهْلُهُ؛ وَإِنِّي أَشْهَدُ اللَّهَ وَكَفَى بِهِ شَهِيدًا، أَنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: «نَحْنُ مَعَاشِرُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورَثُ ذَهَابًا وَلَا فِضَّةً وَلَا ذَارًا وَلَا عِقَارًا وَإِنَّمَا نُورَثُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالْعِلْمَ وَالنَّبْوَةَ، وَمَا كَانَ لَنَا مِنْ طَعْمَةٍ فَلَوْلِي الْأَمْرُ بَعْدَنَا أَنْ يَحْكُمَ فِيهِ بِحُكْمِهِ» وَقَدْ جَعَلْنَا مَا خَاوَلْتِهِ فِي الْكِرَاعِ وَالسَّلَاحِ يُقَاتِلُ بِهَا الْمُسْلِمُونَ وَيُجَاهِدُونَ الْكُفَّارَ، وَيُجَادِلُونَ الْمَرْدَةَ الْفُجَارَ، وَذَلِكَ بِإِجْمَاعِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ، لَمْ أَنْفِرْ بِهِ وَخَدِي، وَلَمْ أُسْتَبَدَّ بِمَا كَانَ الرَّأْيُ عِنْدِي، وَهَذِهِ حَالِي وَمَالِي، هِيَ لَكَ وَبَيْنَ يَدَيْكَ، لَا تَزْوِي عَنْكَ، وَلَا تَنْدَخِرُ دُونَكَ، وَأَنْتِ سَيِّدَةُ أُمَّةٍ أَبِيكَ، وَالشَّجَرَةُ الطَّيِّبَةُ لِبَنِيكَ، لَا تَنْدَفِعُ مَالِكَ مِنْ فَضْلِكَ، وَلَا تَوْضَعُ مِنْ فَرْعِكَ وَأَصْلِكَ، حُكْمُكَ نَافِذٌ فِيمَا مَلَكَتْ يَدَايَ، فَهَلْ تَرِينَ أَنْ أَخَالَفَ فِي ذَلِكَ أَبَاكَ ﷺ.

فَقَالَتْ ﷺ: سُبْحَانَ اللَّهِ، مَا كَانَ أَبِي رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَنْ كِتَابِ اللَّهِ ضَافِدًا وَلَا لِأَحْكَامِهِ مُخَالِفًا! بَلْ كَانَ يَتَّبِعُ أَثَرَهُ، وَيَقْفُو سُورَهُ، أَفْتَجْمَعُونَ إِلَيَّ الْغَدْرَ إِعْتِلَالًا عَلَيْهِ بِالزُّورِ وَالْبُهْتَانِ، وَهَذَا بَعْدَ وَفَاتِهِ شَبِيهٌ بِمَا بُغِيَ لَهُ مِنَ الْغَوَائِلِ فِي حَيَاتِهِ، هَذَا كِتَابُ اللَّهِ حُكْمًا عَدْلًا، وَنَاطِقًا فَضْلًا، يَقُولُ: «يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ» [وَيَقُولُ:] «وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ» فَبَيْنَ عَزَّوَجَلَّ فِيمَا وَزَعُ مِنَ الْأَقْسَاطِ، وَشَرَعُ مِنَ الْفَرَائِضِ وَالْمِيرَاثِ، وَأَبَاحُ مِنَ حَظِّ الذَّكَرَانِ وَالْإِنَاثِ، مَا أَزَاحَ بِهِ عِلَّةَ الْمُبْطِلِينَ، وَأَزَالَ التَّظَنِّيَ وَالشُّبُهَاتِ فِي الْغَايِبِينَ؛ كَلَّا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا، فَصَبِرْتُ جَمِيلٌ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَى مَا تَصِفُونَ.

فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: صَدَقَ اللَّهُ وَصَدَقَ رَسُولُهُ، وَصَدَقَتْ ابْنَتُهُ، أَنْتِ مَعْدُنُ الْحِكْمَةِ وَمَوْطِنُ الْهُدَى وَالرَّحْمَةِ، وَرُكْنُ الدِّينِ، وَعَيْنُ الْحُجَّةِ، وَلَا أَبْعَدُ صَوَابِكَ، وَلَا أَنْكَرَ خُطَابِكَ، هَؤُلَاءِ الْمُسْلِمُونَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ، قَلَدُونِي مَا تَقَلَّدْتَ، وَبِاتِّفَاقٍ مِنْهُمْ أَخَذْتُ مَا أَخَذْتُ، غَيْرُ مَكَابِرٍ وَلَا مُسْتَبَدٍّ، وَلَا مُسْتَأْثِرٍ، وَهُمْ بِذَلِكَ شُهُودٌ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ بحث کا خلاصہ:

گزشتہ دروس میں ہم نے حضرت زہراء (ع) کے خطبہ کو پڑھا اور یہ کہا کہ: آپؑ نے مسجد میں یہ خطبہ ارشاد فرمایا اور ابو بکر اور دوسرے افراد جنہوں نے خلافت کو غصب کیا تھا اور اسلام اور رہبری کو انحراف کا شکار بنایا تھا ان پر اعتراض کیا، مسجد میں موجود انصار و مہاجرین سے خطاب کر کے فرمایا کہ:

”اس عظیم فتنے اور انحراف کے مقابلے میں تم کیسے خاموش ہو؟ یہاں تک کہ حق ضائع ہو گیا ہے اور اسلام کے اندر بہت بڑے انحراف کی بنیاد رکھی گئی ہے اور تم نے کوئی اقدام نہیں کیا ہے! تم جو عرب کے دلیر اور شجاع افراد شمار ہوتے تھے اور بہت ساری جنگیں لڑیں اور مبارزہ کیا اور اسلام کا دفاع کیا، ہمیشہ تم رسول خدا (ص) اور اہل بیت (ع) کے مددگار اور فرمانبردار رہے، لیکن ابھی تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے ابو بکر کو خلیفہ بنایا اور اس نے ہم سے فدک چھینا لیکن تم خاموش رہے اور اس پر کوئی مخالفت یا اعتراض نہیں کیا آخر کیوں؟“

۔ اسلام کے لئے اہل بیتؑ اور انصار کی خدمات نیز قرآن سے ارشاد کے مسئلے پر مستدل گفتگو کرنے کے بعد۔ آپؑ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

”اگر اس وقت تم سے خطاب کر رہی ہوں تو اس امید پر نہیں کہ تم ہماری مدد کرو گے اور ہمارے

غضب شدہ حقوق واپس دلاؤ گے، کیونکہ تم دنیا کے دلدادہ بن چکے ہو اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی تمنا رکھتے ہو، چونکہ تم دنیا اور اس کے مقام و منصب کے طالب ہو، اسلام کے اقدار اور پیغمبر (ص) کی تعلیمات سے بے رخی برتنے لگے ہو، لہذا ابوبکر اور اس کی غاصب حکومت سے ساز باز اور سودا بازی پر خود کو مجبور پاتے ہو۔

اس خطاب سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنے درد دل، سوز و گداز اور مظلومیت کا اظہار کروں اور تم پر اتمام حجت کروں۔“

ابوبکر کی ریاکارانہ باتیں،

یہاں پر ابوبکر، حضرت زہراء (ع) کے خطبے کا جواب دیتا ہے، اس واقعہ کو مکمل نقل کرنے کی خاطر ہم یہاں پر ابوبکر کی باتوں کو بھی سنتے ہیں، یہاں جس نکتے کی طرف توجہ دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ابوبکر بظاہر حضرت زہراء (ع) کی بڑی عزت کرتا ہے اور ایک خاص پالیسی کے تحت حضرت زہراء (ع) کے خطبے کا جواب اس طرح دینا چاہتا ہے کہ وہ خود کو بری، الذمہ کرے۔ تاکہ حاضرین بھی مشتعل نہ ہوں، غضب فدک کے ظالمانہ اقدام کو حق بجانب اور اپنا شرعی فریضہ قرار دے نیز خود کو اہل بیت کا مخلص اور وفادار ظاہر کرے۔ کیونکہ اس کو علم ہے کہ وہاں سب حضرت زہراء (ع) کو پہچانتے ہیں لہذا یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپؑ - العیاذ باللہ - جھوٹ بول رہی ہیں اور آپؑ کی یہ باتیں درست نہیں ہیں۔ اسی لئے وہ آپؑ کے کلام کی تردید کے لئے دوسری راہ کا انتخاب کرتا ہے:-

”فاجابہا ابوبکر عبد اللہ بن عثمان (ا) وقال“

(پھر ابوبکر عبد اللہ بن عثمان نے آپؑ کو جواب دیتے ہوئے کہا:-)

”یا بنت رسول اللہ (ص) لقد کان ابوک بالمؤمنین عطوفاً کریماً رؤوفاً رحیماً“

(اے دختر پیغمبر (ص)! بے شک آپ کے باپا مؤمنین پر شفیق، مہربان، دلسوز اور صاحب کرم تھے)

ابوبکر کا نام عبد اللہ اور اس کے باپ کا نام عثمان تھا۔

” علی الکافرین عذاباً وعقاباً عظیماً “

(جبکہ کفار کے لئے خدا کا دردناک عذاب اور عظیم عقاب تھے)

ابوبکر ان کلمات کے ذریعے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اے دختر پیغمبر (ص) آپؐ اپنے بابا کی طرح ہم پر مہربان بنیں اور شفقت و رحمت کے ساتھ پیش آئیں، اس طرح وہ اپنی ان باتوں سے حضرت زہراء (ع) کو کالعدم اور مسجد کی فضاء کو اپنے حق میں تبدیل کرنا چاہتا تھا!!

” ان عزونا لا وجدنا اباک دون النساء “

(اگر ہم ان کے نسب کی جستجو کریں تو آنحضرت (ص) کو صرف آپؐ کے بابا پاتے ہیں نہ کہ دوسری عورتوں کے) یہ آپؐ کے کلام کی طرف اشارہ اور اس کی تصدیق ہے کہ خطبے کی ابتداء میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ: ”اگر تم پیغمبر (ص) کے نسب کو پہچانتے ہو تو معلوم ہو گا کہ وہ میرے والد گرامی ہیں دوسری عورتوں کے باپ نہیں“ ابوبکر اس بات کی تصدیق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم بھی جانتے ہیں کہ پیغمبر (ص) دوسری عورتوں کے نہیں بلکہ آپؐ کے ہی والد گرامی ہیں۔

” واخا الفک دون الاخلاء “

(اور پیغمبر (ص) دوسرے دوستوں کے نہیں بلکہ آپؐ کے شوہر کے بھائی اور آپؐ سے انس رکھتے ہیں) ”اخلاء، خلیل“ کی جمع ہے اور اس کا معنی ”دوست“ ہے ”الف“ یعنی انس و محبت، کنایہ ہے مونس اور ہمدם سے کہ جو حضرت علی (ع) تھے۔ ”اخلاء“ کے لفظ کے ذریعے ابوبکر یہ چاہتا ہے کہ ظالموں کو بھی پیغمبر (ص) کا دوست اور اسلام کا خیر خواہ ظاہر کرے۔

” وآثرہ علی کل حمیم “

(اور پیغمبر (ص) نے آپؐ کے شوہر اور مونس کو دوسرے تمام رشتہ داروں پر مقدم فرمایا) ”حمیم“ انسان کے قریبی رشتہ دار کو کہتے ہیں۔

” ساعدہ فی کل امر جسیم “

(ہر مشکل کام میں رسول خدا (ص) آپؐ کے شوہر کی ہمراہی فرماتے تھے اور ان کا ساتھ دیتے تھے)

ممکن ہے ان دو جملوں سے یہ مقصود ہو کہ حضرت علیؑ پیغمبر اسلام (س) کو ہر قریبی رشتہ دار پر مقدم رکھتے اور ہر مشکل کام میں آنحضرت (س) کی مدد کرتے تھے۔

ابوبکر کی زبانی، عترت رسول (ص) کا مقام،

”لایحبکم الا سعید ولا یبغضکم الا شقی“

(سوائے سعادتمند شخص کے کوئی آپ اہل بیتؑ کو دوست نہیں رکھتا

اور سوائے بد بخت اور خدا کی رحمت سے دور شخص کے کوئی آپؑ سے دشمنی نہیں رکھتا)

ابوبکر یہاں اپنی ذہانت اور سیاست کو کام میں لاتا ہے اور حضرت زہراء (ع) کے ساتھ بظاہر احترام سے پیش آتا ہے، سیاستدان طبقہ ہمیشہ ظاہری طور پر اچھی رفتار کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن پیچھے سے خنجر گھونپ دیتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ”پہلے انگریز جب سنتے تھے کہ کچھ افراد ان کو گالی دیتے ہیں تو وہ ہنستے تھے اور کبھی کبھار بعض اخبارات کو پیسے بھی دیتے تھے تاکہ انہیں فحش و دشنام دیں اور وہ کہتے تھے کہ کوئی بات نہیں یہ ہمیں چند گالیاں دیں کیونکہ یہ لوگ گالی دینے کے علاوہ ہم سے کوئی کام نہیں رکھتے ہم ان کا تیل لے جانا چاہتے ہیں ہمیں چند گالیاں دے کر ان کو دل خوش کرنے دو!! سیاسی لوگ اس قسم کے ہوتے ہیں!!“

یہاں ابوبکر بھی حضرت زہراء (ع) کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آتا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ ہم آپؑ اور حضرت علیؑ کے مقام و منزلت اور فضیلت کا اقرار کرتے ہیں، البتہ وہ اہل بیتؑ کی فضیلت کا انکار بھی نہیں کر سکتا تھا اور اگر تلخی اور شہی سے جواب دیتا تو اس پر اعتراض ہونے اور لوگوں کے جذبات کو اپنے خلاف بھڑکانے کا خدشہ تھا، لہذا اس نے ہوشیاری اور نرمی سے آپؑ کا جواب دیا ہے اور اسی ضمن میں وہ اپنی بات بھی کرتا ہے۔ ابوبکر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ:

”فانتم عترۃ رسول اللہ (ص) الطیبون والخیرۃ المنتجبون“

(آپ رسول اللہ (س) کے پاک و پاکیزہ اہل بیت اور خدا کی برگزیدہ ہستیاں ہیں)

”علی الخیر اذلتنا“

(سعادت و خوشبختی کی طرف ہمارے راہنما اور رہبر آپ اہل بیت ہی ہیں)

”علی الخیر“ جار و مجرور ”اذلتنا“ کے متعلق ہے جو اس پر مقدم ہوا ہے۔

”والی الجنة مسالکنا“

(آپ ہی بہشت کی جانب ہمارا وسیلہ اور نجات کا راستہ ہیں)

”وانت یا خیرۃ النساء وابنة خیر الانبیاء صادقة فی قولک“

(اے عورتوں میں سے خدا کی برگزیدہ خاتون اور تمام انبیاء سے بہتر ہستی کی بیٹی! اپنی باتوں میں آپ سچی ہیں)

اس جملہ کی وضاحت کرتے ہوئے ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ:

”بغداد کے مدرسہ غربی کے استاد ”علی بن الفارق“ کہ جو شاید ابن ابی الحدید کے بھی استاد تھے۔

سے سوال ہوا کہ یہاں ابو بکر حضرت زہراء (ع) سے کہتا ہے کہ ”آپ صحیح فرماتی ہیں“ اگر حضرت

زہراء (ع) کی بات صحیح ہوتی تو ابو بکر پر لازم تھا کہ فدک کو واپس کر دے کیونکہ حضرت فاطمہ (ع) فرماتی

ہیں کہ ”فدک میری ملکیت ہے“؟

اس سوال کا جواب استاد نے یہ دیا کہ: ”فدک کو واپس نہ کرنے کا سبب یہ تھا کہ اگر آج آپ کی

بات مانی جاتی اور فدک واپس کیا جاتا تو دوسرے دن حضرت زہراء (ع) آکر فرماتیں کہ: ”میرے بابا

نے علیؑ کو مسلمانوں کا خلیفہ دوسرے براہ مقرر کیا تھا اور غدیر خم سمیت بہت ساری جگہوں پر اس کو۔

خلیفہ کے طور پر۔ پہچنوا یا تھا“ لہذا ابو بکر نے یہ سوچا کہ اگر آج فدک کو واپس کر دوں تو کل خلافت بھی

حضرت علیؑ کو واپس کرنا ہوگی، لہذا اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ابتداء سے ہی آپؑ کو مایوس کرے!! (۱)

بنابریں ابو بکر اپنی ان باتوں کے ذریعے صرف دھوکہ دہی اور سیاسی چال چلنا چاہتا تھا اور ان

پر عمل کرنے کا قصد نہیں رکھتا تھا اور بد قسمتی سے اس روش سے عموماً سیاستداں طبقہ استفادہ کرتا ہے

اور تاریخ میں کتے ایسے حقائق ہیں جو اس قسم کی مصلحت پسندی اور سیاست پر قربان کیے گئے ہیں!۔

۱۔ شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید ج ۱۲ ص ۲۸۴۔

ابوبکر حضرت زہراء (ع) کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہتا ہے کہ:

”سابقة في وفور عقلك“

(اے دختر رسول (م) عقل و درایت میں آپ (ع) بہت آگے ہیں)

”غير مردودة عن حقك“

(آپؑ کو اپنے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا، آپؑ کو حق ضرور ملنا چاہئے)

”ولا مصدودة عن صدقك“

(آپؑ کی ان سچی باتوں کو رد نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان پر عمل ہونا چاہئے)

میدان سیاست کے کھلاڑی، باتوں اور نعروں کی حد تک ہمیشہ آزادی اور مظلوموں کے حقوق کی بازیابی کے لئے حمایت کرتے ہیں لیکن عملی میدان میں ان کا کردار کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یعنی، قول و فعل میں تضاد ان کی ایک خصوصیت ہے۔ ابوبکر بھی اسی روش سے استفادہ کرتا ہے اور اپنی جوابی تقریر میں، حضرت زہراء (ع) کے حق، سچائی اور آپؑ کے آزادی بیان کے حق کی حمایت کرتا ہے تاکہ مجمع کو دھوکہ دے کر ان کے جذبات کو قابو میں رکھا جاسکے! (۱۱)۔

۱۔ ان جملوں سے چند نکتے، بخوبی واضح ہوتے ہیں:

۱۔ حضرت زہراءؑ، اجتماعی شخصیت کے طور پر اور معنوی نفوذ کے اعتبار سے اس قدر عظیم مقام رکھتی تھیں کہ اگرچہ آپؑ نے اپنی تقریر سے حکمران طبقے کی حاکمیت اور حکومت کی بنیادیں ہلا دی تھیں لیکن اس کے باوجود بھی ابوبکر اور اس کے حواری، علی الاعلان آپؑ کی مخالفت کی جرات نہ کر پائے بلکہ ابوبکر مختلف قسم کے بہانوں سے یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ آپؑ کو قانع اور خاموش کرے۔

۲۔ معاشرے میں موجود سیاسی فضا چونکہ عہد رسولؐ سے نزدیک تھی اور اسلامی اقدار اور پیغمبرؐ کی حکومت میں لوگوں کو دی گئی شرعی اور عقلی آزادیاں ابھی کسی حد تک باقی تھیں، لہذا دہشت گردی سیاسی جبر اور اس قدر زیادہ نہ تھی کہ حکومت کے مخالفین اپنی کوئی بات ہی نہ کر سکیں۔

۳۔ ملاپنے والد بزرگوار کی تربیت کے نتیجے میں آپؑ کا ایمان اور شجاعت و فداکاری کا جذبہ اتنا قوی تھا کہ آپؑ نے ابوبکر اور اس کے حواریوں جیسے ایک طاقتور حکمران طبقے سے ٹکر لی، جو بظاہر قرآن اور سنت کے اسلحہ سے لیس تھا اور آپؑ نے انہیں فریب خوردہ عوام کے کھانے لاکر ان سے جواب طلبی کی اور ان کی بظاہر اسلامی حکومت اور نظام کو غیر شرعی اور ناجائز قرار دیا، اس وقت کے کٹھن سیاسی ماحول میں اس قسم کا گہرا اور عظیم کام، حضرت زہراءؑ کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے ناممکن تھا۔

اگرچہ ابو بکر حضرت زہراء (ع) کی صداقت، سچائی اور حق کی تصدیق کرتا ہے لیکن فوراً اپنی باتوں کا رخ بدل دیتا ہے اور پیغمبر اسلام (ص) کی طرف نسبت دیتے ہوئے ایک جھوٹی روایت نقل کرتا ہے تاکہ اپنی غیر معقول حرکت کی توجیہ کر سکے! لہذا وہ کہتا ہے کہ:

”واللہ ما عدوت رای رسول اللہ (ص) ولا عملت الا باذنه“

(خدا کی قسم میں نے رسول خدا (ص) کی رائے اور نظریے سے انحراف نہیں کیا

اور ان کی اجازت کے بغیر یہ کام انجام نہیں دیا ہے)

یعنی، اگر میں نے آپؐ سے فدک چھینا ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ خود آنحضرت (ص) نے فرمایا تھا کہ: ”ہم گروہ انبیاء ارث نہیں چھوڑتے، ہمارا جو بھی مال باقی رہے وہ صدقہ ہے!!“

حالانکہ واقعیت یہ تھی کہ اس روایت کو ابو بکر اور اس کے حواریوں نے جعل کیا تھا اور پیغمبر (ص) کی جانب جھوٹی نسبت دی تھی۔ دراصل ابو بکر اور اس کے طرفداروں کی بنیاد ہی اس بات پر تھی کہ اپنے تمام کاموں کی نسبت پیغمبر (ص) کی طرف دی جائے کیونکہ معاشرے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ تاکہ لوگ ان کی باتوں کو من و عن قبول کریں۔ دوسری طرف سے پیغمبر اکرم (ص) دنیا سے رحلت فرما چکے تھے اور ان کی طرف دی جانے والی غلط نسبتوں کی تردید بھی نہیں ہوتی تھی۔ حضرت علیؑ، فاطمہ زہراءؑ، اہل بیتؑ اور آپؐ کے مخلص اصحاب کہ جو رسول خدا (ص) کے ساتھ گہرے روابط رکھتے تھے اور سالہا سال ان کے ساتھ رہ کر۔ پیغمبر (ص) سے تربیت حاصل کی تھی۔ سب کو گوشہ نشین کر دیا تھا اور وہ اظہار حق اور ان ناروا نسبتوں کی تردید و تکذیب کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اس مسموم اور گھٹن کی فضا میں، پیغمبر اسلام (ص) کی طرف جعلی اور ناروا نسبت دینے کی بدعت کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کو بھی اسی روش اور حربے سے قانع اور خاموش کر دیا!

ابو بکر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ:

”وان الرائد لا یکذب اہلہ“

(جو پیش رو، راہنما، اپنے لوگوں سے جھوٹ نہیں بولتا)

”رائد“ عربی میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی لشکر یا قافلہ کے آگے چلتا ہے تاکہ راستہ، پانی اور ٹھہرنے کی جگہ کے بارے میں قافلہ والوں کو صحیح معلومات بہم پہنچائے۔ یہ شخص کبھی جھوٹ نہیں بولتا کیونکہ اگر جھوٹ بولے تو قافلہ والوں کے ساتھ خود بھی ہلاک ہو جاتا ہے۔

اس محلے میں ابوبکر خود کو مسلمانوں کا پیش رو اور راہنما قرار دیتا ہے کیونکہ اب وہ اپنے آپ کو ”خلیفۃ المسلمین“ سمجھنے لگا ہے۔ لہذا وہ کہتا ہے کہ ”میں آپ کا راہنما اور خدمت گزار ہوں لہذا ہرگز آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا!“

غصب فدک کی عوام فریبانہ توجیہ،

”و انی اشہد اللہ و کفی بہ شہیداً“

(میں خدا کو گواہ قرار دیتا ہوں اور خدا کی گواہی کافی ہے کہ:)

”انسی سمعت رسول اللہ یقول،

نحن معاشر الانبیاء لانورث ذہباً و لافضة و لاداراً و لاعقاراً

و ما کان لنا من طعمة فلولی الامر بعدنا ان یحکم فیہ بحکمہ“

(میں نے رسول خدا (ص) سے سنا کہ آپ (ص) نے فرمایا:

ہم گروہ انبیاء کوئی ترکہ نہیں چھوڑتے نہ سونا اور نہ چاندی اور نہ ہی کوٹھی اور زمین،

بلکہ ہم صرف کتاب و حکمت اور علم و نبوت چھوڑ جاتے ہیں،

اور ہمارا مال اور جائیداد ہمارے بعد میں آنے والے حاکم کا ہے وہ اپنی صوابدید کے مطابق اس میں تصرف کرے گا؛)

”عقار“ یعنی غیر منقولہ جائیداد ”طعمہ“ وہ چیز جس سے انسان اپنی زندگی میں استفادہ کرے۔

اس حدیث کو ابوبکر، عمر اور ان کے دوسرے چند کارندوں اور خیر خواہوں نے جعل کیا ہے تاکہ غصب فدک کے لئے ایک جواز پیدا کیا جائے۔ دراصل اپنے اس کام کے لئے انہیں کسی دستاویز کی ضرورت تھی لہذا یہ جھوٹی حدیث پیغمبر (ص) کی طرف منسوب کر کے آنحضرت (ص) کی حدیث کو اپنا

شاید قرار دیا!

شاید کوئی یہ اعتراض کرے کہ ہمارے پاس اصول کافی ہیں بھی اس قسم کی روایات پائی جاتی ہیں کہ: ”انبیاء کوئی ارث نہیں چھوڑتے بلکہ ان کا ارث علم و حکمت ہے“؟

ان کے جواب میں یہ کہنا چاہئے کہ ان روایات کا مطلب یہ ہے کہ: ”انبیاء کوئی سرمایہ دار۔ اور وڈیرے۔ تو نہیں تھے کہ قابل توجہ مال اپنے پیچھے ترکہ کے طور پر چھوڑ جاتے بلکہ وہ اپنی امت کے لئے اپنے علم و حکمت کے خزینے ارث میں چھوڑ جاتے تھے۔ ان روایات کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اگر کسی پیغمبر (م) کے گھر میں کوئی چیز پائی جائے تو وہ اس کی اولاد کو نہ دی جائے۔ اور حکمران طبقہ اس پر قابض ہو جائے۔ بلکہ اس قسم کی روایات کا مقصد یہ ہے کہ امت کو اپنے پیغمبر سے جس چیز کی توقع رکھنی چاہئے وہ علم و حکمت اور آثار نبوت ہیں، نہ کہ مال و ثروت اور دولت و جائیداد۔

معاشرے کی طبقہ بندی کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو انبیاءؑ زر اندوز اور سرمایہ دار طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ فقیر، محروم۔ اور مستضعف۔ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انبیاءؑ کے وارث بھی دراصل ان کے مال و ثروت کے نہیں بلکہ معنوی فضائل اور نیک اخلاق کے وارث ہوتے ہیں۔ اگر فدک کو رسول خدا (م) نے اپنی حیات طیبہ میں حضرت زہراء (ع) کے حوالے کر دیا تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ جائیداد اور ثروت، امامت و ولایت کے گھر میں رہے، تاکہ ان کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے اور امامت کی پیشرفت کے لئے صرف کیا جائے۔ دراصل رسول خدا (م) نے فدک کو جو ان کے مقام ولایت سے مربوط تھا اپنے بعد آنے والے مقام ولایت کی برحق ہستی کے اختیار میں دے دیا۔ اس سلسلے میں حضرت زہراء (ع) ہی وہ بہترین ہستی تھی کہ پیغمبر (م) کی طرف سے فدک کا اختیار انہیں تفویض کیا گیا اور فدک کو ان کی ملکیت قرار دیا گیا۔

ابوبکر مزید کہتا ہے کہ: ”وقد جعلنا ما حاولته في الكراع والسلاح“

(فدک کی آمدنی کو ہم نے گھوڑوں اور اسلحوں کی خرید کے لئے مختص کیا ہے)

یعنی وہ گھوڑے جن میں جنگ کے دوران استفادہ کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ابوبکر یہ کہنا چاہتا

ہے کہ: رسول خدا (س) نے فرمایا کہ میری جائیداد میرے بعد ولی امر کے اختیار میں ہوگی جس طرح وہ مصلحت سمجھے اس میں تصرف کرے گا اور چونکہ میں ولی امر مسلمین ہوں لہذا فدک کی آمدنی کو جنگی ساز و سامان پر خرچ کرنا چاہتا ہوں تاکہ مسلمان اسلام کا دفاع کر سکیں!

”یقاتل بها المسلمون ویجاهدون الکفار ویجادلون المردة الفجار“

(تاکہ انکے ذریعے مسلمان جنگ کر سکیں اور کفار کے ساتھ جہاد کر سکیں اور سرکش باغیوں کے خلاف مبارزہ کر سکیں)

”مردة، مارد“ کی جمع ہے اور سرکش اور تجاوزگر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ابوبکر نے یہاں دراصل اپنی نامعقول حرکت کو مذہبی رنگ دے کر ایک غلط مگر عوام پسند توجیہ پیش کی ہے۔

ملت کا ارادہ یا پانچ افراد کی ذاتی خواہش؟

”وذلك باجماع من المسلمین“

(یہ کام جو میں نے کیا ہے وہ مسلمانوں کے اتفاق رائے سے ہوا ہے)

شاید یہ اتفاق اور اجماع بھی اسی اجماع کی مانند ہو کہ جو ابوبکر کی خلافت کی بنیاد ہے اور جس اجماع کی بنا پر ابوبکر خلیفہ بنا وہ صرف پانچ آدمیوں کا اتفاق اور اجماع تھا (۱)۔

تاریخ کی گواہی کے مطابق سقیفہ میں صرف پانچ آدمیوں نے ابوبکر کی بیعت کی تھی ان کے نام یہ ہیں: عمر، ابوعبیدہ جراح، اسید بن حضیر، بشیر بن سعد اور سالم (۲)۔

سقیفہ میں ان پانچ افراد نے بیعت کی پھر وہ بیعت مہم پر شکل پڑے اور پردہ پیگنڈے دھمکی اور

۱۔ آیت اللہ شہید صدرؒ نے اپنی کتاب ”فدک“ کے صفحہ ۳۳ میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ: سقیفہ میں انتخاب خلیفہ کی بنیاد، ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ جراح کی مظلوم تھی کہ جو حکومت پر قبضہ کرنے کے لئے باہم متحد ہوئے تھے اور ایک محاذ تشکیل دے رکھا تھا اسی طرح صفحہ نمبر ۵۸ پر فرماتے ہیں کہ ان میں افراد کی اس پارٹی نے عہدوں کو اس طریقے سے اپنے درمیان تقسیم کر لیا تھا کہ: ”خلیفہ اور رہبر ابوبکر، عدلیہ کا سربراہ عمر اور وزیر خزانہ ابوعبیدہ جراح ہوگا...“

۲۔ احکام السلطانیہ لاوردی ص ۷۷

تلوار کی نوک سے دوسرے لوگوں سے بھی بیعت لی، بعد میں یہ کہنے لگے کہ مسلمانوں نے ابو بکر کو خلیفہ مقرر کیا! ابو بکر صاحب کی نظر میں یہ بھی اجماع ہے اور اب جب ہم اہل سنت بھائیوں سے پوچھتے ہیں کہ ابو بکر کی خلافت کی دلیل کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ: ”مسلمانوں کا اجماع!“ جب ہم ان سے کہتے ہیں کہ: بھائی! وہاں تو صرف پانچ آدمیوں نے بیعت کی تھی! اسے کس طرح آپ اجماع مسلمین کہہ سکتے ہیں؟ تو جواب میں کہتے ہیں کہ: ”جمع کے لئے تین افراد بھی کافی ہیں، لہذا اگر تین آدمی بھی اتفاق کر لیں تو وہ اجماع کہلائے گا“!!

”لم انفرد به وحدي ولم استبد بما كان الراي عندي“

(یہ صرف میرا فیصلہ نہیں اور نہ ہی میں نے اس میں استبداد سے کام لیا ہے!)

پھر ابو بکر اپنی چالاکي کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

”وهذه حالي ومالي، هي لك وبين يديك“

(یہ میری جائیداد ہے کہ جو آپ کے سامنے اور آپ کے اختیار میں ہے!)

”لا نزوي عنك ولا نذر خردونك“

(میں اپنے اس ناچیز مال کو آپ سے دور اور آپ کو محروم کر کے ذخیرہ کرنا نہیں چاہتا ہوں!)

”وانت سيدة امة ابیک والشجرة الطيبة لبنیک“

(حالانکہ آپ اپنے بابا کی امت کی مالک اور اپنی اولاد کا شجرہ طیبہ ہیں)

”لا ندفع مالک من فضلک ولا توضع من فرعک“

(ہم آپ کی فضیلت کے منکر نہیں اور نہ ہی آپ کی اصل اور فرع حسب و نسب میں کمی کے خواہاں ہیں) یعنی ہم آپ کا بخوبی احترام کرتے ہیں!!

”حکمک نافذ فی ماملکت یدای“

(جو کچھ میرے ہاتھوں میں ہے۔ یعنی میرے اموال پر۔ آپ کا حکم نافذ ہے!!)

لیکن جہاں تک فدک کا تعلق ہے تو وہ آپ کو واپس نہیں کیا جاسکتا! کیونکہ:-

”فہل ترین انسی اخالف فی ذلک اباک“

(کیا آپ یہ صحیح سمجھتی ہیں کہ میں اس مسئلے۔ یعنی فدک کے بارے میں۔ آپ کے والد گرامی کی مخالفت کروں؟)
 یہاں ابوبکر پھر اسی جھوٹی روایت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: اگر میں فدک کو واپس
 کروں تو پیغمبر (س) کی مخالفت ہوگی۔ کیونکہ رسول خدا (س) نے فرمایا ہے کہ: ”ہم انبیاء ترکہ نہیں چھوڑتے
 اور ہمارا مال اور ہماری ثروت بعد میں آنے والے ”ولی امر“ کی ہے، لہذا میں نے ”ولی امر“ کی حیثیت
 سے فدک کو لیا ہے اور جہاد، اسلحہ کی خریداری اور دوسرے جنگی ساز و سامان پر خرچ کروں گا۔ پس میں
 نے رسول خدا (س) کی کوئی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ انکے حکم کے عین مطابق، میں نے یہ کام کیا ہے (۱)۔

ابوبکر کو حضرت فاطمہ (ع) کا جواب:

”فقلت علیہا السلام،

سبحان اللہ! ما کان ابی رسول اللہ (ص) عن کتاب اللہ صادقاً ولا لاحکامہ مخالفاً“

۱۔ مرحوم سید شرف الدین نے اپنی کتاب ”المصنوع والاجتہاد“ کے صفحہ ۱۱۳ پر محمود الخوریہ کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ:
 ”حضرت زہراءؑ کے بارے میں ابوبکر کے موقف کے بارے میں یہ کہنا لازم سمجھتا ہوں کہ: اگر ہم قبول بھی کر لیں کہ قرآن کے
 قطعی قوانین، ظنی روایات کے ذریعے قابل تخصیص ہیں، مثال کے طور پر میراث سے مرلوط آیات کو ”نحن معاشر الانبیاء“ والی
 روایت سے تخصیص لگا دیں۔ اور اس کے دائرے کو محدود کریں۔ (جیسا کہ ابوبکر اس کا مدعی تھا) تب بھی ابوبکر کو یہ اختیار حاصل
 تھا کہ پیغمبرؐ کے ترکہ سے فدک، حضرت زہراءؑ کو بخش دیتا کیونکہ کوئی بھی مسلمان اس امر کا مخالف نہ تھا اور ابوبکر بھی یہ طاقت رکھتا
 تھا جیسا کہ اس نے پیغمبر اسلامؐ کے ترکہ سے ”زبیر بن عوام“، ”محمد بن مسلمہ“ اور دوسرے بہت سارے افراد کو کچھ نہ کچھ بخشا ہے
 اور بعد میں عثمان نے فدک کو مردان کے اختیار میں دے دیا ہے“ !!!
 یہ نقل کرنے کے بعد علامہ شرف الدینؒ فرماتے ہیں کہ:

”ابن ابی الحدید نے چند گزشتہ علماء سے نقل کیا ہے کہ: وہ حضرت زہراءؑ کے بارے میں فحش کی پالیسی اور موقف پر تعجب کرتے
 ہیں اور اس کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”دینی احکام کے علاوہ، شرافت انسانی کا یہ تقاضا تھا کہ یہ دونوں خلیفہ و خیر رسولؐ
 کے ساتھ اس طرح پیش نہ آتے۔“ یعنی ان کا رویہ، انسانیت سے دور تھا۔ اس کے بعد ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ: ”اس بات کا کوئی
 جواب نہیں دے سکتا۔“

(پس آپؐ نے فرمایا کہ:

سبحان اللہ! (۱) میرے پدر بزرگوار رسول خدا (ص) نے کبھی قرآن سے روگردانی نہیں کی

اور نہ ہی اس کے احکام کی مخالفت کی ہے)

یعنی کیا میرا بابا قرآنی احکام کے برخلاف قدم اٹھاتا ہے! (۲) کیونکہ قرآن میں مذکور ہے کہ: ”وورث سلیمان داوود (۳)“ (سلیمان نے داوود سے ارث پایا)۔

نیز زکریاؑ کی زبانی نقل کیا ہے کہ: ”انسی خفت الموالی من بعدی وکانت امراق عاقراً فہب لی من لدنک ولیاً یرثنی ویرث من آل یعقوب (۴)“ (میں اپنے رشتہ داروں سے خوف کھاتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہو گئی ہے لہذا تو اپنی رحمت سے مجھے ایک فرزند عطا فرما جو میرا آل اور آل یعقوب کا وارث بنے) قرآن نے صراحتاً بیان کیا ہے کہ: انبیاءؑ ارث چھوڑتے ہیں، یہ کیسی جھوٹی حدیث تم نے بنائی ہے اور رسول خدا (ص) کی طرف نسبت دے رہے ہو کہ آپ (ص) نے فرمایا کہ: ”انبیاءؑ ارث نہیں چھوڑتے“ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ رسول خدا (ص) قرآن کے برعکس بات کیا کرتے تھے؟!!

”بل کان یشبع اثرہ ویقفو سورۃ“

(بلکہ آنحضرت (ص) قرآن کے احکامات کے تابع اور اس کی سورتوں کے مطابق چلتے تھے)

آپؐ یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ کیوں پیغمبر (ص) کی طرف جھوٹی حدیث کی نسبت دیتے ہو؟! حالانکہ پیغمبر (ص) قرآن کے احکام کے تابع تھے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ قرآن کے حکم کے برخلاف کوئی بات کہتے؟! حقیقت میں۔ تم نے خیانت کی اور وہ یہ ہے کہ تم نے زور اور طاقت کے بل بوتے پر فدک کو ہم سے چھین لیا ہے اور ابھی پیغمبر اسلام (ص) کی طرف جھوٹی نسبت بھی دے رہے ہو تاکہ اپنی حرکت کی توجیہ کر سکو۔

۱۔ سبحان اللہ، یعنی خدا پاک و منزہ ہے۔ عموماً تعجب کے مقام پر بولا جاتا ہے۔

۲۔ اس کلام سے بخوبی یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول خداؐ ائمہ معصومینؑ اور ولی فقیہ پر لازم ہے کہ قرآن کی تعلیمات اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی ولایت مطلقہ کو بروئے کار لائیں۔

۳۔ سورۃ مریم / ۵۶۔

۴۔ سورۃ نمل / ۱۶۔

”افتجمون الى الفدر؟“

(کیا تم سب مل کر خیانت کرنا چاہتے ہو؟)

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے کہ ابو بکر نے اپنی تقریر میں کہا کہ: غضب فدک صرف میرا نظریہ ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں نے اتفاق رائے سے میرا ساتھ دیا ہے اور یہ کام مسلمانوں کے اجماع سے طے پایا ہے اس لئے یہاں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: کیا تم سب نے اتفاق کیا ہے کہ خیانت کرو؟

”اعتلا علیہ بالزور والبهتان؟“

(اپنی اس خیانت کی غلط باتوں اور پیغمبر (ص) پر الزام تراشی کے ذریعے توجیہ کرنا چاہتے ہو؟)

”اعتلل“ سبب بیان کرنا اور بہانہ تراشی۔ ”زور“ یعنی ناحق، باطل اور جھوٹ۔ ”بهتان“ یعنی تهمت اور الزام۔

آپ فرماتی ہیں کہ: تم نے خیانت کی، میرا حق غضب کیا اور ابھی اس کی توجیہ کے لئے ایک جعلی روایت کو دلیل بنا کر پیش کرتے ہو اور رسول خدا (ص) پر بہتان لگاتے ہو؟

سقیفہ کے سرداروں کی خیانت،

”وهذا بعد وفاته شبيه بما بنى له من الفوائل في حياته“

(۲) حضرت (ص) کی وفات کے بعد کردار کشی کی یہ تمہاری خیانت،

بالکل ان سازشوں اور مظالم کی طرح ہے کہ جس کے تم آنحضرت (ص) کی زندگی میں مرتکب ہوتے تھے

”غوائل، غائلہ“ کی جمع ہے اور ظلم، سازش کرنا، قتل اور سرکشی کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

آپ کا یہ کلام اس سازش کی طرف اشارہ ہے جو رسول خدا (ص) کی حیات طیبہ کے آخری سال میں

بعض افراد کی طرف سے تیار ہوئی اور وہ چاہتے تھے کہ ”حجة الوداع“ سے واپسی کے موقع پر جب

آپ (ص) احس کی گھاٹی پر پہنچیں تو آپ (ص) کی سواری کو بھگا کر آپ (ص) کو شہید کیا جائے اور تاریخ

کی گواہی کے مطابق ابو بکر بھی سازش کرنے والوں میں شامل تھا۔

لہذا آپ (ع) فرماتی ہیں کہ: پتھیر (م) کی رحلت کے بعد۔ آنحضرت (م) کی طرف قرآن کی سراسر مخالف روایتوں کی غلط نسبت دے کر، کردار کشی کی یہ۔ تمہاری خیانت ان مظالم اور سازشوں سے شہادت رکھتی ہے کہ جس کے تم آنحضرت (م) کی زندگی میں مرتکب ہوتے تھے اور آپ (م) کے لئے فتنہ برپا کرتے تھے۔ بہر صورت تم اس وقت بھی خیانت کرتے تھے اور اب بھی خیانت کر رہے ہو۔

”ہذا کتاب اللہ حکماً عدلاً وناطقاً فصلاً“

(یہ خدا کی کتاب ہے جو ایک عادل قاضی ہے اور حق و باطل کو جدا کر کے بیان کرتی ہے)

”یقول۔۔ یرثنی ویرث من آل یعقوب (۱)“، ”وورث سلیمان داوود (۲)“

(۔ خدا کی یہ کتاب۔ بیان کرتی ہے کہ:

۔ پروردگار! مجھے ایک فرزند عطا کر۔ جو میرا اور آل یعقوب کا وارث بنے“

نیز قرآن فرماتا ہے کہ: ”سلیمان نے داود سے ارث پایا ہے“)

بنابریں تمہاری یہ بات صحیح نہیں جو کہتے ہو کہ: انبیاء ارث نہیں چھوڑتے کیونکہ قرآن کی تصریح کے مطابق حضرت سلیمان نے داود سے اور حضرت یحییٰ نے حضرت زکریا سے۔ دنیوی مال اور حکومت۔ سے ارث پایا تھا۔

دشمنوں کے شبہات اور قرآن

حضرت زہراء (ع) اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

”فبین عزوجل فیما وزع من الاقساط وشرع من الفرائض والمیراث

واباح من حظ الذکران والانات، ما ازاح به علة المبطلين“

(خداوند عزوجل نے قرآن میں ارث کو تقسیم فرمایا ہے اور ارث کے حصول کا قانون بنایا ہے نیز مرد اور عورت کے

حصوں کو اس طرح معین فرمایا کہ فاسد اور جھوٹے لوگوں کی غلط توجہیات اور شبہات کو زائل کر دے)

”ما ازاح، بین کا مفعول ہے اور اس کلام سے آپؐ کا مقصد یہ ہے کہ: خداوند متعال نے ان آیات کے ذریعے قرآن میں ارث کے قانون کو بیان فرمایا ہے وہاں، ترکہ میں لڑکے اور لڑکیوں کے حصے کو بھی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس طرح تمہارے شبہات اور بہانہ تراشی کو بر ملا کرنے کے علاوہ تمہاری غلط توجہیات کو بھی باطل قرار دیا ہے، کیونکہ یہ آیات صراحت کے ساتھ، تمہاری حدیث کے جھوٹ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

”وازال التظنی والشبهات فی الغابرین“

(۱۔ اور قرآن کی ان آیات نے۔ آئندہ آنے والوں کے وہم و گمان اور شبہات کو بھی زائل اور باطل کر دیا ہے) ممکن ہے بعض لوگ یہ گمان کریں کہ پیغمبر (ص) کے ساتھ منسوب مذکورہ روایت درست ہے اور اپنے آپ سے یہ کہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ابو بکر جھوٹ بولے؟ لیکن قرآن اس قسم کے وہم و گمان کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

”تظنی“ اور ”تظنن“ کا معنی ایک ہے یعنی ظن اور گمان، ”تظنن“ مضاعف (۱) ہے اور عربی زبان میں مضاعف ناقص (۲) کی شکل میں بھی آتا ہے۔ یہاں ”تظنن“ کا لفظ ”تظنی“ میں تبدیل ہوا ہے۔ جیسا کہ ”وما انزلنا علیک القرآن لتشتقی“ (۳) کہ اس آیت میں ”لتشتقی“ کا لفظ اصل میں ”لتشتق“ تھا۔ ”وازال التظنی والشبهات“ قرآن کی مذکورہ آیتوں نے لوگوں کے وہم و گمان اور شبہات کو دور کر دیا ہے۔

”فی الغابرین“ یعنی اگر کوئی مستقبل میں بھی حدیث جعل کرنا چاہے یا شبہ اور اعتراض کرنا چاہے تو قرآن ان کو باطل کر دیتا ہے۔

۱۔ مضاعف یعنی ایک لفظ میں دو حرف ایک ہی جنس سے ہوں جیسے ”ند“ کہ جو اصل میں ”مد“ تھا۔

۲۔ ناقص وہ لفظ ہے جس کے آخر میں واو، یاء یا الف ہو جیسے ”یدعو، یری، یابی“۔

۳۔ سورہ طہ ۲/۲۰

”كَلَّا، بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْراً“

(ہرگز ایسی بات نہیں جو تم کہتے ہو بلکہ تم پر خواہشات نفسانی غالب آچکی ہیں)

”فصبر جميل“

(پس، مجھے ایسا صبر کرنا چاہئے کہ جو پسندیدہ اور زیبا ہو)

تمہاری ان خیانتوں اور ظلم و ستم کے مقابلے میں ہم صبر سے کام لیں گے اور خدا کی درگاہ میں ان کی شکایت کریں گے کیونکہ وہی ظالم سے مظلوم کا انتقام لینے والا ہے۔

”وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ (۱)“

(تمہاری ان تہمتوں اور غلط توجہات کے مقابلے میں، خدا ہماری پناہگاہ اور ہمارا مددگار ہے)

تمہاری غلط توجہات اور رسول خدا (س) پر جو تم الزام لگاتے ہو، ان کے مقابلے میں ہم خدائے قادر و توانا سے مدد چاہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ابو بکر نے ایک جعلی حدیث کو پیغمبر (س) کی طرف نسبت دی اور اس کے ذریعے غضب فدک کے مسئلے کو حق بجانب قرار دینے کی کوشش کی۔ حضرت زہراء (ع) نے قرآنی آیات سے استدلال فرمایا اور ابو بکر کے ایجاد کردہ شبہات اور اس کی توجہات کو رد فرمایا اور ابو بکر کے اس اقدام کو خیانت قرار دیا۔

۱۔ آخری یہ عین حملے، سورہ یوسف کی آیت ۸ سے ماخوذ ہیں شاید سورہ یوسفؑ سے یہ کلمات نقل کرنے کی وجہ، وہ مشابہت ہو جو دونوں ہستیوں کی زندگی میں پائی جاتی ہے اور وہ مخالفین کی طرف سے۔ جھوٹ، فریب اور تہمت کو حربے کے طور پر استعمال کرنا ہے جو دونوں واقعات میں پائے جاتے ہیں۔ ابو بکر اور اس کے حواری، کبھی جعلی حدیث کھڑے کر کے لوگوں کو دھوکہ دے کر ان کو بے وقوف بناتے تھے اور کبھی اہل بیتؑ اور حضرت علیؑ پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ وہ فتنہ و آشوب برپا کر رہے ہیں، وہ ہر قسم کی فتنہ انگیزی کا محرک حضرت علیؑ اور اہل بیتؑ کو قرار دیتے تھے۔ اس طرح وہ جھوٹ، فریب اور تہمت کی مخوس مثلث کے بل بوتے پر امامت و خلافت کو اپنی اصلی راہ سے منحرف کرنے میں کامیاب ہوئے۔

شہید صدرؒ اپنی کتاب ”فدک“ کے صفحہ ۶۹ پر، اہل بیتؑ کے ساتھ حکمران ٹولے کے سخت اور غیر اسلامی سلوک کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس غیر اسلامی رویے کا ایک نمونہ ابو بکر کا وہ جملہ ہے جو اس نے حضرت علیؑ کے بارے میں کہا کہ: ”معاشرے میں اٹھنے والے ہر فتنہ و آشوب کی جڑ علیؑ ہے اور وہ العیاذ باللہ۔ ام طہال کی مانند برائی سے خوش ہوتا ہے۔“

چونکہ ابوبکر اور اس کے ہموا افراد کے ہاتھوں میں حکومت اور طاقت تھی معاشرے پر جبر اور تلوار کی حکمرانی تھی اور منطق و استدلال سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ نیز خوف و ہراس یا جھوٹے پروپیگنڈوں کی وجہ سے عوام خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ لہذا انہوں نے اپنی من مانی کی اور اہل بیتؑ سے فدک کو چھین لیا۔

ابوبکر کا نیا حربہ،

ابوبکر دوبارہ جوابی تقریر کے لئے اٹھتا ہے اور چالاک سیاست بازی کے ذریعے خود کو بے قصور ٹھہراتا ہے۔

”فقال ابوبکر،“

”صدق الله وصدق رسوله وصدق ابنته، انت معدن الحكمة وموطن الهدى والرحمة،

وركن الدين وعين الحجة، ولا ابعد صوابك ولا انكر خطابك“

(پھر ابوبکر نے حضرت زہراء (ع) کو مخاطب کر کے کہا:

خدا اور پیغمبر (ص) نے سچ کہا اور پیغمبر (ص) کی بیٹی بھی سچ فرما رہی ہیں، آپ حکمت کی کان

اور ہدایت و رحمت کا منبع ہیں، دین کا ستون اور خدا کے واضح دلائل کا سرچشمہ آپ کی ذات ہے،

آپ کے حق کو دور نہیں کر رہا ہوں۔ یعنی یہ نہیں کہتا ہوں کہ آپ سچ بات نہیں فرماتیں۔ آپ کے خطاب

کی حقانیت۔۔۔ سے مجھے انکار نہیں۔ یعنی اس کے مطالب کا منکر نہیں ہوں)

”هؤلاء المسلمون بيني وبينك، قلندوني ما تقلدت“

(یہ مسلمانوں کا مجمع میرے اور آپ کے درمیان گواہ ہے اور فیصلہ کرے گا، یہی لوگ تھے

جنہوں نے خلافت کی ذمہ داری میری گردن میں ڈالی)

یعنی، مجھے خود خلافت کی خواہش نہیں تھی، یہی مسلمان آئے اور خلافت کی ذمہ داری میرے

کاندھوں پر ڈالی تو میں نے۔ دینی۔ ذمہ داری سمجھتے ہوئے اسے قبول کر لیا!۔

”وباتفاق منهم اخذت ما اخذت“

(جو کچھ میں نے لیا ہے وہ انہی مسلمانوں کے اتفاق رائے سے لیا ہے (۱۱))

یعنی، مسلمانوں نے مجھ سے کہا کہ فاطمہ (ع) سے فدک چھین لو تو میں نے چھینا! البتہ یہاں مسلمانوں کے اجماع سے ابو بکر کا مقصد سقیفہ گردپ کے چند مخصوص افراد کا اتفاق رائے ہے، وگرنہ دوسرے مسلمانوں نے ایسی رائے ہرگز نہیں دی تھی۔

”غیر مکابر ولا مستبذ ولا مستاثر“

(فدک کا غضب اس لحاظ سے نہ تھا کہ میں تکبر کروں اور اپنے آپ کو بڑا سمجھوں)

اور نہ میری ذاتی رائے کا اس میں کوئی عمل دخل ہے اور نہ ہی میں اپنے آپ کو دوسروں پر مقدم سمجھتا ہوں!)

”وہم بذلک شہود“

(اور یہ سارے مسلمان میری ان باتوں پر گواہ ہیں)

یہاں ابو بکر کی باتیں ختم ہوتی ہیں۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت ان باتوں کو سننے میں صرف کیا، اگرچہ ہم حضرت زہراء (ع) کے خطبہ پر گفتگو کر رہے ہیں لیکن اس واقعے کی تکمیل کے لئے ہم مجبور ہیں کہ ابو بکر کی باتوں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں۔

اس کے بعد حضرت زہراء (ع) کچھ اور کلمات ارشاد فرماتی ہیں کہ انشاء اللہ آئندہ درس میں بحث کریں گے۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

۱۔ جب ابو بکر نے دیکھا کہ جعل حدیث کا حربہ ناکام رہا اور حضرت زہراءؑ کی مدلل تقریر سے میری جہالت اور خیانت کا پول کھل گیا ہے تو اب جعل حدیث کے بجائے اس نے خلافت اور فدک کے غضب کرنے کی ذمہ داری دوسرے لوگوں پر ڈال دی اور کہا کہ: آپؑ کی ہر بات صحیح اور خدا کی طرف سے ہم پر لطف ہے لیکن مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اہل بیتؑ سے خلافت و امامت اور فدک چھین لیا جائے!! لہذا خلافت اور فدک کسی قیمت پر بھی واپس نہیں کیا جائے گا!!!

گیارہواں درس:

- ✽ گزشتہ درس کا خلاصہ
- ✽ لوگوں کی دوبارہ مذمت
- ✽ امامت کی راہ میں تحریف اور اس کا مستقبل
- ✽ بابا کے روضے پر درد دل کا بیان

فَالْتَفَتَتْ فَاطِمَةُ عليها السلام إِلَى النَّاسِ وَقَالَتْ:

مَعَاشِرَ الْمُسْلِمِينَ الْمُسْرِعَةِ إِلَى قِيلِ الْبَاطِلِ [قَبُولِ الْبَاطِلِ]، الْمَغْضِيَةِ عَلَى
الْفِعْلِ الْقَبِيحِ الْخَاسِرِ، أَفَلَا تَتَذَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا؟ كَلَّا بَلْ زَانَ
عَلَى قُلُوبِكُمْ مَا أَسَأْتُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ، فَأَخَذَ بِسَمْعِكُمْ وَ أَبْصَارِكُمْ، وَ لَبِثَسْ مَا
تَأَوَّلْتُمْ، وَ سَاءَ مَا بِهِ أَشْرْتُمْ، وَ شَرُّ مَا مِنْهُ اغْتَصَبْتُمْ! لَتَجِدَنَّ وَاللَّهِ مَخِمْلَهُ ثَقِيلًا، وَ
غَبَهُ وَبِيلًا، إِذَا كُشِفَ لَكُمْ الْغِطَاءُ، وَ بَانَ مَا وَرَاءَهُ مِنَ الضَّرَاءِ [الضَّرَاءِ] وَ بَدَا لَكُمْ
مِنْ رَبِّكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَحْتَسِبُونَ، وَ خَسِرَ هُنَاكَ الْمُبْطِلُونَ.

ثُمَّ عَطَفَتْ عَلَى قَبْرِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وآله وَقَالَتْ:

قَدْ كَانَ بَعْدَكَ أَنْبَاءٌ وَ هَنْبَةٌ	لَوْ كُنْتُ شَاهِدَهَا لَمْ تَكْثُرِ الْخُطْبُ
إِنَّا فَقَدْنَاكَ فَقَدْ الْأَرْضُ وَابِلَهَا	وَ اخْتَلَّ قَوْمُكَ فَاشْهَدَهُمْ وَ لَا تَغِبْ
وَ كُلُّ أَهْلٍ لَهُ قُرْبَى وَ مَنْزِلَةٌ	عِنْدَ الْإِلَهِ عَلَى الْأَدْنَى مَقْتَرِبْ
أَبَدَتْ رِجَالٌ لَنَا نَجْوَى صُدُورِهِمْ	لَمَامُضِيَّتِ وَ حَالَتْ دُونَكَ التُّرْبُ
تَجَهَّمْتَنَا رِجَالٌ وَ اسْتَخَفُّ بِنَا	لَمَّا فُقِدَتْ وَ كُلُّ الْأَرْثِ مُغْتَصَبْ
وَ كُنْتُ بَذْرًا وَ نَوْرًا يُسْتَضَاءُ بِهِ	عَلَيْكَ يَنْزِلُ مِنْ ذِي الْعِزَّةِ الْكُتُبُ
وَ كَانَ جِبْرِيلُ بِالْآيَاتِ يُؤْنِسُنَا	فَقَدْ فُقِدَتْ وَ كُلُّ الْخَيْرِ مُحْتَجَبْ
فَلَيْتَ قَبْلَكَ كَانَ الْمَوْتُ ضَادَفَنَا	لَمَامُضِيَّتِ وَ حَالَتْ دُونَكَ الْكُتُبُ
إِنَّا رُزِينَا بِمَا لَمْ يُرَزَّ ذُو شَجْنِ	مِنَ الْبَرِّيَّةِ، لَا عَجَمَ وَ لَا عَرَبْ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس کا خلاصہ،

حضرت زہراء (ع) نے اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کے بارے لوگوں کے سامنے ابوبکر پر اعتراض کیا اور اس کی مذمت کی۔ ابوبکر نے منافقت اور چالاکي سے استفادہ کرتے ہوئے آپ کی تعریف میں چند حملے کئے اور فدک کے غضب کرنے کو مسلمانوں کے اتفاق رائے کا نتیجہ قرار دیا اور ایسا ظاہر کیا کہ تمام مسلمان غضب فدک میں اس کی تائید کرتے ہیں اور اس کے ہمنوا ہیں۔
ابوبکر کی اس عوام فریبی اور اس مسئلے میں پوری قوم کو ملوث کرنے کے بعد، اتمام حجت کی خاطر آپ نے حاضرین مجلس کو مخاطب کر کے فرمایا:

لوگوں کی دوبارہ مذمت،

”فالتفتت فاطمہ (ع) الى الناس وقالت،

معاشر المسلمین المسرعة الى قیل الباطل“

(پھر حضرت فاطمہ (ع) لوگوں کی طرف متوجہ ہوئیں اور ان سے فرمایا:

اے مسلمانو! تم نے بہت ہی جلد باطل باتوں پہ کان دھریا ہے)

”قال، قیل“ دونوں بات اور کہنے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن عام طور پر ”قیل“ باطل باتوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اسے وہ گروہ جو باطل کے آتے ہی اس کی طرف لپک کر چلے گئے ہو اور جب اس نے چند باتوں کے ذریعے ایک غلط فضا قائم کی اور شوشا چھوڑا تو بہت جلد اس کا ساتھ دینے لگ گئے ہو۔ البتہ دوسرے بعض نسخوں میں ”الی قبول الباطل“ ہے یعنی مسلمانوں! تم نے باطل کو قبول کرنے میں بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔

یہی لوگ جو رسول خدا (س) کے زیر منبر رہتے تھے، علی (ع) کی شجاعت اور جہاد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اتنے سست عصر نکلے کہ جب سقیفہ میں پانچ آدمیوں نے متفق ہو کر ہرزہ سرائی شروع کی تو انہوں نے اہل بیت کے ان سارے فضائل کو بھلا دیا اور باطل سے گلہ لگالیا اس طرح حق کو اکیلا چھوڑ کر اس کی حمایت سے دستبردار ہو گئے! رحلت پیغمبر (س) کے بعد کے مسلمان یا تو بہت ہی احمق اور بے وقوف تھے یا ضعیف الایمان اور ڈرپوک تھے۔

”المفضبة علی الفعل القبیح الخاسر“

(لوگو! تم برے اور نقصان دہ امور کے مقابلے میں آنکھ بند کر لیتے ہو)

”اعضاء“ آنکھ بند کرنے اور چشم پوشی کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ: لوگو! تم جب باطل کو دیکھتے ہو تو اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے آنکھیں موند لیتے ہو اور حق کے دفاع کی ذمہ داریوں کو انجام نہ دینے کے لئے باطل کی توجیہ کرتے ہو۔

”افلا تتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالہا (۱)“

(کیا تم قرآن میں تدبر اور غور و فکر نہیں کرتے ہو؟ یا تمہارے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں؟)

حضرت زہراء (ع) قرآن کی آیات کو بطور شہادت پیش کرتی ہیں اور اس طرح مسجد میں حاضر مجمع کی سادہ لوحی اور جہالت کی مذمت فرماتی ہیں اور تاکید کرتی ہیں کہ آخر کیوں غور و فکر نہیں کرتے ہو؟ حکمران طبقے کے کاموں کو تدبر اور بصیرت کی نگاہ سے کیوں نہیں دیکھتے ہو؟ اور ان کے کاموں کو قرآن اور

۱۔ یہ جملہ ”علی قلوبکم“ تک مختصر تفاوت کے ساتھ سورہ محمد کی آیت ۲۴ سے لیا گیا ہے۔

اسلام کے مسلمہ معیاروں اور اقدار سے جانچ پڑتال کیوں نہیں کرتے ہو؟

”کَلَّا، بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِكُمْ مَا اسَاقَمَ مِنْ اَعْمَالِكُمْ“

(نہیں ایسا ہرگز نہیں، بلکہ تمہارے بدکردار ہونے کی وجہ سے تمہارے دل زنگ آلودہ ہو چکے ہیں۔

اور تمہاری فطرت مسخ ہو چکی ہے۔)

تم نے اس قدر حق کو پامال کیا اور باطل کی حمایت کی کہ تمہارے دل سیاہ ہو گئے ہیں اب میری یہ باتیں اور نصیحتیں تم پر اثر نہیں رکھتیں کیونکہ ہر غلط کام اس بات کا باعث بنتا ہے کہ انسان کے دل کی نورانی فضا کو آلودہ کرے اور دل کو زنگ آلود بنا کر۔ نور ہدایت کی تابش سے محروم کر دے اس طرح جب گناہ بڑھ جاتے ہیں تو آلودگی اور زنگ میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ انسان کا دل مکمل سیاہ ہو جاتا ہے اور حق کی بات اس پر اثر نہیں کر سکتی۔ قرآنی اصطلاح میں دل کی اس کیفیت کو ”رین“ کہا جاتا ہے۔ ”ران“ بھی اسی مادہ سے فعل ہے۔ اور اسی کیفیت پر دلالت کرتا ہے۔

”رَانَ عَلَى قُلُوبِكُمْ“ یعنی تمہارے دل زنگ آلود ہو کر سیاہ ہو چکے ہیں، جو پے در پے گناہ کرتا ہے۔ اور گناہ کو کئی بار انجام دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس مقام پر جا پہنچتا ہے کہ خدا اور اس کی نشانیوں کا بھی انکار کر دیتا ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے کہ: ”ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ اسَاؤُا السَّوْىٰ اَنْ كَذَبُوا بآيَاتِ اللّٰهِ“ (پھر بدکردار لوگوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں)۔

”فَاخْذْ بِسَمْعِكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ“

(ان غلط کاموں نے تم سے۔ تمہارے کانوں اور آنکھوں کو چھین لیا ہے)

یہاں کان اور آنکھ سے دل کی آنکھ اور کان مراد ہیں، یعنی تمہارے یہ برے کام اور غلط کردار اس بات کا سبب بنے ہیں کہ تمہاری بصیرت کی آنکھ نابینا ہو جائے اور تم حقیقت کو دیکھنے نہ پاؤ۔ اسی طرح تمہارے کان حق کی بات سننے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں، کیونکہ کبھی انسان، مقام و منصب یا مال دنیا کی شدید محبت کی خاطر یا حکمرانوں کی سختی، مشکلات اور خوف کی وجہ سے حقیقت سے چشم پوشی کر لیتا ہے

اور بسا اوقات حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگتا ہے یا ان کی غلط توجیہ کرتا ہے۔

امامت کی رالامیں تحریف اور اس کامستقبل،

”ولبنس ما قاولتم“

(تم نے بہت بری تاویل کی ہے۔ یا: تمہارے کام کا انجام بہت ہی برا ہے۔)

اس حملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں:

۱۔ ”اول“ یعنی عاقبت، نتیجہ: بنا بریں حملے کا معنی یہ ہو گا کہ تمہارے اس اقدام کی عاقبت اور انجام انتہائی برے نقطے پر پہنچ چکا ہے، کیونکہ تمہاری سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم نے اسلام اور قرآن کے نام پر، ایک ایسی ہستی کے خلاف سازشیں کیں جو مجسمہ اسلام و عدالت تھا اور اسلام کو تم نے اپنے اصلی راستے سے منحرف کر دیا ہے۔

۲۔ تم ایک غلط تاویل اور توجیہ میں بری طرح پھنس گئے ہو، کیونکہ وہ لوگ جو ان برے اعمال کے مرتکب ہوئے تھے اور حق کو پامال کر دیا تھا، عام طور پر اپنی ایسی حرکات کے لئے شرعی جواز گھڑ لیتے تھے اور اپنے کاموں کی توجیہ کرتے تھے وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم حق کے خلاف قدم اٹھا رہے ہیں بلکہ اپنے غلط کاموں کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، قرآن کریم اس قسم کے افراد کے بارے میں فرماتا ہے کہ: ”ان الذین یکتبون ما انزل اللہ من الکتاب ویشترون بہ ثمنًا قلیلًا، اولئک ما یاکلون فی بطونہم الا النار، لایکلمہم اللہ یوم القیامۃ ولا یزکیہم ولہم عذاب الیم (۱)“ (جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب۔ اور حق بات۔ کو چھپاتے ہیں اور اسے سستے داموں بیچ دیتے ہیں، یہ لوگ اپنے پیٹ کو آتش۔ جہنم۔ سے بھر رہے ہیں، قیامت کے دن خدا ان سے بات نہیں کرے گا اور نہ ہی ان کو اپنے گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لئے ایک دردناک عذاب ہے)۔

”وساء ما بہ اشرتم“

(اور جس چیز کی طرف تم نے اشارہ کیا وہ بہت ہی برا ہے)

۱۔ سورۃ بقرہ / ۱۷۴۔

انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی سے سرکار رکھنا چاہئے اور معاشرتی امور میں مداخلت کی ضرورت نہیں ہے، حق کی یا باطل کی جو بھی حکومت آجائے۔ اور جو بھی حکمران بن جائے۔ اس کے ساتھ مسالمت آمیز رابطہ اور تعلق رکھنا ضروری ہے! حالانکہ یہ طرز فکر بنیاد سے ہی باطل اور غلط ہے۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہمیشہ حق کی بات کریں، حق کے محافظ، مظلوموں کے مددگار اور ظالموں کے دشمن رہیں۔ امیر المؤمنین (ع) امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ”کونا للظالم خصماً وللمظلوم عوناً“ (آپ دونوں ظالم کے دشمن اور مظلوم کے حامی رہیں) ”قولا للحق واعملا للاجر (۱)“ (حق بات کہیں اور اجر۔ خداوندی۔ کی خاطر کام کریں)۔

اسلام، رسول خدا (س) اور ائمہ طاہرین (ع) کی راہ و روش، آسائش اور سکون نہیں ہے لہذا ہم سب پر فرض ہے کہ معاشرے میں رونما ہونے والے امور کے بارے میں ذمہ داری کا احساس کریں اور خاموش نہ رہیں۔ اگر اس دور کے مسلمان، دنیا پرستی اور مقام پرستی کے بجائے حق کا دفاع کرتے اور امر بالمعروف و نہی از منکر کرتے تو اسلام اپنی صحیح اور اصلی شاہراہ پر گامزن رہتا اور آج مسلمان، ان ساری مصیبتوں اور بد بختیوں کا شکار نہ ہوتے، لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے، اسلام کے احکام اور پیغمبر اسلام (س) کے احکامات پر دنیا کی چند روزہ زندگی اور مقام و منصب کو۔ جو وہم و گمان سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ترجیح دی اور اپنے اس نامعقول کام کو شرعی لبادہ بھی پہنا دیا۔ لہذا آپؐ فرماتی ہیں کہ: بہت بری ہے وہ چیز! جس کی طرف تم نے اشارہ کیا ہے (۲)۔

”وشر ما منه اعتضتم۔ اغتصبتم۔“

(۔۔ ان مظالم کے عوض میں۔۔ جو کچھ تم نے حاصل کیا ہے۔۔ یادہ چیز جسے تم نے غضب کیا ہے۔۔ وہ بہت بری ہے)

۱۔ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے نام حضرت علیؑ کی وصیت، مکتوب ۷، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲،

یہ عبارت دو طرح سے نقل ہوئی ہے:

۱۔ ”شَرَّ مَا مِنْهُ اغْتَصَبْتُمْ“ یعنی تم آئے اور خلافت کو غضب کیا اور فدک کو چھین لیا، اہل بیت رسول (م) پر ستم روا رکھا، یہ تمہاری آخرت کو تباہ کر دے گا۔

۲۔ دوسری عبارت جسے بحار میں علامہ مجلسیؒ نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ ”شَرَّ مَا مِنْهُ اعْتَصَبْتُمْ“ اس کا مصدر ”اعتیاض“ اور عوض و بدلہ کے معنی میں ہے۔ یعنی تم علی (ع) کو خانہ نشین کر کے ابو بکر کے ٹولے کو اقتدار کی کرسی تک لائے اور فدک کو غضب کر کے تم نے بہت برے بدلے کا انتخاب کیا ہے۔

”لَتَجِدَنَّ وَاللَّهَ مَحْمَلَهُ ثَقِيلًا“

(خدا کی قسم! تم اسے وزنی پاؤ گے اور نہیں اٹھا سکو گے)

”لتجدن“ میں جو لام ہے اسے لام توطئہ کہتے ہیں، چونکہ یہ قسم کا مقدمہ اور اس کی تہید ہے۔ یہ لام اس بات کی علامت ہے کہ یہاں (واللہ کا فعل) قسم محذوف ہے۔

آپؐ کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی قسم جس چیز کو تم نے غضب کیا ہے اس کا بوجھ بہت وزنی ہے اور قیامت کے دن اس کے بارے میں تمہیں جواب دینا پڑے گا۔ البتہ دنیا میں بھی اس کی ذمہ داری اٹھانا بہت مشکل ہے، کیونکہ اموی اور عباسی دور استبداد سے لے کر امام مہدی علیہ السلام کے ظہور تک جتنے انحرافات اور ظلم و ستم ہوئے ہیں اور ہوں گے، ان سب کی علت یہ ہے کہ صدر اسلام میں اہل بیتؑ سے امامت اور خلافت چھینی گئی تھی۔

”وَعَبْهُ وَبِيلًا“

(اور اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا)

”عَبْ“ کسی کام کے انجام کو کہا جاتا ہے جبکہ ”وَبِيل“ اور ”وَبَال“ حالت کے صحیح نہ ہونے اور برے انجام کو بولا جاتا ہے۔ تمہارے اس اقدام کی عاقبت اور اس کا انجام دنیا و آخرت دونوں میں بہت ہی برا ہے۔ خلافت اور فدک، غضب کرنے کے برے انجام سے تم اس وقت واقف ہو گے کہ:

”اِذَا كُشِفَتْ لَكُمْ الْغُطَاءُ“

(جب پردے ہٹا دیے جائیں گے)

”غطاء“ پردے اور ڈھانپنے کی چیز کو کہتے ہیں۔

یعنی جب قیامت برپا ہوگی اور پردے ہٹ جائیں گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے اس اقدام کا نتیجہ کیا تھا۔ قرآن بھی فرماتا ہے کہ: جب صور پھونکا جائے گا اور قیامت آئے گی تو ہر شخص اپنے اعمال اور اس کے نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اس وقت اسے خطاب کیا جائے گا کہ: ”لقد كنت في غفلة من هذا فكشفنا عنك غطاءك فبصرك اليوم حديد (۱۱)“ (بے شک۔ دنیا میں۔ تم اس عالم کے بارے میں غافل تھے پھر ہم نے تم سے پردہ ہٹایا پس آج تمہاری نگاہ بڑی تیز ہے۔

”وبان ما ورائه من الضراء۔ الضراء۔“

(اور۔ اس پردے۔ کے پیچھے جو سختیاں اور مشکلات ہیں وہ ظاہر ہوں گی)

”ضراء“ بد حالی اور زندگی کی سختی کا نام ہے جبکہ اس کے مقابل میں خوشحالی کو ”سراء“ کہا جاتا ہے۔ یعنی جب پردے ہٹ جائیں گے اور اس کے پیچھے قیامت کی سختیوں اور مشکلات کا مشاہدہ کریں گے تو اپنے کاموں کی خطرناک عاقبت کی طرف متوجہ ہوں گے۔

بعض نسخوں میں مذکورہ عبارت میں ”ضراء“ کے بجائے ”ضراء“ (یعنی راء بغیر تشدید کے) نقل ہوئی ہے۔ ”ضراء“ کے معنی ہیں بہت زیادہ درخت جن کے پیچھے چھپ سکیں۔ بنا بریں اس جملہ کا مقصود یہ ہے کہ اس وقت تم اپنے حواریوں اور غلط افکار و نظریات کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہو اور اپنے چہرے پہ شرعی جواز کا خول چڑھا کر چھپائے ہوئے ہو لیکن جب قیامت برپا ہوگی اور تمام پردے ہٹا دیے جائیں گے تو تم کسی دوسری چیز کو دیکھو گے جو آج مر تکب ہونے والی خیانتوں کا نتیجہ ہوگی۔

اس احتمال کے مطابق۔ جیسا کہ علامہ مجلسی فرماتے ہیں۔ ”وراء“ کے لفظ میں ”ہاء“ زائد ہے اور ممکن ہے لکھنے والے کی یا چھاپ کی غلطی کی وجہ سے ”ہاء“ کا حرف زیادہ ہو گیا ہو۔ البتہ پہلا احتمال اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

”وبدا لكم من ربكم ما لم تكونوا تحتسبون“

(اس دن اپنے پروردگار کی طرف سے تم پر ایسی چیزیں ظاہر ہوں گی کہ جس کا تمہیں گمان بھی نہ تھا) یعنی قیامت کے حساب و کتاب کے بارے میں تم سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ لیکن وہ آکے رہے گی۔

جب انسان دنیا کی لذتوں میں غرق ہو اور وہ مال و دولت، مقام و منصب اور قدرت و ریاست کا عاشق بن گیا ہو تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ یہ سب مقام و منصب اور مال و ثروت کسی کے حوالہ کر کے اس نے جدا ہونا ہے، لیکن ان تمام کا حساب اسی نے دینا ہے۔

”وخسر هنالك المبتطلون (۱)“

(باطل کے پیروکار وہاں گھائے میں ہوں گے)

بابا کے روضے پر درد دل کا بیان،

”ثم عطف على قبر النبي (ص) وقالت،“

(پھر حضرت زہراء (ع) قبر رسول (ص) کی طرف متوجہ ہوئیں اور فرمایا:)

مسجد میں موجود مسلمانوں کو آپؐ کا خطاب، یہاں پر اختتام پذیر ہوتا ہے اور آپؐ رسول خدا (ص) کے روضے کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور چند اشعار کے ضمن میں اپنے درد دل اور سوز جگر کا اظہار فرماتی ہیں۔ اگرچہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان اشعار کے چند بیت ”ہند بنت اثاثہ“ کے ہیں (۱۲) چونکہ یہ اشعار اس مجلس سے زیادہ مناسب تھے لہذا حضرت زہراء (ع) نے ان اشعار سے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے استفادہ کرتے ہوئے رسول خدا (ص) کی قبر کے سامنے ان کو پڑھا۔ اگرچہ یہ اشعار بہت زیادہ ہیں لیکن ”کتاب احتجاج“ میں صرف یہ چند بیت نقل ہوئے ہیں:

۱۔ سورۃ غافر / ۷۸۔

۲۔ چند بیت کے علاوہ باقی سب اشعار کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر رسول خداؐ کے بارے میں کہے گئے ہیں اب چاہے یہ اشعار خود حضرت زہراءؑ کے ہوں یا ہند بنت اثاثہ کے آنحضرتؐ کے سوگ میں کہے گئے ہیں۔

”قد کان بعدک انباء وھنبثۃ لو کنت شاھدھا لم تکثر الخطب“

(اے رسول خدا (ص)!۔ بتقیق آپ کے بعد بہت ساری خبریں اور سختیاں اور حوادث رونما ہوئے ہیں

اگر آپ (ص) شاہد اور حاضر ہوتے تو ان مصیبتوں میں اضافہ نہ ہوتا)

”قد کان...“ کی عبارت میں ”کان“ نامہ ہے (۱) یعنی ”وجد“ موجود ہونے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لہذا اسے خبر کی ضرورت نہیں (۔ یہ عربی گرامر سے مربوط ایک بحث ہے۔) ”ھنبثۃ“ سختی اور حادثہ کو کہا جاتا ہے نیز ہنگامہ کر کے یہودیگی کا مرتکب ہونے کو بھی ”ھنبثۃ“ کہا جاتا ہے، چونکہ سقیفہ میں موجود ہر پارٹی کے افراد اپنی پارٹی کے لئے جدوجہد میں مشغول تھے تاکہ اپنی پارٹی کے کسی رکن کو مسلمانوں کا حاکم بنایا جائے اس سیاسی کشمکش میں پروپیگنڈے اور زورگوئی کے ذریعے ابو بکر کی پارٹی خلیفہ بنانے میں کامیاب ہوئی، اس سلسلے میں سقیفہ اور دوسری جگہوں پر جو حادثات رونما ہوئے ہیں ان کو یہاں ”ھنبثۃ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

”قد کان بعدک انباء وھنبثۃ“ یعنی، اے رسول خدا (ص)! تیرے بعد ایسے حادثات اور ناگوار

واقعات رونما ہوئے کہ ”لو کنت شاھدھا“ اگر آپ (ص) حاضر ہوتے تو شاید ”لم یکثر الخطب“ اتنی کثرت سے ایسے المناک حادثات رونما نہ ہوتے، ”خطب“ یعنی بڑا حادثہ، یعنی آپ (ص) اس دنیا سے چلے گئے تو ان لوگوں نے اپنی مرضی سے جو چاہا کر لیا اور جو چاہا آپ (ص) کی طرف منسوب کر دیا۔

”انا فقدناک فقد الارض وابلھا واختل قومک فاشھدھم ولا تغب“

(ہم نے۔ اے رسول خدا (ص)! آپ کو اس طرح کھودیا ہے کہ جس طرح زمین بارش کو کھو بیٹھتی ہے

اور تیری قوم کا شیرازہ بکھر گیا ہے، پس اے رسول خدا (ص)! گواہ رہنا اور ان سے غائب نہ رہنا)

”واہل“ اس بارش کا نام ہے جو مسلسل برے اور زمین کی آبادی کا باعث بنے، کیونکہ اگر بارش

نہ برے تو زمین بخر بن جاتی ہے، چونکہ رسول خدا (ص) کا وجود با برکت ہے اور آپ (ص) انسانی

۱۔ ”کان نامہ“ اس ”کان“ کو کہا جاتا ہے جو ”موجود ہے“ یا ”تھا“ کے معنی میں آئے، اس ”کان“ کے لئے خبر کی ضرورت نہیں، جبکہ ”کان ناقصہ“ جملہ اسمیہ پر داخل ہوتا ہے اور اسم و خبر کا مصلح ہے نیز خبر کذا لے سے ہی اس کا معنی مکمل ہوتا ہے۔

معاشرے کے لئے حیات کا موجب تھے اسی لئے حضرت زہراء (ع) آنحضرت (ص) سے خطاب کر کے فرماتی ہیں کہ: ہم نے آپ (ص) کو اس طرح کھودیا ہے جس طرح زمین اس بارش کو کھودیتی ہے جو زمین کی حیات اور آبادی کا سبب بنتی ہے۔

در اصل آپ (ع) ان اشعار کے ذریعے پیغمبر (ص) کی خدمت میں اپنا درد دل بیان کرنا چاہتی ہیں اور آنحضرت (ص) کے حضور مسلمانوں کی شکایت کرنا چاہتی ہیں۔

”وکل اهل له قربة ومنزلة عند الله على الدين مقترب“

(ہر وہ شخص جس کو خدا کے ہاں قرب و منزلت حاصل ہو وہ اپنے رشتہ داروں سے بھی نزدیک ہوتا ہے)

”ادنین، ادنیٰ“ کی جمع ہے جس طرح ”مصطفیٰ“ کی جمع ”مصطفین“ ہے۔

علامہ مجلسی نے اس عبارت کے معنی کے بارے میں چار احتمال دیئے ہیں لیکن میں یہ احتمال دیتا ہوں کہ شاید حضرت فاطمہ زہراء (ع) کا مقصد یہ ہو کہ: اے رسول خدا (ص)! آپ (ص) جو خدا کے ہاں قرب و منزلت رکھتے ہیں، ہمیں بھی یاد رکھیں اور ہمیں فراموش نہ کریں، کیونکہ جو بھی درگاہ خداوندی کا مقرب بن جائے تو وہ اپنے رشتہ داروں کی شفاعت کرتا ہے اور ان کے لئے بارگاہ خدا میں دعا کرتا ہے تاکہ ان کی حاجات روا ہو جائیں اور ان کی مشکلیں آسان ہو جائیں۔ تو اے حبیب خدا! اپنی بیٹی اور داماد کی طرف ایک نظر کرم کر اور ان کی طرف اپنی توجہ فرما۔ بنا بریں ”کل اهل...“ کی عبارت سے مراد پیغمبر اکرم (ص) ہیں، یعنی رسول خدا (ص) اپنے اہل بیت (ع) کو لطف و عنایت کی نظر سے دیکھیں۔

”ابدت رجال لنا نجوى صدورهم لما مضت وحالت دونك التراب“

(جو لوگ اپنے دلوں میں ہم سے پوشیدہ دشمنی رکھتے تھے، جب آپ (ص) چلے گئے

اور یہ مٹی ہمارے درمیان حائل ہوئی تو انہوں نے اپنی دشمنی ظاہر کر دی)

جن لوگوں نے رحلت رسول خدا (ص) کے بعد حضرت علی (ع) اور حضرت فاطمہ (ع) کے خلاف سازشیں کیں در اصل وہ اپنے دل کی بیماری کو آشکار کر رہے تھے۔ ان میں سے بعض لوگوں کو احد و بدر جیسی گزشتہ جنگوں میں حضرت علی (ع) کے ہاتھوں زخم لگے تھے کیونکہ ان کے عزیز اور رشتہ دار حضرت

امیر المؤمنین (ع) کی تلوار سے قتل ہو چکے تھے۔ بعض لوگ اسلام کے ابتدائی دنوں سے ہی حضرت علیؑ سے حسد رکھتے تھے اور وہ آپ (ع) کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ جب پیغمبر اکرم (ص) نے وفات پائی تو ان کے ہاتھ کھل گئے اور دل میں جو بغض و حسد رکھتے تھے اب ان کو جامہ عمل پہنانے لگے۔

”نجوی صدور ہم“ یعنی جو بات دل میں آہستہ کہا کرتے تھے اسے ظاہر کر دیا ہے۔ یہ لوگ بظاہر کچھ نہیں کہتے تھے لیکن دل سے حضرت علی (ع) کی مخالفت کرتے تھے۔ اور پیغمبر (ص) کی زندگی میں اسے اظہار کرنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ اور ابھی ان کو آشکار کر دیا ہے۔ ”لما مضیت“ جب آپ (ص) اس دنیا سے چلے گئے، یعنی وفات پا گئے۔

”و حالت دونک التراب“ اور ہمارے درمیان مٹی کے ڈھیر حائل ہو گئے۔ یعنی آپ (ص) کی وفات کے بعد اب جبکہ انہیں اپنے مقاصد کی راہ میں کوئی مانع نظر نہیں آیا تو اسی لئے ان لوگوں نے اپنی سازشوں اور شیطانی نقشوں پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے اور اپنی دشمنیوں کو علی الاعلان ظاہر کر رہے ہیں۔

”تجہمتنا رجال واستخف بنا لما فقدت وکل الارث مفتصب“

(جب ہم نے آپ (ص) کو کھو دیا تو لوگوں نے ہمیں اپنے حملے کا نشانہ بنایا۔ اور ہمارے ساتھ

چہرہ بگاڑ کر سخت برتاؤ کیا۔ اور ہماری عزت کا خیال نہ رکھنا نیز تمام کے تمام ارث کو بھی غصب کر لیا (۱۱))

البتہ ”احتجاج“ میں ”کل الارض“ (یعنی تمام اراضی) ذکر ہوا ہے۔ اس عبارت کے مطابق آپؑ کا اشارہ فدک کی تمام اراضی کی طرف ہے۔

۱۔ آپؑ کی اس تعمیر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ فدک، امامت کی علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور دراصل آپؑ کا اعتراض اس بات پر تھا کہ اہل بیتؑ سے خلافت و امامت کیوں چھینی گئی کیونکہ یہ خلافت اور امامت، پیغمبرؐ سے اہل بیتؑ کو ملنے والی میراث تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو آپؑ کا یہ فرمانا کہ ”کل الارث مفتصب“ مناسب نہ تھا کیونکہ فدک اگر پیغمبرؐ کا ترکہ بھی ہوتا تو پھر بھی ارث فدک تک محدود نہ تھا، البتہ آپؑ نے صراحت کے ساتھ خلافت اور امامت کا ذکر نہیں فرمایا اس کی علت شاید یہ ہو کہ یا تو حاضرین مجلس سیاسی مسائل سمجھنے میں کمزور اور کوتاہ فکر تھے یا اس لئے کہ آپؑ پر دنیا پرستی اور مقام پرستی کی حسد نہ لگے یا بعض اور وجوہات تھیں جو ہم نہیں جانتے۔

”وكنت بدراً ونوراً يستضاء به عليك ينزل من ذى العزّة الكتب (ا)“

(آپ (م) اور خشان بدر کامل اور روشنی تھے جس سے لوگ روشنی پاتے تھے

اور آپ (م) پر خدا کی طرف سے کتابیں نازل ہوتی تھیں)

”وكان جبريل بالآيات يؤنسنا فقد فقدت وكل الخير محتجب“

(جبریل آیات خداوندی کے ساتھ ہمارا مونس و ہمد تھا لیکن آپ (م) کی رحلت کے بعد خوبیاں ہم سے چھپ گئیں)
جب جبریل آیات خداوندی لے کر پیغمبر اکرم (م) کے پاس آتا تھا تو لازمی طور پر اس کے نیک
آثار سے دوسروں سے زیادہ حضرت زہراء (ع) اور حضرت امیر المؤمنین (ع) فیض یاب ہوتے تھے اسی
لئے پیغمبر اسلام (م) کی رحلت سب سے زیادہ اہل بیت پر گراں گزری۔

”فليت قبلك كان الموت صادفنا لما مضيت وحالت دونك الكتب“

(اس سے قبل کہ آپ (م) اس دنیا سے جاتے اور ہمارے درمیان ریت اور کنکریوں کے ڈھیر حائل ہو جاتے۔

کاش ہمیں موت آجاتی۔ یعنی اے کاش آپ (م) اے پہلے ہم وفات پاچکے ہوتے۔)

”الكتب، کتیب“ کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں ریت اور کنکریاں۔

چونکہ وہ علاقہ ایک ریت والا علاقہ تھا اس لئے لوگ قبروں کو ریت سے ڈھانپ دیتے تھے۔ آپ (ع)
یہاں رسول خدا (م) کے مدفون ہونے کی تلخ حقیقت کو اس طرح بیان فرماتی ہے کہ ہمارے اور آپ (م)
کے درمیان ریت اور کنکریوں کے ڈھیر حائل ہو گئے۔

”لنسا ذینا بما لم یرز ذو شجن من البریة، لا عجم ولا عرب“

(ہم پر ایسی مصیبت ٹوٹ پڑی کہ عرب اور عجم کے کسی بھی غمگین اور حزن انسان پر ایسی مصیبت نہیں آتی)

حضرت زہراء (ع) ان اشعار کے ذریعے رسول خدا (م) کو اپنا درد دل سنانے کے بعد مسجد سے

۱۔ آنحضرتؑ پر کتابیں نازل ہونے کا مطلب یا تو خدا کے احکامات ہیں جو عمومی طور پر قرآن کی شکل میں موجود ہیں یا قرآن نازل
ہونے سے قبل دوسری آسمانی کتابوں سے آپؑ کو واقف کرنا مقصود ہے، کیونکہ آپؑ سابقہ آسمانی کتابوں کے غیر تحریف شدہ اور
واقعی حقائق سے آگاہ تھے۔

نکل کر اپنے گھر کی طرف تشریف لے گئیں۔

روایت میں منقول ہے کہ اس دوران حضرت علی (ع) اپنے گھر میں تشریف رکھتے تھے اور حضرت زہراء (ع) کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے اور بار بار گھر سے باہر دیکھتے تھے تاکہ یہ دیکھیں کہ حضرت فاطمہ زہراء (ع) واپس تشریف لارہی ہیں یا نہیں۔ جب حضرت زہراء (ع) گھر میں داخل ہوئیں تو آپؑ اور حضرت علیؑ کے درمیان ایک گفتگو ہوئی، انشاء اللہ آئندہ درس میں ہم اس پر بحث کریں گے۔

وصلی اللہ علی محمد وآل محمد (ص)

بارہواں درس:

- ✽ حضرت علی (ع)، حضرت زہراء (ع) کے انتظار میں
- ✽ حضرت علی (ع) کے حضور سوز دل کا بیان
- ✽ حکومت کے حضرت زہراء (ع) کے ساتھ عناد اور دشمنی کی تصویر کشی
- ✽ عام لوگوں کی بے توجہی کو مجسم کرنا
- ✽ جہاد کی سی خاموشی
- ✽ حضرت علی (ع) کی مظلومیت اور اسلام کی مصلحت
- ✽ اہل بیت (ع) کی مظلومیت اور بے کسی کی انتہاء
- ✽ بابا کے حضور شکایت اور بارگاہ خداوندی میں مناجات
- ✽ حضرت علی (ع) کا حضرت زہراء (ع) کو تسلی دینا
- ✽ حضرت علی (ع) کے حضور حضرت زہراء (ع) کے درد دل کا ایک تجزیہ
- ✽ فدک کے بارے میں حضرت زہراء (ع) کے اصرار کا فلسفہ
- ✽ ایک عرب شاعر کی زبانی، انصار اور مہاجرین کے سکوت کی تصویر کشی

ثُمَّ انْكَفَأَتْ ﷺ وَ أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ ﷺ يَتَوَقَّعُ رُجُوعَهَا إِلَيْهِ، وَ يَتَطَّلَعُ طُلُوعَهَا عَلَيْهِ؛ فَلَمَّا اسْتَقَرَّتْ بِهَا الدَّارُ، قَالَتْ لِأَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ ﷺ:

يَا بَنَ أَبَى طَالِبٍ! إِشْتَمَلَتْ شَمْلَةَ الْجَنِينِ، وَ قَعَدْتَ حَجْرَةَ الظَّنِّينِ، نَقَضْتَ قَادِمَةَ الْأَجْدَلِ، فَخَانَكَ رِيْشُ الْأَعْزَلِ؛ هَذَا ابْنُ أَبِي قُحَاةٍ يَبْتَزُّنِي نِخْلَةَ أَبِي وَ بُلْغَةَ ابْنِي [إِبْنِي]! لَقَدْ أَجْهَدَ فِي خِصَامِي، وَ أَلْفَيْتُهُ أَلَدَّ فِي كَلَامِي حَتَّى حَبَسْتَنِي قَيْلَةَ نَصْرَهَا، وَ الْمُهَاجِرَةَ وَصَلَهَا، وَ غَضَبْتَ الْجَمَاعَةَ دُونِي ظَرْفَهَا، فَلَا دَافِعَ وَ لَا مَانِعَ، خَرَجْتُ كَأَظْمَةٍ وَ عُدْتُ رَاغِمَةً، أَضْرَعْتُ خَدَّكَ يَوْمَ أَضَعْتَ خَدَّكَ، إِفْتَرَسَتْ الذُّنَابُ، وَ افْتَرَشَتْ التُّرَابُ، مَا كَفَفْتُ قَائِلًا وَ لَا أَغْنَيْتُ طَائِلًا، وَ لَا خِيَارَ لِي، لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَيْتِي وَ دُونَ ذَلَّتِي؛ عَذِيرِيَّ اللَّهُ مِنْكَ عَادِيًا وَ مِنْكَ خَامِيًا، وَيَلَايَ فِي كُلِّ شَارِقٍ! وَيَلَايَ فِي كُلِّ غَارِبٍ! مَاتَ الْعَمَدُ وَ وَهِنَ الْعَصْدُ؛ شَكُوَائِي إِلَى أَبِي! وَ عَذُوَائِي إِلَى رَبِّي! اللَّهُمَّ أَنْتَ أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَ حَوْلًا، وَ أَشَدُّ بَأْسًا وَ تَنْكِيلًا.

فَقَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ ﷺ: لَا وَئِيلَ لَكَ، بَلِ الْوَيْلُ لِشَانِيكَ، ثُمَّ نَهْنَهَى عَنْ وَجْدِكَ يَا ابْنَةَ الصَّفْوَةِ، وَ بَقِيَّةَ النُّبُوَّةِ؛ فَمَا وَنَيْتُ عَنْ دِينِي، وَ لَا أَخْطَأْتُ مَقْدُورِي؛ فَإِنْ كُنْتُ تُرِيدِينَ الْبُلْغَةَ، فَرِزْقُكَ مَضْمُونٌ، وَ كَفِيلُكَ مَأْمُونٌ، وَ مَا أَعَدُّ لَكَ أَفْضَلَ مِمَّا قَطَعَ عَنْكَ، فَاحْتَسِبِي اللَّهَ.

فَقَالَتْ ﷺ: حَسْبِيَ اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ؛ وَ أَمْسَكَتْ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ دروس میں ہم حضرت زہراء سلام اللہ علیہا کے اس خطبے سے آگاہ ہوئے جو آپؑ نے فدک کے سلسلے میں مسجد میں ارشاد فرمایا تھا۔ آپؑ نے اپنی صریح اور مدلل گفتگو کے ذریعے ابوبکر کی مذمت کی اور مسجد میں موجود لوگوں کی خاموشی پر ان کی توبیخ فرمائی، لیکن ابوبکر نے مکاری اور چالاکي سے کام لیتے ہوئے آپؑ کی تعریف و تمجید کرنا شروع کر دی اور خلافت و فدک کے غضب کے مسئلے کی توجیہ کر کے اسے جائز ٹھہرانے کی کوشش کی۔

حضرت زہراء (ع) ابوبکر کی پر فریب گفتگو کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئیں اور ان کی سخت توبیخ اور مذمت فرمائی، پھر رسول خدا (س) کی قبر کے سامنے چند سوزناک ابیات کے ذریعے اپنے درد دل کا اظہار فرمایا کہ ہم نے اختصار کے ساتھ جن کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حضرت علی (ع)، حضرت زہراء (ع) کے انتظار میں،

گھر میں حضرت امیر المؤمنین (ع)، حضرت فاطمہ زہراء (ع) کی واپسی کے منتظر ہیں اور شاید ان کے بارے میں پریشان ہیں اسی لئے آپ (ع) بار بار گھر سے باہر کی طرف نگاہ کرتے ہیں۔

روایت کے مطابق جب حضرت فاطمہ (ع) نے اپنی تقریر تمام فرمائی، تو بابا کی قبر پر سوزناک انداز

میں چند اشعار کہے اور گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔

”ثم انكفات (ع) وامير المؤمنين (ع) يتوقع رجوعها اليه“

(پھر آپ (ع) گھر کی طرف روانہ ہوئیں حالانکہ امیر المؤمنین (ع) آپ (ع) کی واپسی کے منتظر تھے)

”ويتطلع طلوعها عليه“

(اور آپؑ بار بار گھر سے نکل کر حضرت زہراء (ع) کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے)

”تطلع“ بار بار دیکھنا۔ حضرت علی (ع) بار بار گھر سے نکل کے آپؑ کی آمد کا بے چینی سے انتظار

فرما رہے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے آپؑ حضرت زہراء (ع) کے بارے میں پریشان تھے کہ کہیں خدا
نخواستہ دشمن آپؑ کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہ کرے۔

حضرت علی (ع) کے حضور سوز دل کا بیان،

”فلما استقرت بها الدار، قالت لامير المؤمنين (ع)“

یا بن ابی طالب! اشملت شملة الجنین“

(پس جب آپؑ گھر میں پہنچیں تو امیر المؤمنینؑ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اے ابو طالب کے فرزند! اس طرح خانہ نشین ہو گئے کہ جس طرح رحم مادر میں بچہ چھپا ہوا ہوتا ہے)

”وقعدت حجرة الظنین“

(اور ملزموں کی طرح گوشہ نشین ہو چکے ہو)

وہ شخص جو ملزم ہوتا ہے عام طور پر کسی گوشے میں اپنے آپ کو چھپاتا ہے۔ حضرت زہراء (ع)!

حضرت علی (ع) سے یہ فرماتی ہے کہ: ”ملزم لوگوں کی طرح ایک کونے میں بیٹھ گئے ہو“ اور ہاتھ پہ ہاتھ

دھرے کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ اور تلوار کیوں نہیں چلاتے ہو اور ان کو ادب کیوں نہیں کرتے ہو؟۔

”مقصد قائمۃ الاجدال فحاشک ریش الزعرل“

(کیا آپؑ دہی نڈر انسان نہیں کہ جس نے شاہین کے پر توڑے لیکن ابھی لوگ خالی ہاتھوں سے آپؑ سے خیانت

کر رہے ہیں)

اس عبارت کے کئی معانی ذکر ہوئے ہیں، لیکن علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار (۱) میں جو معنی ذکر فرمایا ہے وہ سب سے بہتر اور مقصود کو سمجھانے کے لئے زیادہ واضح تر ہے۔

اس معنی کے مطابق حضرت فاطمہ (ع) عمرو بن عبدود جیسے عرب کے دلیر اور شجاع پہلوانوں کو شاہین سے تشبیہ دیتی ہیں اور حضرت امیر المؤمنین (ع) سے مخاطب کر کے فرماتی ہیں کہ: ”آپؑ وہی انسان تو تھے جو شکاری شاہین کے پروں کو توڑ دیتے تھے“ بدرۃ احد اور خبیر... جیسی جنگوں میں مشرک سرداروں کو شکست فاش دیتے تھے اور ان کی ناک کو زمین پر رگڑ دیتے تھے۔ آپؑ کے مقابلے میں ابو بکر اور عمر کی کوئی حیثیت ہی نہیں کہ آپؑ ہتھیار ڈال دیں اور اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو جائیں اور کوئی قدم نہ اٹھائیں!۔

”نقضت قادمة الاجدل“ ”قادمہ“ آگے والے پر کو کہتے ہیں، شکاری شاہین کے اگلی طرف دس پر ہوتے ہیں اور وہ انہی پروں کے ذریعے پرواز اور شکار کرتا ہے۔ پروں کے اس مجموعے کا نام ”قوادم“ ہے جو ”قادمہ“ کی جمع ہے۔ یہاں ”قادمہ“ اسم جنس ہے اسی لئے مفرد آیا ہے۔ ”اجدل“ شاہین کا نام ہے۔ بنا بریں اس جملہ کا معنی یہ ہو گا کہ آپؑ تو ایسے شخص تھے کہ جس نے شجاعت کے ساتھ شاہین۔ عرب کے دلیر اور شجاع انسانوں کے پر توڑ دیئے اور ان کو شکست دی۔

”فخانک ریش الاعزل“ ”فخانک“ میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہ لفظ ”فخانک“ ہو یعنی خالی ہاتھ اور اسلحہ سے محروم افراد نے آپؑ کے ساتھ خیانت کی ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ ”فخانک“ ہو، یعنی اسلحہ سے عاری لوگوں نے آپؑ کو شکست دی ہے۔

”ریش الاعزل“ تیر کی نوک کو ”اعزل“ اور باقی حصے کو ”ریش“ کہا جاتا ہے اور ”ریش الاعزل“ کے معنی ہیں تیر کا وہ دستہ جس کی نوک ٹوٹ چکی ہو یعنی وہ شخص جو اپنا تیر اور اسلحہ کھو چکا ہو اور صرف لکڑی کا دستہ کے باقی رہ گیا ہو۔

بہر حال حضرت زہراء (ع) کا مقصد یہ ہے کہ۔ اے امیر المؤمنینؑ۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب آپؑ

اپنی شجاعت اور دلیری سے عرب کے دلیر، بہادر اور نامی پہلوانوں کو شکست دیتے تھے ان کی شوکت و دبدبے کو خاک میں ملا دیتے تھے لیکن آج آپ کی حالت یہ ہے کہ ابو بکر و عمر جیسے بے حیثیت لوگوں نے کہ جن کے پاس کوئی اسلحہ بھی نہیں ہے فقط شور شرابے سے آپ کو شکست دی ہے اور آپ بھی گویا ہتھیار ڈال چکے ہیں!!

حکومت کے حضرت زہراء (ع) کے ساتھ عناد اور دشمنی کی تصویر کشی،

”ہذا ابن ابی قحافة یبتزنی نحلة ابی وبلغه ابنی۔ ابنی۔“

(اور ابی قحافہ کا یہ لڑکا میرے بابا کی بخشش اور میرے بچوں کے ذریعہ معاش کو مجھ سے چھین رہا ہے!!)

”ابتزاز“ کی اصل ”بز“ ہے اور یہ کاٹنے اور چھیننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کپڑے سیچنے والے کو بھی اسی لئے بزاز کہا جاتا ہے کہ وہ کپڑوں کو کاٹتا ہے۔ ”نحلہ“ یعنی عطیہ اور بخشش۔

حضرت زہراء (ع) خطبے کے پہلے حصے میں فدک کو میراث اور یہاں پر ہبہ و بخشش قرار دیتی ہیں جیسا کہ ہم نے وہاں بھی کہا تھا، ارث سے آپ کا مقصد اصطلاحی ارث نہیں ہے جو کسی کے وفات پانے کے بعد ورثاء کو منتقل ہوتا ہے کیونکہ رسول خدا (س) اپنی زندگی میں ہی فدک، حضرت زہراء (ع) کو بخش چکے تھے اور حضرت فاطمہ (ع) بابا کی حیات کے دوران ہی فدک پر قابض تھیں۔ اگر آپ کا مقصد اصطلاحی ارث ہوتا تو ضروری تھا کہ فدک رسول خدا (س) کی رحلت کے بعد آپ کو ملتا۔ بنا بریں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارث ایک عام تر مفہوم و معنی رکھتا ہے اور والدین کی زندگی میں انسان کو ملنے والی چیزوں پر بھی ارث کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے باپ کی طرح ہوشیار ہو تو کہا جاتا ہے کہ اس کو صلاحیت اور استعداد اپنے باپ سے ارث میں ملی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد اسی کی استعداد اور صلاحیت ترکہ کے عنوان سے اولاد کو منتقل ہو گئی ہو، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کی یہ صلاحیت اور ہوشیاری باپ دادا سے اسے ورثے میں ملی ہے (۱)۔

۱۔ اسی بنا پر رسول خدا اور ائمہ، حضرت آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے وارث ہیں۔ جیسا کہ زیارت ==

”وبلغۃ ابنتی“ ”بلغۃ“ ذریعہ معاش کی معمولی سی چیز کا نام ہے۔ ”ابنتی“ سے امام حسن اور امام حسین علیہما السلام مراد ہیں۔ ممکن ہے ”ابنتی“ فرمایا ہو تو اس صورت میں اسم جنس ہو گا لیکن معنی کے اعتبار سے جمع ہو گا۔ پس ”بلغۃ ابنتی“ یا ”ابنتی“ یعنی میرے بچوں کا معمولی سا ذریعہ معاش۔

بہر صورت حضرت فاطمہ (ع) فرماتی ہیں کہ فدک جو کہ میرے والد گرامی (س) کا عطیہ اور میرے بچوں کے زندگی گزارنے کا معمولی سی ذریعہ تھا ابو بکر نے مجھ سے چھین لیا اور مسلمان خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہے! کسی نے میرے حق کا دفاع نہیں کیا!! (۱)۔

”لقد اجہد فی خصامی“

(بہ تحقیق اس۔ ابو بکر۔ نے میری دشمنی پر کمر باندھ لیا ہے!)
بعض نسخوں میں ”اجھر“ ذکر ہوا ہے یعنی وہ علی الاعلان مجھ سے دشمنی کر رہا ہے۔

”والفیتہ الذی فی کلامی“

(اپنی گفتگو کے دوران میں نے اس کو ضدی اور اپنا سخت ترین دشمن پایا!)
”الذی“ اس دشمن کو کہا جاتا ہے جو دشمنوں میں سب سے زیادہ اور سخت مقابلہ کرتا ہو یعنی جانی دشمن کو ”الذی“ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں بھی ”وہو الذی الخصام (۲)“ اسی معنی میں استعمال

= وارث میں مذکور ہے۔ اور انبیاء کے وارث، علماء ہیں اور اس کے مقابلے میں تاریخ کے فرعون اور نمرود جیسے لوگوں کے وارث معاویہ اور یزید جیسے افراد تھے۔

۱۔ حضرت زہراء کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت کی سادہ زندگی کا ذریعہ معاش صرف فدک تھا اور فدک کی آمدنی کا ایک معمولی حصہ اپنی ضروریات پر خرچ کرتے تھے اور آمدنی کے بہت بڑے حصے کو مسلمانوں کے عمومی مفادات اور ضروریات کو پورا کرنے میں صرف کرتے تھے۔ جیسا کہ غیبت کبریٰ کے دوران مراجع عظام کی روش بھی یہی ہے کہ شرعی رقوم سے انتہائی قناعت کے ساتھ اپنی سادہ زندگی کے مخارج پورے کرتے ہیں اور شرعی رقوم کی بہت بڑی مقدار کو دینی مدارس اور دین کی نشر و اشاعت کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ غصب فدک کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ابو بکر خیال کرتا تھا کہ اس طریقے سے اہل بیت پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے تاکہ اہل بیت اس کی غیر شرعی و غیر قانونی حکومت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں!! جیسا کہ تاریخ کے مختلف دوروں میں حکومتوں نے اس روش سے استفادہ کیا ہے اور بہت ساری شخصیات کو ان کی مدح سرائی اور تائید پر وادار کیا ہے!!!

۲۔ سورۃ بقرہ / ۲۰۴۔

ہوا ہے، یعنی وہ دشمن جو سب سے زیادہ سختی اور مقابلہ کرتا تھا۔

عام لوگوں کی بے توجہی کو مجسم کرنا،

”حتی حبستنی قیلۃ نصرھا“

(انصار نے بھی میری مدد کرنے سے دریغ کیا)

”قیلہ“ ایک عورت کا نام ہے اور اوس و خرنج کے قبائل اسی عورت کی نسل سے تھے۔ یہاں ”قیلہ“ سے مدینہ کے انصار مراد ہیں۔

اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابو بکر کی سختی اور ہٹ دھرمی کی سیاست کی وجہ سے مہاجرین و انصار آپ کی مدد کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ یہ ایک معمولی بات ہے کہ حکومت جب سنگری اور ڈکٹیر شپ کو اپنی روش بنا لیتی ہے تو لوگوں میں یہ جرات نہیں رہتی کہ وہ حکومت کی پالیسی کے خلاف کوئی بات کریں یا حق کی حمایت کریں، چونکہ عموماً ہر شخص اپنی زندگی سے دلچسپی رکھتا ہے اور ماحول کو دیکھتا ہے اور اپنی جگہ پر یہ سوچتا ہے کہ اگر میں کوئی قدم اٹھاؤں تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اسی حوالے سے انصار و مہاجرین بھی سوچتے تھے کہ اتنی ساری فضیلتوں، معاشرے میں اتنے مقام و منزلت اور اپنی عزت و خدمت کے باوجود بھی جب حکومت حضرت زہراء (ع) کا احترام نہیں کرتی اور خود رسول خدا (س) کی بخشی ہوئی زمین کے ایک ٹکڑے کو ان سے چھین لیتی ہے تو دوسروں کی حالت کیا ہوگی؟ ایسے حالات میں فطری طور پر اکثر لوگ خوف و ہراس کا شکار ہو جاتے ہیں اور خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔

”والمہاجرۃ وصلہا“

(اور مہاجرین نے بھی ہمارے ساتھ اپنے دیرینہ روابط سے چشم پوشی اختیار کی!)

اگرچہ مہاجرین ہمارے۔ اہل بیتؑ کے ساتھ دیرینہ روابط اور تعلقات رکھتے تھے، صدر اسلام کی سختیوں میں سب پیغمبر (س) کے ساتھ رہے تھے اور سب نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی لیکن ابو بکر اور اس کے حواریوں کے پروپیگنڈے اور ان کی دشمنی اس بات کا سبب بنی کہ مہاجرین بھی میرے حق

کی حمایت نہ کریں اور خاموش رہیں۔

مختصر بات یہ کہ ابوبکر کے سخت رویے کی وجہ سے مہاجرین اور انصار نے میری مدد نہیں کی۔ جب ابوبکر میری بات ماننے کے بجائے میرا مقابلہ کرنے پر اتر آیا ہے تو لوگ خاموش ہو گئے ہیں۔

حضرت علی (ع) نبج البلاغہ میں فرماتے ہیں کہ: ”وانما الناس مع الملوک والدنیا الامن عصم اللہ (۱)“ (لوگوں کی اکثریت دنیا اور حکمرانوں کے ساتھ رہتی ہے مگر یہ کہ کسی کو خدا بچالے) قوموں کا تاریخی تجربہ بھی اس حقیقت کی بخوبی تائید کرتا ہے۔

ان حالات میں کہ جب حکومت اپنی اصلی شاہراہ سے منحرف ہو چکی تھی جو بھی غاصب حکومت کی حاکمیت کو تسلیم کرتا تھا اسے روٹی اور مقام حاصل ہو جاتا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی کہ انصار کسی مقام و منصب کی لالچ میں خاموش رہیں اور حکومت کی طرف سے ہونے والی بظاہر اسلامی توجہیات سے متاثر ہو جائیں۔ ابوبکر اور اس کے ہمسفر افراد بھی لوگوں کی اس کمزوری سے بخوبی آگاہ تھے اور انہوں نے اپنے سیاسی اقتدار کے استحکام کے لئے اس سے استفادہ کیا۔

”وغضت الجماعة دونی طرفها“

(اور مسجد میں حاضر لوگوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ مجھے نہ دیکھیں !!)

مسجد میں موجود لوگوں کے اس بڑے اجتماع نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ مجھے نہ دیکھیں۔ اور میری مدد نہ کرنے کی شرمندگی سے بچنے کی ناکام کوشش کریں۔ کیونکہ وہ سکون کی زندگی چاہتے تھے اسی لئے انہوں نے چشم پوشی سے کام لیا (۲)۔

”فلا دافع ولا مائع“

(پس نہ کوئی۔ ہمارا۔ دفاع کرنے والا تھا اور نہ ہی۔ ظلم۔ کو روکنے والا)

۱۔ نبج البلاغہ خطبہ ۲۱۰۔

۲۔ بد قسمتی سے مہاجرین اور انصار کی بہت سی شخصیات ایسی تھیں جو مذکورہ حالت کا شکار ہو گئی تھیں۔ اس سے ہم عام لوگوں کی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

”خرجت کاظمۃ وعدت راغمۃ“

(۔ درد دل اور سوز جگر کو سینے کے اندر چھپا کر گھر سے نکلی تھی اور بے کس و متنا اور شکست کھا کر واپس آگئی)
 ”کنظم“ یعنی چھپانا، ڈھانپ دینا۔ ”کنظم غیظ“ کا معنی بھی یہی ہے کہ انسان غصے کو اپنے اندر رکھے اور ظاہر نہ کرے۔

”خرجت کاظمۃ“ یعنی میں اس حالت میں گھر سے خارج ہوئی کہ میں اپنے درد دل اور پریشانی کو چھپائے ہوئے تھی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میرے اوپر جو ظلم و ستم ہوئے اس کی وجہ سے میرا دل دکھ درد اور غم و اندوہ سے بھرا ہوا تھا لیکن یہ احتمال مجھے تسلی دیتا تھا کہ کم از کم ایک آدمی تو میری حمایت کرے گا اور میرے حق کا دفاع کرے گا لیکن وہاں مجمع میں سب خاموش رہے گویا کہ سب مرچکے ہوں!۔

”وعدت راغمۃ“ ”رغم“ یعنی بے کسی، شکست اور خفت، یعنی میں دل شکستہ اور بے یار و مددگار، وہاں سے واپس آئی۔ یہ سارے الفاظ اہل بیت اور حضرت زہراء (ع) کی مظلومیت پر دلالت کرتے ہیں۔ آپؑ پنبیر اسلام (س) کی اکلوتی بیٹی اور یادگار تھیں لیکن اس کے باوجود مسجد میں حاضر لوگوں میں سے کوئی شخص بھی ڈریلاچ کی وجہ سے آپؑ کی حمایت اور مدد کرنے کے لئے تیار نہ تھا! وہ اپنی آنکھوں سے ابو بکر اور اس کے ہمناٹوں کے غیر انسانی مظالم کو دیکھتے رہے اور اہل بیتؑ کی حمایت نہیں کی!۔

جہاد کی سی خاموشی

”اضرعت خدک یوم اضعحت خدک“

(آپؑ نے جس دن تلوار کی دھار کو ضائع کیا اسی دن سے اپنے چہرے کو آپؑ نے خود کمزور اور ضعیف دکھایا ہے)
 آپؑ ایک ایسے مجاہد تھے کہ جس نے جنگی محاذوں پر حق و عدالت کے دشمنوں کو اپنی تلوار کی دھار سے ذلیل و رسوا کیا، لیکن جس دن سے آپؑ نے اپنی تلوار کی نوک کو توڑا اسی دن سے اپنے آپ کو ضعیف کر دیا ہے۔

حضرت علی (ع) کے سکوت کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان داخلی خلفشار اور جنگ کا شکار نہ ہو جائیں اس طرح اسلام جو کہ ایک نو خیز پودے کی حیثیت رکھتا تھا خطرے سے دوچار نہ ہو جائے۔ لہذا حضرت علی (ع) نے اپنے حق سے چشم پوشی کر کے خود کو اسلام پر قربان کر دیا (۱)۔

”ضرع“ یعنی ذلت و رسوائی۔ ”اضرعت“ باب افعال کا فعل ہے اور یہاں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے آپ کو کمزور دکھایا ہے اور دشمن کے سامنے تسلیم ہو گئے ہیں۔

یہ جملات سب کے سب تشبیہ ہیں اور آپؐ کا مقصد یہ ہے کہ جس دن سے آپؐ نے اسلام اور مسلمانوں کے مفادات اور مسلمانوں کی داخلی صفوں میں اتحاد و یکجہتی کے تحفظ کی خاطر تلوار کو نیام میں رکھا ہے اسی دن سے چند مفاد پرست لوگوں نے ان حالات سے غلط فائدہ اٹھایا ہے اور مسند اقتدار پر قبضہ کر کے آپؐ کو خانہ نشین اور بزم غم خود ذلیل کیا ہے۔

”افترست الذناب وافترشت التراب“

(ایک ایسا وقت بھی تھا کہ جب آپؐ کفر و نفاق و شرک کے بھڑیوں کو پھاڑ ڈالتے تھے۔

لیکن آج زمین کو بچھونا بنائے ہوئے ہیں!۔ اور گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔)

”اقراس“ یعنی چیرنا پھاڑنا۔ حیوان مفترس کا مطلب بھی چیرنے پھاڑنے والا حیوان ہے۔ اگر اوپر

۱۔ اس سلسلے میں ”شہید صدر“ اپنی فذک نامی کتاب کے ص ۹۹ پر فرماتے ہیں کہ:

”بعض لوگوں نے حضرت علیؐ سے حکومت وقت کے خلاف قیام کی قیادت کی پیشکش کی لیکن آپؐ نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا کیونکہ آپؐ ان کے عزائم سے آگاہ تھے اور جانتے تھے کہ وہ حق و عدالت کے خواہاں نہیں ہیں بلکہ حضرت علیؐ کو کفر لے کر خود ایمان اقتدار تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت جبکہ اسلامی ریاست بظاہر قوتوں اور شوروں کے زعمے میں بھنسی ہوئی تھی اگر آپؐ خاموشی ختم کر کے قیام فرماتے تو یقیناً معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا اور دنیائے شرک و کفر کے مقابلے میں نو خیز اسلام کو شکست ہوتی اور کفار و معاندین بھی یقیناً جیت جیتے۔ لہذا آپؐ نے اپنے سکوت کو ذریعہ جہاں حکمران طبع کی قانونی حیثیت کو چیلنج فرمایا تو وہاں کفار و معاندین کے ناپاک عزائم بھی خاک میں ملائے۔“

والا جملہ "اقرست الذناب" ہو یعنی "تاہ" پر زبر کے بجائے سکون ہو تو یہ معنی ہو گا کہ "بھڑیے چیر پھاڑ میں مشغول ہیں اور آپ ان کے شر سے انسانیت کو نجات دینے کے بجائے زمین کو بچھونا بنائے ہوئے ہو!"

دوسرے احتمال کے مطابق اس عبارت میں ابو بکر اور اس کے ہم فکر لوگوں کو درندوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور امیر المؤمنینؑ سے مخاطب ہو کر فرماتی ہیں کہ: درندے اپنی درندگی میں مشغول ہیں اور آپ گھر کے کونے میں مٹی کو اپنا فرش بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں!!

حضرت علی (ع) کی مظلومیت اور اسلام کی مصلحت،

"ما کففت قائلًا"

(اور ہرزہ سرانی کرنے والوں کو روکتے نہیں ہوا)

"کف" روکنا، "قائل" بولنے والا، کہنے والا۔

یہاں جس کا جو دل چاہتا ہے کہہ دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کہ گزرتا ہے لیکن آپ کی حالت اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ ان ہرزہ گو انسانوں کو ہرزہ گوئی سے نہیں روک سکتے! ابو بکر آشکارا ہمارے حقوق پر ڈاکہ ڈالتا ہے، من پسند حدیث گھڑ کے پیغمبر اس کی طرف منسوب کرتا ہے وہ غلط تبلیغات اور پروپیگنڈوں کے ذریعے جو چاہے کہہ دیتا ہے لوگوں کو فریب دیتا ہے لیکن آپ کسی قسم کے رد عمل کا اظہار نہیں فرماتے اور سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں!!

"ولا اغنیت طائلًا"

(موجودہ فتنہ و آشوب کو برطرف کرنے کے سلسلے میں کوئی موثر قدم نہیں اٹھا سکے ہوا)

یعنی، اگر لوگوں کے درمیان آپ کی شخصیت محفوظ ہوتی اور آپ کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تو یقیناً آپ کچھ نہ کچھ کر گزرتے، کوئی بات کرتے یا کوئی قدم اٹھاتے اور حکمران ٹولہ بھی خوفزدہ ہو جاتا اور پیچھے ہٹ جاتا، لیکن آپ پر ایک ایسی حالت مسلط کر دی گئی ہے کہ جس کی وجہ سے آپ ہاتھ پر ہاتھ

دھرے خانہ نشینی کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے اور ہر قسم کے قیام اور حرکت کو اسلام کی مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

دوسرے بعض نسخوں میں ”ولا اغنیٰ باطلا“ ذکر ہوا ہے۔ یعنی آپؐ نے کسی باطل کو ختم نہیں کیا۔ یہاں باطل سے مراد ابوبکر کی غاصب حکومت ہے۔ البتہ اس سارے درد دل کا جواب اور امیر المؤمنینؑ کا عذر یہ تھا کہ اصل اسلام محفوظ رہے اور مسلمان آپس میں متحد رہیں اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے کہیں خود اسلام خطرے میں نہ پڑ جائے۔

”ولا خیاری“

(حالانکہ میرے بس میں کچھ بھی نہیں)

یعنی میں کچھ نہیں کر سکتی ہوں۔ یہاں حضرت زہراء (ع) کا مقصد۔ العیاذ باللہ۔ امیر المؤمنینؑ پر اعتراض نہیں بلکہ اس حالت کا بیان ہے کہ جس سے امیر المؤمنینؑ دوچار تھے۔ گویا آپؐ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ: آخر۔ راتوں رات۔ حالات اس قدر کیوں بدل جائیں کہ آپؐ جیسی عظیم شخصیت بھی کچھ نہ کر سکے اور اپنے مسلم حق اور رسول خدا (ص) کی اکلوتی بیٹی کے حق سے دفاع نہ کر سکے؟ حالانکہ آپؐ نے ڈرنے والے ہیں اور نہ جھسکنے والے اور نہ ہی ظلم و ظالم کے ساتھ مبارزہ میں کمزوری کی وجہ سے فرار کرنے والے!!

”لیتنی مت قبل هینتی“

(اے کاش اس گوشہ نشینی اور حمود سے قبل میں مر چکی ہوتی)

”ہینہ“ یعنی نرمی اور سکون۔ یعنی موجودہ صورتحال کے مطابق مجھے بھی گوشہ نشینی اور حمود اختیار کرنا پڑے گا۔ اے کاش کہ میں ایسی حالت سے قبل اس دنیا سے جا چکی ہوتی تاکہ ایسی صورتحال کو تحمل کرنے پر مجبور نہ ہوتی۔

”ودون ذلتی“

(اور۔ ظاہری طور پر۔ ایسی ذلت کی حالت سے دوچار ہونے سے قبل مر جاتی)

اس کے بعد آپؐ اپنی گفتگو کے رخ کو بدلتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

”عذیری اللہ منک عادیا ومنک حامیا“

(خداوند میرا عذر قبول کرے گا، میرے اوپر ہونے والے مظالم کو آپؐ دفع کرتے رہے اور میری حمایت کرتے رہے) ”عذیر، عاذر“ کے معنی میں ہے، یعنی عذر قبول کرنے والا۔ ”عذیری اللہ“ یعنی میری عذر قبول کرنے والا خدا ہی ہے۔ نحوی ترکیب کے لحاظ سے ”عذیری“ مبتداء ہے اور ”اللہ“ اس کی خبر جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے احتمال دیا ہے کہ شاید اس حملے سے، حضرت علیؑ سے عذر خواہی مقصود ہو۔ یعنی حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: یا علیؑ۔ اگرچہ میرے اوپر ہونے والے مظالم کے سلسلے میں۔ آپؐ نے ہمیشہ میرا دفاع اور میری حمایت کی ہے اگر۔ اس درد دل کے دوران۔ کوئی جسارت ہوئی ہو تو امید ہے کہ خداوند مجھے بخشے گا۔

البتہ ”عذیر“ مددگار اور دوست کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ممکن ہے حملے کا مفہوم یہ ہو کہ: آپؐ کی حمایت اور دفاع کے بجائے خدا میرا حامی اور دفاع کرنے والا ہے (۱)۔

اہل بیت (ع) کی مظلومیت اور بے کسی کی انتہاء،

حضرت زہراء (ع) اہل بیتؑ پر آنے والی مصیبتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

”ویلای فی کل شارق، ویلای فی کل غارب“

(مجھ پر دوائے ہو ہر صبح۔ طلوع آفتاب کے وقت۔ دوائے ہو مجھ پر ہر شب۔ غروب کے وقت۔)

”ویل“ افسوس کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور آہ و زاری اور مدد چاہنے کے وقت الف کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور آخری یا، متکلم کی علامت ہے۔

”شارق“ یعنی طلوع آفتاب کا وقت اور ”غارب“ یعنی سورج کے غروب ہونے کا وقت۔

۱۔ ممکن ہے یہ دعائیہ جملہ ہو کہ ”خداوند اے تو ہی میرا حامی اور مددگار ہے۔ لہذا میں اپنے اوپر ہونے والے ظلم و ستم کے مقابلے میں تجھ سے دفاع اور حمایت کی طلب گار ہوں اور تجھ سے ہی حمایت اور انتقام کی امید رکھتی ہوں۔“

علامہ مجلسیؒ نے ”ویلائی“ کے مثنوی ہونے کا احتمال دیا ہے یعنی میرے اوپر دو بار وائے ہو اور یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔ لہذا ”ویلائی“۔ مثنوی کی شکل میں۔ ذکر فرمانے کا مقصد، مسئلے کی اہمیت کو تاکید کے ساتھ بیان کرنا ہے۔

یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ یہ حملے اور تعبیریں، اہل بیتؑ کی انتہائی مظلومیت اور بے بسی کو بیان کرتی ہیں کہ ابھی آنحضرت (س) کی رحلت کو چند دن بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ آپ (س) کی عزت اور یادگار نیز خلیفہ برحق پر اس قدر ظلم و ستم روا رکھا جاتا ہے کہ حضرت زہراء (ع)۔ جیسی صبر و استقامت کا بے مثال نمونہ بھی۔ ٹپ کر حضرت علیؑ کے حضور اپنے سوز و گداز اور درد دل کا اظہار فرماتی ہیں۔

”مات العمد ووهن العضد“

(۔ ہماری۔ تکیہ گاہ اور بھروسے کا مقام۔ آنحضرت (ع)۔ چل بے اور۔ ہمارے۔ بازو کمزور ہو گئے) ”عمد“ یعنی تکیہ گاہ۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ تن کی عبارت میں۔ عمد کے بجائے۔ ”عمد“ صحیح ہے کیونکہ ”عمد، عمود“ کی جمع ہے کہ جس کا معنی پشت پناہ ہے۔ ”عضد“ یعنی بازو اور یہ طاقت اور توانائی کی طرف اشارہ ہے۔

آپؑ یہ فرماتی ہیں کہ: میرے والد بزرگوار جو ہماری طاقت کا سرچشمہ اور ہمارے پشت پناہ تھے اس دنیا سے چلے گئے لہذا ہم کمزور اور ناتوان ہو گئے ہیں (۱)۔

بابا کے حضور شکایت اور بارگاہ خداوندی میں مناجات،

”شکواى الى ابي وعدواى الى ربى“

(میں اپنی شکایت کو بابا کے حضور اور مظالم کو پردرد گار کی بارگاہ میں عرض کر دوں گی)

”شکوا“ اور ”عدوا“ کے معنی ہیں شکایت کرنا اور جس کے پاس جا کر شکایت کی جاتی ہے اسے

۱۔ ممکن ہے ”وهن العضد“ سے مراد یہ ہو کہ معاشرے میں حضرت علیؑ کی حیثیت اور شخصیت کمزور ہوئی ہے۔

”عدوا“ کہتے ہیں کیونکہ ہونے والے مظالم اور تجاوزات کو اسی کے پاس لے جاتے ہیں۔

”اللہم انت اشد منہم قوۃ و حولاً“

(پروردگارا!)

طاقت اور قدرت کے اعتبار سے ان۔ فدک اور خلافت کے غاصبین۔ کے مقابلے میں۔ تو زیادہ طاقتور اور قوی تر ہے (یعنی خداوند!) یہ لوگ طاقت کے بل بوتے پر جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں، لیکن تیری طاقت ہر طاقت سے بالاتر ہے، لہذا تو خود ان کا حساب لے اور ان کو قرار واقعی سزا دے۔

”واشد باساً و تنکیلاً“

(اور تیرا عذاب اور انتقام ہر چیز سے شدید تر اور سخت تر ہے)

”باس“ یعنی عذاب۔ ”تنکیل“ یعنی سزا۔ یعنی خداوند! تو ہی ان کو اپنے دردناک عذاب میں مبتلا کر کے سزا دے۔

حضرت علی (ع) کا حضرت زہراء (ع) کو تسلی دینا۔

”فقال امیر المؤمنین (ع)“

لاویل لك، بل الویل لسانك“

(پھر امیر المؤمنین (ع) نے۔ حضرت فاطمہ (ع) سے مخاطب ہو کر فرمایا،

۔ اے دختر رسول۔

آپؑ پر دوائے نہیں بلکہ دوائے۔ اور ویل۔ ان لوگوں پر ہے جو آپؑ سے بغض رکھتے ہیں اور آپؑ کے دشمن ہیں) ”ویل“ کا اصل معنی عذاب اور عقاب ہے اس کا ”ویج“ سے ربط نہیں کیونکہ ”ویج“ کا لفظ دلسوزی کے مواقع پر بولا جاتا ہے، چونکہ یہاں حضرت زہراء (ع) نے فرمایا کہ: مجھ پر دوائے ہو صبح اور شام کے وقت تو امیر المؤمنین (ع) فرماتے ہیں کہ:۔ اے دختر رسول (م)! آپؑ پر دوائے اور افسوس نہیں بلکہ آپؑ کے دشمنوں اور آپؑ پر ظلم کرنے والوں پر ”ویل“ دوائے ہو۔ آپؑ رسول خدا (م) کی بیٹی

ہیں آپ خدا کے نیک اور صالح بندوں میں سے ہیں، لہذا آپ پر "ویل" کیوں ہو؟
 "بل الویل لسانک" بلکہ دوائے اور "ویل" ان لوگوں پر ہو جو آپ سے بغض رکھتے ہیں اور آپ کے دشمن ہیں۔ "شانی" اس شخص کو کہا جاتا ہے جو بغض اور دشمنی رکھتا ہو۔

"ثم نهنسى عن وجدك"

(خود کو اس پریشان کن اور سخت حالت سے دور رکھیں)

"وجد" یعنی غیظ و غضب۔ "نہنسى" نہتہ سے فعل امر کا واحد مؤنث مخاطب کا صیغہ ہے اور دور رکھنے اور روکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اپنے غیظ و غضب کو قابو میں رکھیں۔

"يا ابنة الصفوة وبقية النبوة"

(اے خدا کے برگزیدہ بندے کی بیٹی اور اے یادگار نبوت۔ پیغمبر خدا (ص)۔)

"فما ونيت عن ديني"

(پس میں اپنے دین کے بارے میں ہرگز سست اور ناتواں نہیں ہوا ہوں)

"وئی" ضعف اور سستی کے معنی میں ہے۔ امیر المؤمنین (ع) یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ میں اپنے دین پر عمل کرنے کے لحاظ سے ہرگز ضعیف اور سست نہیں ہوا ہوں اور جو میری توان میں تھا میں نے انجام دیا ہے۔

حضرت علیؑ اس سے زیادہ اقدام نہیں کر سکتے تھے اور اس بارے میں سختی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ دوسرے مسائل کو بھی مد نظر رکھتے تھے۔ اگر اوائل اسلام میں سختی اور شہامت کے ساتھ مقابلہ فرماتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت اسلام کا فائدہ اسی میں تھا لیکن ابھی دین کی مصلحت اس میں ہے کہ آپؑ خاموش رہیں۔ اسی لئے آپؑ حضرت زہراء (ع) کے جواب میں فرماتے ہیں کہ اگر آپؑ دیکھ رہی ہیں کہ میں خاموش ہوں اور کوئی رد عمل نہیں کر رہا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں اپنے دین کے بارے میں سست یا کمزور ہو چکا ہوں۔

"ولا اخطات مقدوری"

(میں نے اپنی طاقت اور توانائی کے اندر رہتے ہوئے کوئی غلطی نہیں کی ہے)
یعنی اپنی طاقت کے مطابق شرعی ذمہ داری ادا کر دی ہے۔ اور اس میں لیت و لعل سے کام نہیں لیا ہے۔

”فان كنت تريد ان تبلغه، فزك مضمون وكفيلك مامون“
(اگر آپ کا مقصد ضروریات زندگی ہیں تو آپ کی روزی کی ضمانت دی گئی ہے
اور آپ کا کفیل۔ خدا۔ قابل اعتماد ہے)

یعنی خداوند اپنے بندوں کی ضروریات کا ضامن اور ذمہ دار ہے اس میں کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں (۱)۔

۱۔ اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ فدک کے مسئلے میں حضرت فاطمہؑ کا بنیادی مقصد، مسئلہ امامت کا دفاع تھا۔ حضرت علیؑ کے اس جملہ کو ذیل کے دو طریقوں میں سے ایک کھینچ لیجئے۔ توجیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ وہیں تقیہ کرنے کی ضرورت تھی اور حضرت علیؑ چاہتے تھے کہ حضرت زہراءؑ کا بنیادی مقصد آشکار نہ ہو جائے تاکہ اہل بیتؑ کو درپیش خطرات سے محفوظ رکھا جائے۔

۲۔ یا یہ کہیں کہ ”رزق اور بلغہ“ سے مراد اہل بیتؑ کی روزمرہ کی مادی ضروریات نہیں بلکہ معاشی ضروریات کے علاوہ سیاسی، معاشرتی... غرض تمام زندگی کے تمام شعبوں کی ضروریات مراد ہیں، کیونکہ اس قسم کی ضروریات کسی بھی صورت میں اہل بیتؑ کی خوراک و پوشاک کی ضرورتوں سے کمتر نہیں ہیں۔
یہاں پر چند نکات ایسے ہیں جو تقیہ والے احتمال کی تائید کرتے ہیں۔

۱۔ حضرت علیؑ سے بیعت لینے کے واقعہ میں عمر نے یہ دھمکی دی کہ اگر حضرت علیؑ بیعت نہ کریں تو گھر کو گھردالوں سمیت، اگرچہ ان میں فاطمہؑ ہی کیوں نہ ہو، جلادیں گے۔ اس واقعہ سے ہم حکومت کی طرف سے حضرت زہراءؑ کو درپیش خطرات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ (فدک ص ۶۹ تالیف: شہید باقر الصدر)۔

۲۔ مسجد میں حضرت زہراءؑ کے خطبہ کے تمام ہونے کے بعد ابو بکر نے ایک گفتگو کے ضمن میں کہا کہ: ”اس فتنے کی اصل جڑ، عسلی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ حالات پہلے کی طرح ہو جائیں...“ (بحار الانوار۔ طبع قدیم۔ ج ۸ بہ نقل از ابن ابی الحدید)۔ ابو بکر کی ان باتوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے یا اس کی رہبری کرنے میں آپؑ پر شدید الزام تھا اس طرح آپؑ بھی خطرے سے دوچار تھے۔

۳۔ مندرجہ بالا مآخذ میں یہ بھی مذکور ہے کہ، مسجد میں حضرت زہراءؑ کے خطاب کے نتیجے میں بعض لوگوں کے جذبات بھڑک اٹھے اور انہوں نے حضرت علیؑ کے حق میں نعرے لگائے جس پر ابو بکر نے فوراً انہیں دھمکی دی اور انہیں ”سفہاء“ یعنی احمق سے تعبیر =

”وما عذ لك افضل مما قطع عنك“

(اور جو کچھ خدا نے آپ کے لئے آمادہ کیا ہوا ہے

وہ اس چیز کے مقابلے میں بدرجہا بہتر ہے جو آپ سے چھین لیا گیا ہے)

”فاحتسبى الله“

(پس اے خدا کے حوالے کر دیں)

یہاں حضرت علیؑ، حضرت زہراءؑ کو۔ آخرت کے معنوی مقامات کی یاد دلاتے ہیں جو خداوند

متعال نے اپنے اولیاء صالح، فداکار، صابر اور بردبار بندوں کے لئے آمادہ فرمائے ہیں۔ اس طرح آپؑ دخت رسول (اس) کو تسلی دیتے ہیں۔

”فقلت (ع) حسبى الله ونعم الوكيل“

(پھر حضرت زہراء (ع) نے فرمایا کہ:۔ دراصل۔ خدا ہی میرے لئے کافی ہے اور وہی بہترین دفاع کرنے والا ہے)

”وامسكت“

(اور آپ (ع) خاموش ہو گئیں)

حضرت علی (ع) کے حضور حضرت زہراء (ع) کے درد دل کا ایک تجزیہ،

حضرت زہراء (ع) کا خطبہ یہاں اپنے اختتام کو پہنچتا ہے البتہ ایک نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے

== کہتے ہوئے کہنے لگا کہ، ”یہ الحق لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟“ میں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ خیر معمولی حالات میں زندگی گزار رہے تھے اور آپؑ پر حکومت کی کڑی نظر تھی۔

اس طرح حالات کی نزاکت کا یہ تقاضا تھا کہ اہل بیتؑ کا بنیادی مقصد اور مبارزہ کا طریق کار حکومت کی نگاہوں سے مخفی ہی رہے۔ ممکن ہے یہ مراد ہو کہ اگر آپؑ فدک اور ظاہری خلافت کے خواہاں ہیں تو ان کے چہن چاہنے پر غمگین نہ ہوں کیونکہ ہماری مادی و معنوی ضروریات کو پورا کرنے والا خدا ہے اور واقعی امامت اور خلافت حقہ تو کوئی چھین ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کی تو خدا نے ضمانت دی ہوئی ہے۔۔۔

اور وہ اس خطبے سے مربوط دو اعتراض اور ان کے جواب ہیں۔ علامہ مجلسیؒ بحار الانوار میں (۱۱) فرماتے ہیں کہ: بعض لوگ۔ اس خطبے پر۔ دو اشکال کرتے ہیں:

پہلا اشکال: حضرت فاطمہ (ع) معصوم تھیں اس کے باوجود کس طرح آپؑ نے حضرت علیؑ سے ہندی اور تلخی کے ساتھ بات کی؟ کیا امیر المؤمنینؑ امام اور ولی امر نہیں تھے؟ امام کے ساتھ تو اس طرح کی تلخ کلامی نہیں کی جاسکتی ہے!

علامہ مجلسیؒ اس اشکال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

حضرت زہراءؑ کا مقصد یہ تھا کہ خلافت کرنے والوں کے غلط کاموں کو مجسم کریں اور۔ لوگوں کو۔ یہ سمجھائیں کہ وہ کس قسم کے عظیم جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں؟ دراصل اسی مصلحت کے پیش نظر آپؑ نے تلخی کلامی سے کام لیا تھا، کیونکہ جب انسان کسی حادثہ کی گہرائی اور اہمیت کو بیان کرنا چاہتا ہے تو عتاب آمیز کلمات کے ذریعے خطاب کرتا ہے، حالانکہ اس کا مقصد اپنے مخاطب کے ساتھ سختی اور تلخی سے پیش آنا نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف حادثہ کی اہمیت اور فاجعہ کی گہرائی کو سمجھانا ہوتا ہے۔ اور یہ طریقہ بھی باہمی گفتگو اور افہام و تفہیم کی ایک روش ہے۔ آئیے بطور مثال فرض کرتے ہیں کہ: کسی مملکت کا بادشاہ یا حاکم جب دیکھتا ہے کہ اس ملک کے تاجروں نے کوئی بڑی غلطی کی ہے تو وہ وزیر تجارت کو سختی سے ڈانٹ دیتا ہے اور اس کو تنبیہ کرتا ہے حالانکہ حاکم جانتا ہے کہ اس بارے میں وزیر تجارت بے قصور ہے، لیکن بادشاہ یا حاکم اپنے اس عقاب اور سرزنش کے ذریعے یہ چاہتا ہے کہ تاجروں کے غلط کام کی اہمیت اور اس کی قباحت کو مجسم کرے۔

دوسرا نمونہ یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ کوہ طور سے واپس آئے تو دیکھا کہ بنی اسرائیل گوسالہ پرست ہو چکے ہیں، تو آپؑ نے حضرت ہارونؑ کو عتاب کا نشانہ بنایا اور ان کی سرزنش کی اور ہارونؑ کی داڑھی پکڑ کر ان سے پوچھا کہ یہ آپؑ نے کیا کیا ہے؟

حضرت ہارونؑ نے جواب دیا کہ: ”یا بنی امی لا تاخذ بلحیتی ولا براسی... (۱۱)“ (اے میری ماں

کے بیٹے! میری داڑھی اور سر کو مت پکڑ میں تو اس بات سے ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف کیوں ڈالا ہے؟...

حضرت موسیٰ جانتے تھے کہ حضرت ہارون کی کوئی غلطی نہیں تھی لیکن چونکہ آپ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی زشتی اور برائی کو مجسم کرنا چاہتے تھے اور اس کی قباحت سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے خواہاں تھے تو اس لئے بظاہر آپ نے اپنے بھائی ہارون سے تلخ کلامی کی۔

یہاں بھی حضرت زہراءؑ چاہتی تھیں کہ ظالمین کے ظلم و ستم کی گہرائی اور قباحت کو مجسم کریں لہذا اس انداز میں گفتگو کی کہ اس دور کے لوگوں اور تاریخ کو یہ سمجھا دیں کہ اہل بیتؑ پر کس قسم کے عظیم مظالم ڈھائے گئے ہیں۔

یہ تھا پہلا سوال اور علامہ مجلسیؒ کا جواب۔

فدک کے بارے میں حضرت زہراء (ع) کے اصرار کا فلسفہ،

دوسرا اعتراض: ممکن ہے بعض لوگ یہ اعتراض کریں کہ فدک ایک معاشی مسئلہ تھا اس کی خاطر حضرت زہراءؑ نے آخر کیوں اتنی معرکہ آرائی کی؟ اور اس مخصوص حالت میں مسجد تشریف لے گئیں؟ اور وہاں وہ آتشیں خطبہ ارشاد فرمایا؟ کیا حضرت زہراءؑ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ہر شخص کی روزی خدا دیتا ہے اور وہ تمام انسانوں کا رازق ہے؟

دوسری طرف سے آپؑ زہد اور دنیا سے بے توجہی کے لحاظ سے بھی شہرت رکھتی تھیں، تو مال سے مربوط ایک مسئلے میں اس قدر سختی کا کیوں مظاہرہ فرمایا؟

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ: پہلی بات تو یہ ہے کہ فدک اگرچہ بظاہر حضرت زہراءؑ کے اختیار میں تھا لیکن دراصل یہ تمام اہل بیتؑ سے مربوط تھا، دوسرے لفظوں میں یہ کہ فدک حضرت زہراءؑ کو بچنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علیؑ اور امامت کا گھرانہ مالی اعتبار سے بے نیاز ہو جائے، جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا کہ فدک کا امامت و خلافت اور پیغمبر (س) کے بعد آپ (س) کے برحق جانشین اور وصی کے

ساتھ گہرا ربط تھا، لہذا آپؐ اپنے اس موقف اور جدوجہد کے ذریعے یہ بیان کرنا چاہتی تھیں کہ تم نے امامت اور خلافت کو کیوں غضب کیا؟۔ خلاصہ: یہ ایک صرف مالی مسئلہ نہیں تھا بلکہ فدک، پیغمبر (ص) کی خلافت حق کی علامت تھی، لہذا غضب فدک پر اعتراض دراصل خلافت کے غضب پر اعتراض تھا اور آپؐ کا مقصد بھی غضب خلافت پر اعتراض کرنا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس خطبے کے ارشاد فرمانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ: آپؐ مسلمانوں پر اتمام حجت کرنا چاہتی تھیں۔ کیونکہ اعتراض نہ کرنے کی صورت میں فدک اور خلافت کے مسئلے میں ابوبکر کی خیانت کا کسی کو پتہ بھی نہ چلتا اور سب یہی سوچتے کہ ابوبکر اور اس کی تمام کارروائی حق پر مبنی ہے اور لوگ یہ سمجھتے کہ اگر وہ غلط ہوتے تو کم از کم دختر رسول خدا (ص) اس پر اور مسلمانوں کے اس کے ساتھ ہو جانے پر اعتراض فرماتیں، لہذا آپؐ مسجد میں تشریف لے گئیں اور خطبہ پڑھا تا کہ اتمام حجت ہو جائے۔ اسی لئے آپؐ نے اپنے خطبے کے دوران فرمایا کہ: میں جانتی ہوں کہ تم دنیا کے دلدادہ بن گئے ہو اور عہد شکنی تمہاری رگوں میں سرایت کر چکی ہے لیکن میں یہ خطبہ صرف اس لئے پڑھ رہی ہوں کہ اپنے دل کے سوز اور درد کا اظہار کر سکوں "ولكنها فيضة النفس" اور یہ کہ تم پر اتمام حجت کروں۔ پس آپؐ کا مقصد۔ مال دنیا کی لالچ نہیں بلکہ۔ اتمام حجت تھا۔

تیسری بات کہ جو بنیادی نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ آپؐ اپنے اس خطاب کے ذریعے اہل بیتؑ کی مظلومیت اور غاصبین حکومت کے ظلم و ستم کو ثابت کرنا چاہتی تھیں اگر آپؐ خاموش رہتیں تو لوگوں کو کیا معلوم کہ اہل بیتؑ پر کیا ہوتی ہے اور ان پر کتنے عظیم مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ آپؐ کا یہ خطاب اہل بیتؑ کی مظلومیت پر ایک زندہ شاہد ہے اور یہ تاریخ کے ہر دور میں اس زمانے کے غاصب حکمرانوں کے مظالم۔ اور بکریوں۔ پر گواہی دیتا ہے نیز بعد میں آنے والی نسلیں اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہوئیں کہ مہاجرین اور انصار کی اکثریت کس قدر غیرت سے عاری تھی جو اپنی آنکھوں سے مظالم کو دیکھتی رہی لیکن۔ مجسموں کی طرح۔ سب خاموش تماشائی بنے رہے۔ اپنے پیغمبر (ص) کے اہل بیتؑ کی حرمت اور حقوق سے معمولی سا دفاع بھی نہیں کیا!

ایک عرب شاعر کی زبانی، انصار اور مہاجرین کے سکوت کی تصویر کشی۔
یہاں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس عرب شاعر کے اشعار سے چند بیت یہاں ذکر کروں، کہ جو اس نے
انصار اور مہاجرین کو مخاطب کر کے کہے ہیں، وہ کہتا ہے:

”تم پیغمبر خدا (س) کی نہیں بلکہ ابوبکر کی امت ہو اور تمہاری یہ بات کہ ہم محمد مصطفیٰ (س) کی
امت ہیں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ جب پیغمبر (س) کی بیٹی تمہارے پاس آئی اور
اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے سلسلے میں تم سے شکایت کی اور مدد چاہی تو تم نے بے توجہی سے کام لیا
اور خاموشی اختیار کی لیکن جب ابوبکر کی بیٹی (عائشہ) نے تم سے مدد چاہی تاکہ علیؑ کے خلاف جنگ
لڑے تو تم بڑے شوق سے اس کی مدد کے لئے آگے بڑھے اور یہ کہنے لگے کہ کیا ممکن ہے کہ خلیفہ کی بیٹی
جھوٹ بولے یا اشتباہ کرے؟! پس یہ حقائق بتاتے ہیں کہ تم محمد (س) کی امت نہیں ہو بلکہ ابوبکر کے
پیروکار اور اس کی امت ہو!۔

”ما المسلمون بامۃ لمحمد کلاً ولكن امة لعتيق“

(مسلمان۔ تم۔ محمد (س) کی امت ہرگز نہیں ہو بلکہ تم عتیق کی امت ہو)

”عتیق“ یعنی آزاد شدہ غلام، یہ ابوبکر کے القاب میں سے ایک ہے۔

”جاءتہم الزہراء تطلب ارثہا فتقاعدوا عنہا بكل طریق“

(حضرت زہراءؑ اپنا ارث مانگنے کے لئے ان کے پاس آئیں تو سب نے بے توجہی کی اور مختلف بہانوں کے ذریعے

آپؑ کی مدد کرنے سے انکار کر دیا)

”وتواثبوا القتال آل محمد لعادعتہم ابنة الصديق“

(لیکن یہی لوگ آل محمد (س) سے لڑنے کے لئے ٹوٹ پڑے جب ان کو۔ ابوبکر۔ صدیق کی بیٹی نے بلایا)

”صدیق“ بھی ابوبکر کا ایک لقب ہے۔

”فعودہم عن ہذا و قیامہم مع ہذا تغنی عن التحقیق“

(پس حضرت زہراءؑ سے ان کی بے اعتنائی اور عائشہ کے ساتھ ان کا تعاون، ان کے ماضی۔ اور ماضی الضمیر اور افکار

ونظریات۔ کے بارے میں تحقیق کرنے سے بے نیاز کرتا ہے)

یعنی پنغیر (س) کی وفات کے بعد کے مسلمان بلاوجہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے بلکہ وہ علی طور پر پنغیر (س) کی امت ہونے کی بجائے ابوبکر کی امت بن چکے تھے۔ دلیل کے لئے یہی کافی ہے کہ انہوں نے حضرت زہراءؑ سے بے اعتنائی کی جبکہ عائشہ نے جب حضرت علیؑ کے خلاف لشکر کشی کی دعوت دی تو اسے لبیک کہا !! صرف یہی نہیں بلکہ امیر المؤمنینؑ کے بعد عائشہ کی پیروی اور اس کی سرکردگی میں فرزند رسول (س) امام حسن مجتبیٰ کے جنازہ پر تیروں کی بارش برساتی !!!۔

پس ان حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ ہم رسول خدا (س) کی امت ہیں جھوٹ کے سوا کچھ نہیں بلکہ تم ابوبکر کی امت ہو اور دنیا اور اس کے مقام اور ثروت کے غلام ہو۔

اللہم العن اول ظالم ظلم حق محمد وآل محمد (ص) وآخر تابع له علی ذلک

پروردگارا !

جنہوں نے سب سے پہلے محمد دآل محمد (ص) پر ظلم کیا

اور

جنہوں نے اس ظلم میں ان کی پیروی کی

ان سب پر

اپنا قہر و غضب نازل فرما

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

حصہ دوم:

② بستر شہادت پر

انصار و مہاجرین کی عورتوں سے

حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام کا خطاب

تیرھواں درس

- ✽ خطبے کی سند
- ✽ انصار اور مہاجرین کی عورتوں کا حضرت زہراء (ع) کی عیادت کرنا
- ✽ لوگوں کی بے وفائی کی ایک جھلک
- ✽ مذہب اور سیاست کے کھلاڑی
- ✽ فکری کمزوری اور آراء کا اختلاف
- ✽ حکومت کی بدعنوانی کے مقابلے میں عوام کی ذمہ داری
- ✽ شاہراہ امامت سے انحراف کا آغاز
- ✽ اصحاب سقیفہ کے سیاسی مقاصد

وَقَالَ سُوَيْدُ بْنُ غَفْلَةَ: لَمَّا مَرَضَتْ فَاطِمَةُ عليها السلام، الْمَرَضَةُ الَّتِي تُوفِّيَتْ فِيهَا،
اجْتَمَعَتْ إِلَيْهَا نِسَاءُ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ لِيَعْدَنَهَا؛ فَقُلْنَ لَهَا: كَيْفَ أَصْبَحْتَ مِنْ
حِلَّتِكَ يَا ابْنَةَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ؟ فَحَمَدَتْ اللَّهَ وَصَلَّتْ عَلَى أَبِيهَا ﷺ، ثُمَّ قَالَتْ:
أَصْبَحْتُ وَاللَّهِ عَائِفَةً لِدُنْيَاكَ، قَالِيَةً لِرِجَالِكُنَّ، لَفَظَتْهُمْ بَعْدَ أَنْ عَجَمْتُهُمْ،
وَسَنَأْتُهُمْ بَعْدَ أَنْ سَبَرْتُهُمْ؛ فَقُبْحًا لِقَوْلِ الْحَدِّ، وَاللُّغْبِ بَعْدَ الْجَدِّ، وَقَرَعَ الصَّفَاةَ
وَصَدَعَ الْقَنَافَةَ، وَخَتَلَ الْأَرَاءَ وَزَلَلَ الْأَهْوَاءَ؛ وَبَشَسَ مَا قَدِمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ: أَنْ
سَخِطَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُونَ؛ لَأَجْرِمَ لَقَدْ قَلَدْتُهُمْ رَبَقَتَهَا، وَحَمَلْتُهُمْ
أَوْقَتَهَا، وَشَنَنْتُ عَلَيْهِمْ غَارَاتِهَا؛ فَجَذَعًا وَعَقْرًا وَبُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ.
وَيُنَحِّهِمْ أَنِّي زَعَزَعُوهَا عَنْ رَوَاسِي الرُّسَالَةِ، وَقَوَاعِدِ النُّبُوَّةِ وَالِدَّلَالَةِ، وَ
مَهَبِطِ الرُّوحِ الْأَمِينِ، وَالطُّبِينِ بِأُمُورِ الدُّنْيَا وَالْدِّينِ؟ أَلَا ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ
الْمُبِينُ؟

وَمَا الَّذِي نَقَمُوا مِنْ أَبِي الْحَسَنِ عليه السلام؟! نَقَمُوا وَاللَّهِ مِنْهُ نَكِيرَ سَيْفِهِ، وَقَلَّةَ
مُبَالَاتِهِ لِحَتْفِهِ، وَشِدَّةَ وَطْأَتِهِ، وَنِكَالَ وَقْعَتِهِ، وَتَنْمُرِهِ فِي ذَاتِ اللَّهِ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

جیسا کہ تاریخ اور روایات کی کتابوں میں مذکور ہے، رسول خدا (س) کی رحلت کے بعد، حضرت زہراءؑ نے دو خطبے ارشاد فرمائے۔ ایک خطبہ مسجد النبی (س) میں اور دوسرا خطبہ بستر شہادت پر جب انصار اور مہاجرین کی عورتیں آپؑ کی عیادت کے لئے آئی تھیں۔

گزشتہ دروس میں ہم نے پہلے خطبہ کو جو ذرا مفصل بھی تھا پڑھا جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا مقصد آپؑ کے کلمات اور جملوں کی مکمل تشریح نہیں بلکہ صرف مختصر سی وضاحت کرنا مقصود ہے وہ بھی اس طرح کہ ہر سطح کے قارئین حضرات اس سے استفادہ کر سکیں اور ہم بھی ان کے نورانی الفاظ سے فیض حاصل کر سکیں۔

خطبے کی سند:

آپؑ کے اس دوسرے خطبے کو جسے ہم نے ابھی شروع کیا ہے۔ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار کی جلد ۲۳ ص ۱۵۹ میں حضرت زہراءؑ کے حالات زندگی کے حصے میں ذکر فرمایا ہے، اگرچہ یہ خطبہ دوسری کتابوں میں بھی نقل ہوا ہے لیکن ہم اسے "احتجاج طبرسی" سے نقل کر رہے ہیں (۱)۔

۱۔ کتاب احتجاج کے علاوہ شرح ابن ابی الحدید ج ۱۲ ص ۲۳۳ نے "سفینہ وفدک" نامی کتاب سے اپنی سند کے ساتھ اور =

اس خطبے کا راوی "سويد بن غفلة" ہے (۱) بعض نے اس کا نام "سويد بن غفلة" کہا ہے لیکن شیعہ اور سنی، علم رجال کے مشہور ماہرین نے "سويد بن غفلة" ہی ذکر کیا ہے۔ یہ شخص ایک نیک انسان تھا پٹنیر (م) کی زندگی میں مسلمان ہوا لیکن اسے مدینہ آکر آپ (م) کی زیارت کرنے کا شرف حاصل نہ ہوا۔

اب اگر کسی فرد کے صحابی ہونے کا معیار یہ ہوا کہ وہ اپنی آنکھوں سے آنحضرت (م) کی زیارت کرے تو "سويد بن غفلة" صحابی نہیں کہلائے گا، لیکن اگر صحابی کا معیار یہ ہو کہ آنحضرت (م) کی زندگی میں اسلام قبول کرے تو یہ شخص رسول خدا (م) کے اصحاب میں شمار ہوگا۔ بہر حال "سويد بن غفلة" ایک مخلص مسلمان تھا۔ سن ۸۵ ہجری کے قریب وفات پائی وہ طویل العمر انسان تھا۔ بعض نے اس کی عمر ۱۳۰ سال اور بعض نے ۱۱۰ سال ذکر کی ہے۔ بہر صورت شیعہ و سنی دونوں کے علم رجال کے ماہرین نے اس کا نام ذکر کیا ہے اور اس خطبے کا راوی ایک قابل اعتماد اور موثق انسان ہے۔

انصار اور مہاجرین کی عورتوں کا حضرت زہراء (ع) کی عیادت کرنا،
کتاب احتجاج میں نقل ہوا ہے کہ:

"قال سويد بن غفلة، لما مرضت فاطمة (ع) المرضة التي توفيت فيها"

(سويد بن غفلة کہتا ہے کہ: جب حضرت زہراء بیمار ہوئی کہ جس میں آپ نے وفات پائی۔ اور شہید ہوئیں۔)

"اجتمعت اليها النساء المهاجرات والانصار ليعدنّها"

(انصار و مہاجرین کی عورتیں آپ کے پاس جمع ہوئیں تاکہ آپ کی احوال پرسی کریں)

= "بلغات النساء"، "اعلام النساء" اور "احتقاق الحق" نے ایک دوسری سند کُذریجے اور "معانی الاخبار" میں "مرحوم صدوق" نے دو سندوں کے ساتھ اس خطبے کو نقل کیا ہے۔

۱۔ البدر علامہ مجلسی نے بحار الانوار ج ۲۲ میں اس خطبے کو دو سندوں کے ذریعے نقل کیا ہے۔ ایک سند، صدوق کی کتاب معانی الاخبار سے لی ہے کہ جس نے عبد اللہ بن حسن سے اور اس نے اپنی والدہ فاطمہ بنت امام حسین سے یہ خطبہ نقل کیا ہے۔ دوسری سند شیخ طوسی کی کتاب "المالی" میں ابن عباس کی روایت سے نقل ہوئی ہے۔

”فقلن لها، کیف اصبحت من علتک، یا بنۃ رسول اللہ؟“

(یہ عورتیں آپؐ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں کہ: اے رسول خدا (ص) کی دختر گرامی! اس بیماری میں کس طرح صبح کی۔ اور اس کے ساتھ زندگی کیسے گزر رہی ہے؟)

”فحمدت اللہ وصلت علی ابیہا“

(تو آپؐ نے خدا کی حمد و ثنا کی اور اپنے بابا۔ رسول خدا (ص)۔ پر درود بھیجا)

یہاں پر آپؐ نے جو خدا کی حمد و ثنا کی تھی راوی نے ذکر نہیں کی ہے حالانکہ پہلے خطبے میں تفصیل سے نقل ہوئی تھی۔ بہر حال یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معمول تھا کہ پہلے خدا کی حمد و ثناء سے تقریر کا آغاز کریں اور پھر اسے جاری رکھیں۔

اس خطبہ میں آپؐ پہلے خداوند عالم کی حمد و ثنا فرماتی ہیں پھر پیغمبر اکرم (ص) پر درود و صلوات بھیجنے کے بعد اپنی گفتگو کا آغاز فرماتی ہیں۔

”ثم قالت، اصبحت واللہ عاتقة لدنیاکن، قالیۃ لرجالکن“

(اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ:

خدا کی قسم اس حالت میں میں نے صبح کی کہ تمہاری دنیا سے نفرت رکھتی ہوں اور تمہارے مردوں سے بغض رکھتی ہوں) ”عاف الشی“ ”کرہ“ کے معنی میں ہے یعنی اس نے اس چیز سے نفرت کی ہے ”قالیۃ“ بھی ”بغضہ“ کی طرح ناراض ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی موجود ہے کہ: ”وما وذعک ربک وما قلن (۱۱)“ (اے رسول۔ خدا نے نہ تجھ کو چھوڑ دیا ہے اور نہ ہی تجھ سے ناراض ہوا ہے) اس آیت میں ”ما قلن“ ”ما ابغضن“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حضرت زہراء (ع) بھی یہاں فرماتی ہیں کہ: ”عاتقة لدنیاکن“ (تمہاری اس دنیا سے نفرت رکھتی

ہوں) ”قالیۃ لرجالکن“ (تمہارے مردوں کا بغض میرے دل میں ہے)۔

لوگوں کی بے وفائی کی ایک جملہ

”لفظتم بعد ان عجمتم“

(میں نے ان کو دانتوں سے کاٹنے۔ آزمائش کرنے۔ کے بعد دور پھینک دیا ہے)

عربی میں ”لفظ“ منہ سے کسی چیز کے پھینکنے کو کہا جاتا ہے۔ جبکہ ”عجم“ یعنی دانت سے کاٹنا تاکہ کسی چیز کی سختی یا نرمی معلوم ہو جائے۔

یہاں قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ بزرگان کے کلمات میں ہمیشہ استعارہ (۱) اور تشبیہ پائی جاتی ہے۔ اگر ہم رسول خدا (س) اور امیر المؤمنین (ع) کے کلمات کا بغور مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ان بزرگوں نے استعارہ اور تشبیہ سے کافی زیادہ استفادہ فرمایا ہے۔ حضرت زہراء (ع) ان کلمات کو بستر شہادت پر فرما رہی ہیں، رحلت پیغمبر (س) کے بعد کے قلیل عرصہ میں آپؐ نے لوگوں کو آزمایا تھا چاہے مسجد النبی (س) میں خطبہ دیتے وقت یا دوسرے موقعوں پر اور آپؐ نے ان کو پہچان لیا تھا کہ ان کے اندر کس قدر ہمت و جرات اور شجاعت و مردانگی موجود ہے۔ اس طرح آپؐ ان کی بے وفائی اور بے مردتی کو اس کڑوے پھل سے تشبیہ دیتی ہیں کہ جسے انسان لاعلمی کے عالم میں جب منہ میں رکھتا ہے اور اسے سخت کڑوا پاتا ہے تو اسے منہ سے باہر نکال کر پھینک دیتا ہے۔ مدینہ کے مہاجر و انصار اس قدر بے وفا تھے کہ آپؐ کو ان پر صرف ذرا سا اعتماد ہی نہ تھا بلکہ آپؐ ان سے شفر بھی تھیں۔

”وشناتہم بعد ان سبرتم“

(اور امتحان لینے کے بعد ان۔ آپ کے مردوں۔ سے نفرت کرتی ہوں)

”سبر“ یعنی امتحان اور ”شنا“ یعنی نفرت، ناراضگی، دشمنی۔ یعنی جب سے میں نے تمہارے مردوں کو آزمایا اور یہ معلوم ہوا کہ وہ وفاداری اور مردانگی سے عاری ہیں اور تعیش پسند اور دنیا سے محبت رکھتے ہیں تو وہ مجھے برے معلوم ہوتے ہیں اور میں ان سے نفرت کرتی ہوں۔

”فقبحاً لفلول الحد“

۱۔ استعارہ الفاظ کا وہ مجازی معنی ہے کہ جس میں ایک معمولی سی شبہات کی وجہ سے لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(کسی تیز چیز کا کند ہونا کس قدر برا ہے)

جس چیز کو تیز ہونا چاہئے جیسے تلوار اور چاقو وغیرہ اگر کند ہو جائیں تو بہت بری بات ہے اور اسے دور پھینک دینا چاہئے، جس طرح تلوار کو تیز ہونا چاہئے اسی طرح ایک مرد سے شجاعت، مردانگی، ہمت، عزت اور حق سے دفاع کی توقع رکھی جاتی ہے۔ اب اگر یہ مرد جسے دلیر اور نڈر ہونا چاہئے تھا بزدل اور مفاد پرست بن جائے تو یہ بہت بڑی قباحت ہوگی۔ یہ لوگ۔ مہاجر و انصار۔ رسول خدا (ص) کے صحابی تھے اور انہوں نے صدر اسلام کی جنگوں میں جان نثاری کا مظاہرہ کیا تھا یہی لوگ آج محافظہ کار بن گئے ہیں اور ابن الوقت بن کر حکومت سے تعاون کر رہے ہیں اس لئے آپؐ فرماتی ہیں کہ:

”فقبحا“ بہت قبیح ہے۔ ”فلول الحمد“۔ فلن کی جمع ہے یعنی کندی، ممکن ہے مصدری معنی میں ہو۔ اور یہ معنی زیادہ مناسب ہے۔ ”خذ“ اس چیز کو کھا جاتا ہے جو تیز ہو۔ ”فلول الحمد“ یعنی کسی تیز چیز کا کند ہونا۔ پس اگر کوئی چیز تیز ہو اور بعد میں اس کی تیزی ختم ہو جائے اور کند ہو جائے تو یہ بری بات ہے۔

مذہب اور سیاست کے کھلاڑی:

”واللعب بعد الجد“

(سجیدگی کے بعد کھیل کس قدر قبیح ہے)

وہ شخص جو سجیدہ تھا متین اور نڈر تھا، باطل کے مقابلے میں مقاومت کر کے ایثار و قربانی کا عادی تھا اب وہ اچانک اگر ایک سیاسی کھلاڑی بن جائے تو اس سے قبیح اور برا کچھ نہ ہو گا، لہذا حضرت فاطمہؑ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ کسی زمانے میں آپؐ سجیدہ اور دلیر تھے لیکن ابھی۔ میدان سیاست کے۔ کھلاڑی بن گئے ہو اور یہ بہت بری بات ہے۔ اگر ایک آدمی ابتداء سے ہی بزدل ہو، مجاہد نہ ہو تو ابھی اس سے کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی لیکن وہ افراد جو ابتدا میں انقلابی تھے اور حق کی حمایت کرتے تھے ان کو اب یہ زیب نہیں دیتا بلکہ بہت بری بات ہے کہ وہ بزدل بنیں۔ محافظہ کاری سے کام لیتے ہوئے سیاسی کھلاڑی بن جائیں اور جوڑ توڑ نیز سیاسی سودا بازی میں مشغول ہو کر۔ انسانی اور اسلامی۔ اقدار کی خرید۔

دفعہ درخت کر دیں۔

”وقرع الصفاة“

(سنگ خارا پر۔ تلوار۔ مارنا کس قدر بھونڈی حرکت ہے)

”صفاة“ صاف پتھر کو کہا جاتا ہے جیسے سنگ مرمر۔ اگر سنگ مرمر صاف ہو اور اس پر تلوار یا پتھری ماری جائے تو اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جیسے اصطلاح میں کہتے ہیں ”پہاڑ کو مکا مارنا“ جس طرح پہاڑ پر مکا اثر نہیں کرتا اور ایک بیسودہ فعل ہے اسی طرح سنگ خارا پر تلوار مارنا بھی بیسودہ فعل ہے جس کا کوئی اثر نہیں نکلتا۔

اس حملے کے بارے میں دو احتمال ہیں اور دونوں کو علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں ذکر فرمایا ہے:

۱۔ جملہ کا معنی یہ ہو کہ اگر تم۔ انصار۔ مل کر کام کرو تو بھی وہ بے اثر ہو گا بالکل ایسا ہے کہ سخت پتھر پر تلوار ماریں۔ یہ عمل نہ صرف بے ثمر اور بیسودہ ہے۔ بلکہ تمہارے نقصان میں بھی ہے۔ کیونکہ تلوار کی تیزی اور حدت ختم ہو جاتی ہے اور ممکن ہے تلوار ٹوٹ جائے۔ اور جہاں تلوار سے استفادہ کرنے کا موقع ہو وہاں تم تلوار سے استفادہ نہیں کرتے دراصل تم اپنی طاقت اور قدرت سے بے جا اور غلط استفادہ کر رہے ہو۔

۲۔ شاید اس فقرہ سے یہ مقصود ہو کہ تم اب اس قدر کمزور اور ناتواں ہو چکے ہو اور ذلت و پستی تک پہنچ چکے ہو کہ دشمن تمہاری ہر چیز کو پامال کر رہے ہیں۔ جب دشمن پہنچے گا تو تمہارے پاس موجود کسی سخت پتھر کے ایک ٹکڑہ کو بھی نہیں چھوڑے گا اسے بھی توڑ دے گا۔ یعنی دشمن تمام موثر اور فعال مقامات کو اپنے حملے کا نشانہ بناتا ہے اور حملے کی شدت اور کثرت سے غیر موثر مقامات بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ: ”قرع الصفاة“ کے اس فقرے کے معنی میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ تم خود سنگ خارا پر تلوار مار رہے ہو اور اپنی توانائی کو غلط اور بیسودہ مصرف کر رہے ہو۔ دوسرا احتمال یہ کہ تم اس قدر ذلیل اور پست ہو جاؤ گے کہ دشمن تمہاری ہر چیز کو نابود کر دے گا۔

”و صدع القنائة“

(کس قدر قبیح ہے نیزے کی انی کا ٹوٹ جانا)

نیزے کا کام یہ ہے کہ جنگ میں کام آئے، اگر نیزہ ٹوٹ جائے تو وہ بے ثمر ہو جاتا ہے۔ یہ کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ تم۔ انصار و مہاجر۔ بھی ٹوٹے ہوئے نیزہ اور شمشیر شکستہ کی طرح اپنی خاصیت کھو چکے ہو۔

”وختل۔ خطل۔ الآراء“

(اور نظریات اور آراء میں غلطی اور اشتباہ بھی۔ کتنی بری بات ہے۔)

تمہارے عقائد اور افکار بھی متحد نہیں ہر ایک اپنا مخصوص نظریہ رکھتا ہے تم پارٹی بازی میں مشغول ہو جس کے نتیجے میں تم غلطی اور اشتباہ میں پڑ جاتے ہو۔

”و زلل الاهواء“

(کس قدر بری ہیں خواہشات کی لغزشیں)

یہ سب حملے ”فقبحاً لفلول الحد“ پر عطف ہوئے ہیں۔ (یعنی کس قدر برا اور قبیح ہے، کسی تیز چیز کا کند ہونا؛) ”واللعب بعد الجذ“ (سجیدگی کے بعد کھیل تماشا؛) ”وقدع الصفاة“ (اور سنگ خارا پر۔ تلوار۔ مارنا؛) ”و صدع القنائة“ (اور نیزے کی انی پر شکاف پڑنا؛) ”وختل الآراء“ (نظریے میں غلطی اور اشتباہ نیز؛) ”و زلل الاهواء“ (خواہشات اور آرزوں میں لغزش) (۱)۔

”وبئس ما قدمت لهم انفسهم“

(تمہارے مردوں نے۔ بہت ہی بری چیز کو اپنے لئے آمادہ کیا ہے)

۱۔ یہ تعبیرات استعارہ ہیں اور اس وقت کے مسلمانوں کی حالت زار کی نشاندہی کرتی ہیں کہ انحراف اور بگاڑ کے مقابلے میں ان کی تیزی اور کاٹ ختم ہو گئی تھی، سجیدگی کے بجائے بے توجہی اور کھیل تماشا نیز بیہودگی کی طرف راغب ہو گئے تھے، اپنی توانائیوں کو بیہودہ کاموں میں صرف کر کے عسکری قوت میں شکاف پڑ چکا تھا، غلط نظریات پھل پھول رہے تھے، ارفع و اعلیٰ مقاصد کے بجائے پست مقاصد کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا۔

در حقیقت حضرت زہراء (ع) خبردار کرنا چاہتی ہیں کہ جو کام تمہارے مرد کر رہے ہیں اس کا انجام جہنم ہے۔ جو لوگ حق کا دفاع نہ کریں، مظلوم کی حمایت نہ کریں اپنے پیغمبر (س) کی بیٹی کو تنہا چھوڑ دیں اور رسول خدا (س) کی اتنی تاکید کے باوجود امیر المؤمنین (ع) سے بے اعتنائی برتیں تاکہ چند دن زندہ رہیں اور پیٹ بھریں ان کا انجام جہنم ہے، اسی لئے آپؐ فرماتی ہیں کہ:

”ان سخط اللہ علیہم وفی العذاب ہم خالدون“

(ان کا کردار اس بات کا باعث بنا کہ خدا ان پر غضب کرے اور جہنم کے عذاب میں ہمیشہ مبتلا رہیں)

حکومت کی بدعنوانی کے مقابلے میں عوام کی ذمہ داری:

”لا جرم لقد قلدتہم ربقتہما“

(اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ خلافت۔ یا فدک۔ کی ڈور کو خود ان کی گردن میں ڈال دوں)

اگر میں فدک یا خلافت کے مسئلے میں تمہارے پاس آئی تھی اور تم سے گفتگو کی تھی اور انصاف چاہتی تھی تو اب اس کو بھی میں نے چھوڑ دیا ہے اور میں نے اس کی ذمہ داری اور نتائج کو بھی غضب کرنے والوں یا تمہارے مردوں کے کندھوں پر رکھ دیا ہے۔ حکومت وقت کے کاموں میں سب شریک تھے اور سب ان کے پروپیگنڈوں سے متاثر اور ان کے ہمنوا تھے اسی لئے وہ سب حکومت وقت کے ساتھ گناہ میں شریک ہوں گے جیسا کہ حضرت علیؑ نبج البلاغہ میں فرماتے ہیں کہ: ”وانما الناس مع الملوک والدنیا الامن عصم اللہ (۱)“ (بے شک عوام بادشاہوں اور حکمرانوں کے تابع اور دنیا پرست ہوتے ہیں مگر یہ کہ خدا کسی کو محفوظ رکھے)۔ یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صالح حکومت کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے کیونکہ اگر ایک صالح حکومت برسر اقتدار آئے تو عوام بھی خیر و نیکی کی شاہراہ پر گامزن ہوں گے، لیکن اگر حکومت فاسد ہو تو عوام کو بگاڑ اور ہلاکت کی طرف لے چلیں گے، کیونکہ یہ فطری بات ہے کہ کسی فاسد معاشرے میں بہت ہی کم لوگ اپنی اصلاح کرتے ہیں اور عموماً لوگوں کے ایمان

سست اور کمزور ہوتے ہیں۔ پس اگر ہم لوگوں کی خیر و فلاح کے خواہاں ہوں تو لازم ہے کہ معاشرے کو سالم اور نیک بنائیں اور ایسے اقدامات کئے جائیں کہ حکومت وقت ایک صالح حکومت بنے ورنہ اگر حکومت اور حکمران فاسد اور غیر صالح ہوں تو عوام بھی فاسد اور منحرف ہو جاتے ہیں اور پھر وہی ہوتا ہے جو حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ: ”لوگ عموماً حکمرانوں کے تابع اور دنیا کے دلدادہ ہوتے ہیں“۔

خلاصہ یہ کہ: اگر حکومت اور حکمران فاسد ہوں تو بھلائی اور دینداری کی سمت حرکت کرنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے حکمرانوں کی اطاعت اور پیروی کرتے ہیں۔

حضرت زہراء (ع) کے دور میں بھی لوگوں کی اکثریت حکومت کے تابع اور ان کے ساتھ شریک جرم تھی، اسی لئے حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ:

”لاجرم“ یعنی ناچار ہوں، کیونکہ تمہارے مرد، ڈرپوک، کمزور اور مفاد پرست نکلے ہیں اور انہوں نے حکومت وقت کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا ہے۔ ”قلد تم ربقہا“ تو اس کی باگ ڈور اور رسی کو میں نے انہی کی گردن میں ڈال دیا ہے۔ یعنی خلافت یا فدک کی باگ ڈور کو انہی کے حوالے کر دیا ہے۔ ”ربقہ“ اس رسی کو کہا جاتا ہے جس سے جانوروں کو باندھ دیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب مویشیوں کو ایک ہی رسی سے باندھتے تھے تو دو حیوانوں کے درمیان کوئی لکڑی کا ٹکڑا رسی میں کس دیتے تھے یا رسی پر گرہ لگاتے تھے۔ یعنی ایک لمبی رسی کو مختلف جگہوں سے گرہ لگاتے تھے اور دو گرہوں کے درمیان حصے سے کسی جانور کی گردن باندھ دیتے تھے، اس طرح دو گرہ کے درمیان حصے کو ”ربقہ“ کا نام دیتے تھے۔ اس کی جمع ”ربق“ یا ”ربق“ ہے۔ اس خطبہ میں ”ربقہ“ اگرچہ مفرد ہے لیکن جنس ”ربقہ“ مراد ہے اور جمع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ: حضرت زہراء (ع) یہ فرماتی ہیں کہ: میں نے خلافت یا فدک کی باگ ڈور کو غاصبین اور تمہارے مردوں کی گردنوں میں ڈال دیا ہے تاکہ قیامت تک انحراف، خلافت اور غضب کئے ہوئے فدک کے جواب دہ رہیں۔ ہم اہل بیتؑ کے جو حقوق غضب ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں لوگوں پر جو ظلم و ستم ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری غضب کرنے والوں اور تمہارے مردوں پر عائد ہوتی ہے۔

لہذا انہیں قیامت کے دن اس کا جواب دینا پڑے گا۔

”وَحَمَلْتَهُمْ اَوْقَتَهَا“

(اور اس کے سنگین بوجھ کو ان کے کاندھوں پر رکھ دیا ہے)

”اوق“ یعنی سنگین اور وزنی۔ بوجھ۔ ”اوقتھا“ میں جو ”تاء“ ہے وہ یا تو وحدت کی تاء ہے یا جنس (ا) کی۔ بہر صورت معنی یہ ہے کہ، فدک یا خلافت کے غصب کے۔ سنگین اور وزنی بوجھ کو میں نے ان کے حوالے کر دیا ہے۔ لہذا انہیں قیامت کے دن اس کا جواب دینا پڑے گا، چونکہ جو ہم سے ہو سکتا ہے ہم نے دین کی خاطر انجام دیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت علیؑ، حضرت زہراءؑ کو لے کر مہاجرین اور انصار کے گھر گھر جاتے تھے اور ان پر اتمام حجت فرماتے تھے۔

حضرت زہراء (ع) یہ فرمانا چاہتی ہیں کہ ہم نے اپنی طاقت کے مطابق کوشش کی ہے تاکہ خلافت اپنی شاہراہ سے منحرف نہ ہو لیکن ابھی تم خود راضی ہو اور خلافت کو اپنی راہ پر لگانے کے خلاف ہو تو اس کے نتائج اور انجام کی ذمہ داری بھی تم پر ہی عائد ہوتی ہے اور دنیا اور آخرت میں جو بھی مشکل اور بلاء اور اعتراض ہو گا وہ سب تم پر عائد ہو گا۔

”وَشَنَنْتَ - سَنَنْتَ - عَلَیْہِمْ غَارَاتِہَا“

(غضب خلافت کے مظالم اور مضمرات کی ذمہ داری خود ان پر عائد کرتی ہوں)

اگر اصل خطبہ میں ”شَنْتَ“ ہو تو معنی یہ ہو گا کہ میں نے چھڑکا۔ اگر ”سَنْتَ“ ہو تو میں نے پانی گرایا۔ البتہ یہاں دونوں عبارتوں کے ساتھ معنی صحیح ہے۔ ”شَنْ“ پانی چھڑکنا اور ”سَنْ“ یعنی آہستہ آہستہ پانی کا گرانا۔ قرآن میں ”ماء مسنون“ جو آیا ہے وہ بھی گرائے گئے پانی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس فقرے میں حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: ”میں نے غضب خلافت کی غارتگری کے سیلاب کا رخ خود ان کی طرف موڑ دیا۔“

۱۔ ”تاء“ مفرد ایک عدد پر اور ”تاء“ جنس اصل معنی پر دلالت کرتی ہے اور اس میں کسیت کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔

جب کسی ملک پر دشمن حملہ آور ہوتا ہے تو اس ملک کی ہر چیز غارتگری کا نشانہ بنتی ہے اور وہ اس ملک کو تنہا تنہا کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح اس وقت کے مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کیا کہ خلافت کی راہ کو بدل دیا جس کے نتیجے میں دشمن کے تسلط اور قتل و غارتگری کا دروازہ کھل گیا۔ نہ صرف یہی بلکہ اس وقت بھی قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا نیز آنحضرت (س) کے دور کی تمام انسانی اور الہی اقدار کو جاہلی تعصب کے ہاتھوں تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ لہذا ان تمام مفسد اور مظالم کی ذمہ داری خود ان کے کاندھوں پر عائد ہوتی ہے (۱)۔

”فجدعاً وعقراً وبعداً للقوم الظالمین“

(پس اس ظالم قوم پر ہلاکت، نابودی اور زخم ہو اور رحمت خدا سے دور ہو)

”جدع“ یعنی مثلہ کرنا، جس شخص کے، ناک، کان، ہونٹ کاٹ دیئے گئے ہوں تو کہتے ہیں کہ ”جدعہ“ یعنی اسے مثلہ کیا گیا ہے اور دراصل یہ اس شخص کے لئے ایک قسم کی شکست اور ہلاکت ہے۔ بنا بریں ”جدع“ کنایہ ہے ہلاکت اور نابودی سے۔ ”عقراً“ یعنی مقابل کوزخمی کرنا۔ پہلے پہل یہ گھوڑے کوزخمی کرنے کے معنی میں استعمال ہوا پھر آہستہ آہستہ ہر جاندار پر لگائے جانے والے۔ مہلک۔ زخم کو ”عقر“ کہا جانے لگا۔ پس ”عقراً“ یعنی مہلک زخم لگانا۔ ”بعداً للقوم الظالمین“ یعنی ظالم گروہ۔ رحمت خداوندی سے۔ دور رہے۔ یہ تینوں کلمات یہاں بددعا کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔

شاہراہ امامت سے انحراف کا آغاز

”ویحکم! انی زعزوہا عن رواسی الرسالۃ؟“

(دائے ہوان پر! رسالت کے مضبوط و مستحکم مقام سے خلافت کو ہٹا کر کہاں لے گئے؟!)

ان پر دلسوزی اور شفقت کی وجہ سے آپؐ نے یہاں پر ”ویلہم“ کے بجائے ”ویحکم“ فرمایا ہے۔ جب

اتاریخ بھی صراحت کے ساتھ یہ گواہی دیتی ہے کہ امامت و خلافت کا اپنے اصلی راستے سے منحرف کرنے کی وجہ سے کس قدر مفسد پیدا ہوئے اور خون کے بازار گرم رہے۔ دراصل آج تک مسلمانوں کی بد بختی، بے چارگی اور تمام مصائب و مشکلات کی جڑ، امامت کے مسئلہ میں انحراف ہی ہے۔

کسی کی حالت زار کو دیکھ کر دلسوزی کرنا مقصود ہو تو ”ویحہ“ کہا جاتا ہے جبکہ غیظ و غضب اور لعنت کرنا مقصود ہو تو ”ویل“ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

”انی زعزوھا“ یہ لوگ خلافت کو اڑا کر کہاں لے گئے اور اسے کس راستے پر لگا دیا ہے (۱)۔ ”عن رواسی الرسالة“ یعنی رسالت و نبوت کے ثابت و استوار مقام اور چٹانوں سے۔ ”جبال الرواسی“ کے معنی بھی ثابت اور استوار پہاڑوں کے ہیں۔ حضرت زہراء (ع) کے۔ اس جملہ کا معنی یہ ہے کہ خلافت کو علم و تقویٰ اور وحی کے ساتھ رابطے کے ذریعے ثابت اور مستحکم مقام سے ہٹا دیا ہے اور اسے ایک غلط اور باطل راستے پر لگا دیا ہے۔

رسالت کی طرف ”رواسی“ کی نسبت کی وجہ یہ ہے کہ دراصل امامت رسالت کے لئے ایک قوی، مستحکم چھاؤنی اور مورچہ ہے۔ جہاں سے رسالت کے مقاصد کی پاسبانی کی جاتی ہے۔ پس اگر امامت اپنے اصلی مقام اور رتبہ سے گر جائے اور علیٰ جیسی عظیم الہی شخصیت کے ہوتے ہوئے ابو بکر، عمر اور عثمان جیسے افراد امام المسلمین کہلائیں تو دراصل یہ رسالت پر ایک کاری ضرب ہے اور یہ دین کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے مترادف ہے۔

”وقواعد النبوة والدلالة“

(اور نبوت اور قیادت کی بنیادوں اور اصولوں سے۔ امامت کو جدا کر کے کس سمت لے گئے؟۔)

”قواعد قاعده“ کی جمع ہے اور ”قاعده“ بنیاد اور اصول کو کہتے ہیں جبکہ ”دلالہ“ راہنمائی۔ اور قیادت کے معنی میں ہے۔ یعنی خلافت سے مربوط نبوت اور قیادت کی بنیادوں اور اصولوں میں تحریف کی

ہے (۲)۔

۱۔ ”زعزوھا“ میں ضمیر خلافت کی جانب پلٹتی ہے اور یہ قرینہ ہے اس بات پر کہ اس سے پہلے والی عبارت، یعنی لقد قلد تمم ربقتها میں بھی ”ھا“ سے خلافت ہی مراد ہو۔

۲۔ اسلام کی فتح اور اسلامی حکومت کی تشکیل میں حضرت علیؑ کا جو کردار رہا ہے اس کی بنا پر آپؑ اسلامی حکومت کی ایک مضبوط اور مستحکم بنیاد کی حیثیت رکھتے تھے اور صرف آپؑ کی ذات گرامی ہی تھی جو نبوت کے اہداف اور پیغمبرؐ کے مشن کو آگے بڑھا سکی تھی، کیونکہ علم و تقویٰ، معنوی فضائل اور روحانی کمالات کے لحاظ سے رحمۃ للعالمینؐ کے بعد آپؑ کا درجہ تھا۔ نہ کہ دوسرے لوگ جو علم و تقویٰ وغیرہ میں رسول خداؐ کے ساتھ کسی قسم کی شباهت بھی نہیں رکھتے تھے۔

”وَمُهَيَّبُ الرُّوحِ الْاَمِينِ“

(اور جبریل امین کے نازل ہونے کے مقام سے)

اگرچہ حضرت علیؑ پر وحی نہیں ہوتی تھی لیکن جس ہستی پر وحی نازل ہوتی تھی وہ رسول خدا (ص) تھے اور رسول خدا (ص) سے سب سے زیادہ نزدیک حضرت علیؑ ہی تھے اور رسول خدا (ص) پر نازل ہونے والی تعلیمات اور خدا کے فرامین کو حضرت علیؑ بغیر کسی واسطہ کے ختمی مرتبت (ص) سے اخذ فرماتے تھے۔

”وَالطَّبِيبُ بِأُمُورِ الدُّنْيَا وَالْدِينِ“

(اور۔ اس شخص سے خلافت چھینی گئی۔ جو دنیوی اور دینی امور میں مکمل مہارت رکھتا تھا)

”طہین“ یعنی تجربہ کار اور ماہر کامل۔ امیر المؤمنینؑ حاذق ہیں اور دنیوی و دینی امور کے مکمل ماہر۔ لیکن ان لوگوں نے خلافت کو آپؐ سے چھینا اور اس کی راہ کو منحرف کر دیا اور خلافت کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھوں میں دے دی جو دینی اور سیاسی امور میں آگاہی نہیں رکھتے تھے۔

شاید اس کلام میں دنیوی امور سے، معاشرے کے سیاسی اور معاشرتی مسائل اور لوگوں کے اجتماعی امور مراد ہوں اور دینی امور سے مراد یہ ہو کہ شریعت کے احکام بیان کریں، انہیں تحریف، بدعت اور تغیر سے بچائیں اور لوگوں کو ایمان، فلاح اور سیدھے راستہ جانب ہدایت کریں۔

”الَاذْلَکَ هُوَ الْخَسْرَانِ الْمَبِیْنِ“

(آگاہ رہو! جو کام ان لوگوں نے کیا وہ بے شک آشکار اور بہت عظیم خسارت ہے)

یعنی یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں بلکہ، خشت اول چوں نہد معمار کج تاثیر یامی رود دیوار کج سقیفہ میں پانچ آدمیوں نے ابو بکر کو خلیفہ مقرر کیا (۱) اور یہ لوگ خاموش رہے۔ بعد میں ڈرانے

۱۔ آیت اللہ شہید صدرؒ اپنی فدک نامی کتاب کے صفحہ ۳۳ میں سقیفہ میں بغاوت کی بنیاد، ابو بکر، عمر اور ابو عبیدہ جراح کی سہ نفرہ سیاسی پارٹی کو قرار دیتے ہیں اور پیغمبر اکرمؐ کے بعد رونما ہونے والے بہت سے حادثات اور سیاسی سرگرمیوں اور مسائل کی بنیاد اور جڑ اسی سیاسی پارٹی کو قرار دیتے ہوئے ص ۵۸ پر لکھتے ہیں کہ اس پارٹی نے مملکت کے اہم کلیدی عہدوں کو اپنے اصلی ارکان کے درمیان تقسیم کر لیا تھا اس طرح ابو بکر کے حصے میں قیادت و خلافت، عمر کے حصے میں عدالتی نظام اور مالی امور ابو عبیدہ کے حصے میں آئے تھے۔

دھمکانے کے ذریعے اور خوف و ہراس پھیلا کر غلط پروپیگنڈوں اور افواہوں کے ذریعے لوگوں سے بیعت لی اس طرح پیغمبر (ع) کی جانشینی کو اس کے صحیح حقدار سے چھین لیا۔ یہ سب اس بات کا باعث بنا کہ خلافت ہمیشہ کے لئے غلط راہ پر لگ جائے اور اسلام کو مسخ کیا جائے۔ اسی لئے وہ لوگ جو اس دن خاموش تماشائی بنے رہے، بعد میں ہونے والے ہر ظلم و جنایت میں شریک جرم بن گئے اور یہ خود ایک خسران مبین ہے۔

اصحاب سقیفہ کے سیاسی مقاصد،

”وما الذی نقموا من ابی الحسن علیہ السلام؟“

(وہ کونسا سبب تھا کہ جس کی وجہ سے ان لوگوں نے ابی الحسن علیؑ کے خلاف انتقامی کارروائی کی؟) امیر المؤمنینؑ کے ساتھ ان کی کونسی دشمنی اور عداوت تھی سوائے اس کے کہ حضرت علیؑ شجاع تھے، بے باک اور نڈر تھے، جنگی محاذوں پر حق کا دفاع فرماتے تھے اور اسلام کی حمایت اور محافظت کرتے تھے۔ البتہ یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ مسند حکومت پر کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھ سکتے تھے جو حق کی خاطر جان کی بازی لگانے پر آمادہ ہو۔ اور اس بارے میں کسی قیمت پر سودا بازی اور سہل انگاری کے لئے آمادہ نہ ہو۔

(۱) ”ونقموا واللہ منہ نکیر سیفہ“

(خدا کی قسم اس سے اس کی باطل شکن تلوار کا انتقام لیا ہے)

یعنی، یہ لوگ ناراض تھے، لہذا وہ آپؐ سے انتقام لینے کے درپے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ امیر المؤمنینؑ ہمیشہ برائیوں اور مفسد کا مقابلہ کرتے تھے، وہ سیاسی سودا بازی کے قائل نہ تھے بلکہ اپنی شرعی ذمہ داری کے پابند تھے اور صرف خداوند متعال کی حرمت اور دینی والہی اقدار کی پاسداری کو مد نظر رکھتے تھے۔ اگر حضرت علیؑ کچھ سیاسی کھیل کھیلتے تو وہ حکومت پر قابض ہوتے اور اس کے دشمن ناکام ہو جاتے لیکن یہ قیمت ضرور ادا کرنی پڑتی تھی کہ دینی اقدار سے بے رخی برتی جائے، حالانکہ

آپ اس کے لئے تیار نہ تھے کہ حکومت حاصل کرنے کی خاطر غیر شائستہ طریقہ کار اپنایا جائے۔
 ”نکیر“ کو غالباً انکار کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی آپ اجتماعی برائیوں اور باطل کو اپنی
 تلوار کے ذریعے روکتے تھے۔

(۲) ”وقلۃ مبالاۃ لحتفہ“

(انتقام جوئی کی ایک علت یہ تھی کہ وہ اپنی موت سے بے باک اور ڈرتے تھے)
 امیر المؤمنین ایک دلیر انسان تھے۔ آپ کو موت کا کوئی ڈر نہ تھا البتہ اگر انسان موت سے ڈرے
 تو وہ نہ جنگ کر سکتا ہے اور نہ حق کی حمایت، اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ باطل کے خلاف حضرت علیؑ
 نے جہاد کیا اور طاغوت کے ساتھ جنگ کی تو یہ اس لئے تھا کہ وہ موت سے خوفزدہ نہیں تھے آپؑ خود
 فرماتے ہیں کہ: ”واللہ لابن ابی طالب آنس بالموت من الطفل بشدی امہ“ (خدا کی قسم! ماں کے
 سینے سے بچے کے انس اور محبت سے ابو طالب کے بیٹے کو موت سے زیادہ عشق و محبت ہے)۔

(۳) ”وشدۃ وطاہۃ“

(اور باطل کو اپنے طاقتور قدموں سے سختی کے ساتھ پامال کرنے کی وجہ سے)
 ”وطا“ پامال کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یعنی حضرت علیؑ باطل پرست کفار و منافقین کو اپنے قدموں سے
 روند دیتے تھے۔ جب باطل کے چہرے پر قدم رکھنا چاہتے تھے تو بڑی قوت اور سختی سے رکھتے اور فیصلہ
 کن طریقے سے میدان میں جاتے تھے۔

یہ سب کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ امیر المؤمنین دینی اور سیاسی امور کے بارے میں
 صراحت، ثابت قدمی اور پختگی رکھتے تھے، چاہے وہ دشمن کے خلاف عسکری مقابلہ ہو یا مختلف
 سیاسی و معاشرتی گروہوں کے ساتھ آپؑ کا سلوک۔

(۴) ”ونکال وقعتہ“

(اس وجہ سے کہ جنگ اور مبارزہ میں آپؑ دشمن کو سخت اور شدید نتائج سے دوچار کرتے تھے)
 ”وقعہ“ جنگ اور دشمن پر حملہ آور ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جبکہ ”نکال“ کا معنی ہے۔

عذاب اور سزا۔ مقصد یہ ہے کہ ادا نل اسلام کی جنگوں میں کفار کے مقابلے میں آپؐ ڈٹ جاتے تھے۔ اور ان کو دردناک سزا دیتے تھے۔ یعنی میدان جنگ میں نہایت ہی پختہ انداز میں کفار سے جنگ کرتے اور ان کا قلع قمع کر دیتے تھے۔

(۴) ”وَتَنْمِرُ فِي ذَاتِ اللَّهِ“

(اور راہ خدا میں شیر کی طرح اس کی ناقابل تسخیر شجاعت اور دلیری کی وجہ سے)

”تنمر، نمر“ سے مشتق ہے اور ”نمر“ شیر کو کہا جاتا ہے۔ شیر کبھی بھی دشمن کے سامنے تسلیم نہیں ہوتا اور۔ بحرانی حالت میں بھی۔ وہ اپنی دلیری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اگر کسی انسان کے بارے میں کہا جائے کہ ”تنمر فلان“ تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ شیر کی طرح دلیر ہے اور دشمن کے سامنے تسلیم نہیں ہوتا اور دشمن کے خلاف اس کا غیظ و غضب بدستور باقی ہے۔

”فی ذات اللہ“ سے یہاں خدا، دین اسلام اور اس کی راہ اور مقصد مراد ہیں۔

حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ امیر المؤمنین (ع) کو صرف اس لئے انتقام کا نشانہ بنایا گیا کہ دشمن کے مقابلے میں ایک شیر کی مانند ڈٹ جاتا تھا، کیونکہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا مطلب ایمان کی کمزوری ہے یا دنیا اور اس کی رنگینیوں سے وابستگی اور عشق یا موت سے خوف، حالانکہ حضرت امیر المؤمنینؑ ان چیزوں سے پاک اور منزہ تھے۔

آپ (ع) کے کلام کے بقیہ حصے کو انشاء اللہ ہم اگلے درس میں بیان کریں گے۔

وصلی اللہ علی محمد وآل محمد (ص)

چودھواں درس:

- گزشتہ درس کا خلاصہ
- حضرت علی (ع) کی برحق حکومت کی چند خصوصیات
- عوام کے لئے حکومت کے چند مفید پروگرام
- بیت المال مسلمین اور حکومت
- اقتدار کے بھوکے اور خدمت کے شیدائی
- ظلم اور کفران نعمت
- اصحاب سقیفہ کی پھر مذمت
- سقیفہ کی کاروائی کی ایک جھلک
- مستقبل کے انحرافات کی پیش گوئی
- سقیفہ کے بعد لوگوں کی بد حالی کی پیش گوئی
- سقیفہ کے بعد رونما ہونے والے فتنوں کی خبر
- انصار و مہاجرین کی حضرت زہراء (ع) سے عذر خواہی

وَتَاللَّهِ لَوْ مَالُوا عَنِ الْمَحَجَّةِ اللَّائِيحَةِ، وَزَالُوا عَنْ قَبُولِ الْحُجَّةِ الْوَاضِحَةِ،
لَرَدَّاهُمْ إِلَيْهَا، وَحَمَلَهُمْ عَلَيْهَا، وَلَسَارَ بِهِمْ سَيْرًا سَجْحًا، لَا يَكْلُمُ خَشَاشَهُ وَلَا يَكَلُّ
سَائِرُهُ وَلَا يَمَلُّ رَاكِبُهُ؛ وَلَا أَوْرَدَهُمْ مِنْهَلًا نَمِيرًا صَافِيًا رَوِيًّا، تَطْفَحُ ضَفَّتَاهُ وَلَا يَتَرْتُقُ
جَانِبَاهُ، وَلَا ضَدَرَهُمْ بَطَانًا، وَنَصَحَ لَهُمْ سِرًّا وَإِعْلَانًا، وَلَمْ يَكُنْ يَتَحَلَّى مِنَ الْغِنَى
بِطَائِلٍ، وَلَا يَحْظِي مِنَ الدُّنْيَا بِنَائِلٍ، غَيْرَ رَى النَّاهِلِ وَشَبَعَةِ الْكَافِلِ؛ وَلَبَانَ لَهُمْ
الزَّاهِدُ مِنَ الرَّاغِبِ، وَالصَّادِقُ مِنَ الْكَاذِبِ؛ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا
لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَلَكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوا
يَكْسِبُونَ؛ وَالَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ هَؤُلَاءِ سَيُصِيبُهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَمَا هُمْ
بِمُعْجِزِينَ.

أَلَا هَلُمَّ فَاسْتَمِعْ! وَمَا عِشْتَ أَرَاكَ الدَّهْرَ عَجَبًا!! وَإِنْ تَعَجَّبَ فَعَجَبْتَ
قَوْلُهُمْ! لَيْتَ شِغْرِي إِلَى أَيِّ سِنَادٍ اسْتَنْدُوا؟! وَإِلَى أَيِّ عِمَادٍ اعْتَمَدُوا؟! وَبِأَيَّةِ
عُرْوَةٍ تَمَسَّكُوا؟ وَعَلَى أَيَّةِ ذُرِّيَّةٍ أَقْدَمُوا وَاخْتَنَكُوا؟! لَيْسَ الْمَوْلَى وَلَيْسَ
الْعَشِيرُ، وَبِشِّسٍ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا، اسْتَبَدَّلُوا وَاللَّهُ الذَّنَابِي بِالْقَوَادِمِ، وَالْعَجَزُ
بِالْكَاهِلِ؛ فَرَعْمًا لِمَغَاطِسِ قَوْمٍ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا، أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ
الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ.

وَيُحِبُّهُمْ أَفَمَنْ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ أَحَقُّ أَنْ يُتَّبَعَ، أَمْ مَنْ لَا يَهْدِي إِلَّا أَنْ
يُهْدَى، فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ؟! أَمَا لَعَمْرِي لَقَدْ لَقِحتُ، فَنظرة رَيْثَمَا قَتِجْتُ، ثُمَّ
اخْتَلَبُوا مِلءَ الْقَعْبِ دَمًا عَبِيطًا وَذَعَا فَا مَبِيدًا، هُنَالِكَ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ، وَ يَعْرِفُ
التَّالُونَ غَيْبَ مَا أَسَسَ الْأَوَّلُونَ، ثُمَّ طَيَّبُوا عَنْ دُنْيَاكُمْ أَنْفُسًا، وَاطْمَنَّنُوا لِلْفِتْنَةِ
جَاشًا، وَ أَبْشَرُوا بِسَيْفٍ صَارِمٍ، وَ سَطْوَةٍ مُعْتَدٍ غَاشِمٍ، وَ بَهْرَجَ شَامِلٍ، وَ اسْتَبَدَّادِ
مِنَ الظَّالِمِينَ، يَدْعُ فَيْتِكُمْ زَهِيدًا، وَ جَمْعَكُمْ حَصِيدًا؛ فَيَا خَسْرَةً لَكُمْ! وَأَنْتُمْ بِكُمْ،
وَ قَدْ عَمِيَتْ عَلَيْكُمْ، أَنْزِلْ مُكْمُوها وَأَنْتُمْ لَهَا كَارِهُونَ.

قال سويد بن غفلة: فَأَعَادَتِ النِّسَاءُ قَوْلَهَا ﷺ عَلَى رِجَالِهَا، فَجَاءَ إِلَيْهَا
قَوْمٌ مِنْ وَجْهِ الْمُهَاجِرِينَ وَ الْأَنْصَارِ مُعْتَذِرِينَ، وَ قَالُوا: يَا سَيِّدَةَ النِّسَاءِ، لَوْ كَانَ
أَبُو الْحَسَنِ ذَكَرَ لَنَا هَذَا الْأَمْرَ قَبْلَ أَنْ نَبْرِمَ الْعَهْدَ، وَ نَحْكُمَ الْعَقْدَ، لَمَّا عَدَلْنَا عَنْهُ
إِلَى غَيْرِهِ.

فَقَالَتْ ﷺ: إِلَيْكُمْ عَنِّي، فَلَا عَذْرَ بَعْدَ تَعْدِيرِكُمْ، وَ لَا أَمْرَ بَعْدَ تَقْصِيرِكُمْ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس کا خلاصہ:

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ یہ حضرت زہراء (ع) کا دوسرا خطبہ ہے جو آپؑ نے اپنے گھر میں انصار اور مہاجرین کی ان عورتوں سے خطاب فرمایا تھا کہ جو آپؑ کی عیادت کے لئے آئیں تھیں۔
گزشتہ درس میں عرض کیا کہ حضرت زہراء (ع) انصار و مہاجرین پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: امیر المؤمنینؑ پر ان کا کیا اعتراض تھا؟ آپؑ کے ساتھ کیوں دشمنی کی؟ میدان جنگ میں آپؑ کی شجاعت و شہامت، خدا کی خوشنودی کی راہ میں آپؑ کی بے باکی اور ایثار و قربانی کے سوا کوئی اور سبب تھا کہ جس کی وجہ سے آپؑ کو خلافت سے دور کر دیا گیا ہے؟ کیونکہ کبھی انسان کی خوبیاں بھی اس بات کا سبب بنتی ہیں کہ دوسرے لوگ اس کو معاشرے سے دور رکھنے کی کوشش کریں۔ کہا جاتا ہے کہ: مور کا دشمن خود اس کا پر ہے!۔

حضرت علی (ع) کی برحق حکومت کی چند خصوصیات:
خطبے کو جاری رکھتے ہوئے آپؑ فرماتی ہیں کہ:

”قَالَ لَوْ مَالُوا عَنِ الْمَحَبَّةِ الْإِلَاحَةِ وَزَالُوا عَنْ قَبُولِ الْحَبَّةِ الْمَضْحَةِ“

(خدا کی قسم۔ اگر حضرت علیؑ خلافت پر پہنچ جاتے تو۔

لوگ حق کے روشن راستے اور خدا کے واضح دلائل سے روگردانی کرتے)

۔ اگر حضرت علیؑ کو خلافت مل جاتی اور لوگوں کی یہ حالت ہوتی تو آپؑ لوگوں کو اسی حالت پر نہ

چھوڑتے بلکہ۔

(۱) ”لَوْ هُمْ الْيَهُودُ وَحَمَلُهُمْ عَلَيْهَا“

(بے شک آپؑ ان کو حق کی واضح شاہراہ اور آشکار دلائل کی طرف پلٹا دیتے اور اس کے مطابق چلنے پر آمادہ کرتے)

یعنی، اگر اقتدار اور خلافت آپؑ کو مل جاتے تو لوگوں کے انحراف اور حق اور الہی اقدار کے مقابلے میں ان کی بے اعتنائی کو برداشت نہ کرتے بلکہ ان کو حق و حقیقت اور صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت فرماتے (۱)۔

(۲) ”وَلَسَارِبُهُمْ سِيرًا سَجْحًا“

(اور آپؑ لوگوں کو انتہائی نرمی اور عطف کے ساتھ۔ حق پر۔ گامزن فرماتے)

”سج“ نرمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آپؑ لوگوں کو سختی اور بداخلاقی کے ذریعے نہیں بلکہ نرمی اور عطف کے ذریعے ہدایت فرماتے تھے۔ حالانکہ ابوبکر اور عمر خشونت اور سختی کے ذریعے اقتدار کی کرسی پر قابض ہوئے تھے۔ حضرت فاطمہؑ فرماتی ہیں کہ: اگر خلافت اور اقتدار حضرت علیؑ کے ہاتھوں آجاتے تو لوگوں کو انحراف و بکروی سے دور رکھتے اور ان کو خدا کے روشن دلائل کی طرف راہنمائی فرماتے اور اس راہ میں کسی قسم کی سختی اور خشونت سے کام نہ لیتے، کیونکہ سختی اور طاقت کے بل بوتے

۱۔ شاید حضرت زہراءؑ کا مقصود یہ نکتہ بھی ہو کہ امیر المؤمنینؑ حکومت کو الہی مقاصد تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے تھے اور خود حکومت کے لئے آپؑ کسی قیمت کے قائل نہ تھے یعنی آپؑ جاہ طلب اور اقتدار کے عاشق نہ تھے بلکہ، حق و عدالت اور دین کے اہداف و مقاصد نیز اسلامی اقدار کو عملی جامہ پہنانے کے خواہاں تھے اسی لئے ابن عباسؓ سے فرماتے ہیں کہ: ”تم پر حکومت کرنے کے مقابلے میں میرے نزدیک یہ پھٹا ہوا جوتا زیادہ قیمت رکھتا ہے مگر یہ کہ حکومت کدور یعنی حق کو قائم اور باطل کو ختم کر سکوں۔“ اسی نظریے کے تحت آپؑ نے اسلام اور حق و عدالت کو اپنی حکومت اور اقتدار پر قربان نہیں کیا بلکہ خود کو ان پر قربان کر دیا تاکہ اگرچہ آپؑ محب ظہر خلافت اور اقتدار سے محروم ہو گئے لیکن الہی اقدار اور دین کی روح کمزور اور اس کا غاتمہ نہ ہو جائے۔

لوگوں کو ہدایت نہیں کی جاسکتی، بلکہ ضروری ہے کہ انسان، ایمان اور عقیدت کے سائے میں حق و عدالت کی ہدایت پائے۔

(۳) "ولایکلم خشاشہ"

(اور لوگوں کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا تھا)

جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بزرگوں کے کلام میں وسیع پہمانے پر تشبیہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہاں بھی آپؐ نے تشبیہ دی ہے۔ یہاں آپؐ نے عوام کو اونٹ سے اور امامؐ کو اونٹ کے مالک سے تشبیہ دی ہے۔ اس دور میں اونٹ عربوں کا بہت ہی اہم سرمایہ تھے۔ اس لئے اکثر مثالیں اور تشبیہات بھی اسی سے مربوط ہیں۔

"خشاش" لکڑی کی اس نکیل کا نام ہے جسے اونٹ کے ناک میں سوراخ کر کے ڈالا کرتے تھے اور رسی کو اس نکیل سے باندھ کر کھینچتے تھے۔ اگر کوئی شخص سختی سے اسے کھینچتا تو اونٹ کا ناک زخمی ہو جاتا تھا جبکہ آرام اور نرمی سے کھینچنے پر اونٹ آرام سے مقصد کی طرف چل پڑتا اور اس کا ناک بھی زخمی نہیں ہوتا تھا۔ یہ تشبیہ آپؐ نے مطلب کو سمجھانے کے لئے دی ہے۔ یعنی جو شخص دوسرے لوگوں کی ہدایت اور قیادت کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ آرام اور نرمی کے ساتھ ہدایت کے عمل کو اس طرح انجام دے کہ لوگوں پر دباؤ اور صدمہ نہ پڑے۔ اسی لئے آپؐ فرماتی ہیں کہ: "سیراً سبحان لایکلم خشاشہ" کنایہ ہے اس بات سے کہ لوگوں کو اس طرح آرام اور نرمی و شفقت سے راہ حق پر لے کر چلتے کہ وہ زخمی نہ ہو جائیں۔

(۴) "ولایکل سائرہ"

(اور اس سے سیر کرنے والا نہیں ٹھکتا تھا)

اگر کسی سواری کو تیز چلایا جائے تو اس کا سوار یقیناً تھک جاتا ہے لیکن اگر آرام اور آہستہ چلائے تو نہیں تھکے گا اور اپنی منزل تک وہ آرام سے سفر کرے گا۔

(۵) "ولایمزل راکبہ"

(اور اس اونٹ حموار ہرہ تھکتا نہیں تھا)

یہ سب تشبیہات ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اگر معاشرے کی قیادت امیر المؤمنین کے ہاتھ میں ہوتی تو انسانیت کا یہ کاروان نرمی اور سکون کے ساتھ حرکت کرتا۔ اس میں خشونت اور سختی نہ ہوتی کیونکہ جبر و تشدد کے نتیجے میں لوگ تھک جاتے ہیں، حکمرانوں سے تنگ آجاتے ہیں اور حکومت و معاشرے کو درپیش مشکلات میں بے توجہی سے کام لیتے ہیں جس کے نتیجے میں حکومت اور ملت کا رابطہ دن بدن کمزور ہو جاتا ہے۔

عوام کے لئے حکومت کے چند مفید پروگرام:

۱۶) "ولاوردھم منہلا نمیرا صافیا رویا"

(اور بے شک آپ لوگوں کو ایسے صاف و شفاف اور گوارا چشمے تک لے جاتے جہاں سے وہ پیٹ بھر کر پانی پیتے) اگر کسی پیاسے قافلے کو پانی کے گھاٹ تک کوئی راہنمائی کرنا چاہے تو ممکن ہے وہ انہیں صاف و شفاف اور گوارا چشمے تک لے جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی گندے تالاب تک لے جائے۔ یہاں حضرت زہراء (ع) تشبیہ سے کام لیتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ اگر قیادت حضرت علیؑ کے ہاتھ میں ہوتی تو آپ مسلمانوں کو زندگی کے صاف و شفاف اور گوارا چشمے تک لے جاتے اور سیراب کرتے۔

"منہل" یعنی چشمہ اور ندی سے پانی لینے کی جگہ۔ "نمیر اور نمر" یعنی صاف ستھرا اور مفید پانی۔ البتہ بعض نے کہا ہے کہ "نمر" صاف اور گوارا پانی کو اور "نمیر" مفید پانی کو کہا جاتا ہے، کیونکہ ممکن ہے کبھی ایک چیز بہت خوشگوار ہو اور انسان کا جی چاہے کہ اس سے استفادہ کرے لیکن وہ مضر اور نقصان دہ ہو جبکہ بعض چیزیں ایسی ہوں کہ جن سے آپ خوش نہ ہوں لیکن آپ کے لئے مفید ہوں۔

بہر صورت حضرت فاطمہؑ فرماتی ہیں کہ: اگر امیر المؤمنین حاکم بنے تو تمہیں ایک ایسے چشمے پر لے جاتے جو "صافیا" صاف و ستھرا ہو، "رویا" اور تمہیں سیراب کر دے۔ یہاں پر حضرت علی (ع) کے پروگراموں کو گوارا، صاف اور مفید پانی سے تعبیر کیا گیا ہے:

”تطفح ضفتاہ ولا یترنق جانباہ“

(اس کے دو کنارے پانی سے بھرے ہوئے ہیں اور اس کے اطراف میں گندگی نہیں ہے)
اگر آپ کسی نہریا ندی پر جائیں تو دیکھیں گے کہ اس کے کنارے پر بدبودار پانی ٹھہرا ہوا ہے اور
اطراف میں کوڑا کرکٹ اور گندگی کا ڈھیر لگا ہوا ہے وہاں سے اگر آپ پانی لینا چاہیں تو گندگی کی آمیزش
کی وجہ سے آپ پانی نہیں لے سکتے۔

حضرت زہراء (ع) فرماتی ہیں کہ: اگر خلافت حضرت علیؑ کے حوالے کر دیتے تو وہ تمہیں ایسے چشمہ
حیات پر لے جاتے کہ جس کا پانی صاف و شفاف اور مفید ہوتا اور اس کے کنارے بھی گندے پانی
اور دوسری آلودگیوں سے پاک و صاف ہوتے۔

”تطفح ضفتاہ“ اس کے دو کنارے پانی سے بھرے ہوئے ہوتے۔ ”ولا یترنق جانباہ“ اور
اس کے دونوں اطراف آلودگی سے پاک ہوتے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ تمام تعبیریں تشبیہات ہیں گویا آپؑ کسی معاشرے کی ہدایت
اور قیادت کو پیاسے اونٹوں کے ایک ریوڑ سے تشبیہ دیتی ہیں کہ جسے کسی چشمے یا نہر کی طرف لے
جا رہے ہوں تاکہ وہاں سے یہ اونٹ اپنی پیاس بجھا سکیں۔ اور یہ شتربان کی لیاقت اور آگاہی پر منحصر
ہے کہ وہ اونٹوں کو کسی صاف اور زلال و مفید پانی کے چشمے تک لے جاتا ہے یا کسی گندے تالاب کے
آلودہ اور مضر پانی تک۔

ان فقرہوں میں حضرت زہراء (ع) یہ فرمایا نا چاہتی ہیں کہ: اگر مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور حضرت
علیؑ کے ہاتھ میں ہوتی تو معاشرے کو سختی اور خشونت کے بجائے نرمی اور آرامش کے ذریعے ایسے مقام
تک لے جاتے کہ جو ان کے لئے مفید ہوتا اور انہیں چشمہ حیات سے سیراب فرماتے جس کے بعد
معاشرے میں فقر و فاقہ، نا انصافی اور ایک دوسرے پر برتری وغیرہ کا خاتمہ ہو جاتا اور مناجیح اور وسائل کو
عدالت کے ساتھ لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔

”ولا صدر ہم بظاناً“

(اور انہیں سیراب کر کے واپس لے آتے)

”اصدرہم“ یعنی ان کو واپس لایا۔ جب سیراب ہونے کے بعد مویشیوں کو گھاٹ سے واپس لایا جاتا ہے تو عرب یہ کہتے ہیں کہ ”اصدرہم“ جبکہ مویشیوں کو گھاٹ لے جاتے وقت کہتے ہیں کہ ”اوردہم“۔ ”بطان“ شکم سیری اور معدے کے کسی چیز سے بھر جانے کو کہتے ہیں۔ اس حملے کا معنی یہ ہے کہ جب ان کے پیٹ بھر جاتے اور پانی سے سیراب ہو جاتے تو آپ انہیں واپس لے آتے۔

(۷) ”ونصح لهم سداً واعلاناً“

(اور۔ حضرت علیؑ۔ ان کو آشکارا اور پوشیدہ طور پر نصیحت فرماتے اور ان کے خیر خواہ ہوتے)

یعنی، آپؑ صرف نعرہ بازی، تقریر اور زبانی حد تک لوگوں کے خیر خواہ نہ ہوتے بلکہ جہاں آپؑ ظاہری طور پر خیر خواہ نظر آتے ہیں وہاں باطن میں بھی لوگوں کے خیر خواہ اور ان کے دلسوز ہوتے۔

بیت المال مسلمین اور حکومت،

(۸) ”ولم یکن یتحلی من الغنی بطائل“

(اور قومی خزانے سے اپنے لئے کوئی جائیداد نہ بناتے اور اپنے سرمائے میں اضافہ نہ فرماتے)

یعنی، اگر خلافت حضرت علیؑ کے ہاتھ آتی تو آپؑ بیت المال کو اپنی ذات، برادری، دوستوں اور پارٹی کے افراد کے مفاد میں استعمال نہ کرتے اور اس سے کوئی شخصی یا گروہی مفادات کے لئے استفادہ نہ فرماتے اور اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے اس سے غلط فائدہ نہ اٹھاتے۔

”یتحلی“ کی اصل ”حلو“ ہے یعنی شیریں اور میٹھا۔ جب کسی چیز سے کوئی اچھا خاصا فائدہ حاصل ہو تو ”حلی“ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ”لم یکن یتحلی“ یعنی کوئی فائدہ نہ اٹھاتے۔ ”من الغنی“ قومی سرمائے اور خزانے۔ بیت المال۔ سے۔ ”بطائل“ اپنے ذاتی مفاد کے لئے۔

(۹) ”ولا یحظی من الدنیا بنائل، غیر ری الناهل وشبۃ الکافل“

(دنیا سے کوئی استفادہ نہ فرماتے سوائے اس کے کہ پیاس مٹانے کے لئے ایک گھونٹ پانی پیتے اور یتیم کے کنفل کی

طرح بھوک مٹانے کے لئے ایک روٹی کے کھاتے)

”بھٹی“ مادہ ”حظ“ سے فعل مضارع ہے اور یہاں مقصود یہ ہے کہ دنیا سے اپنے لئے کوئی۔ مادی۔ فائدہ نہ اٹھاتے اور آپ کی روش ایسی نہ تھی کہ بیت المال مسکین سے اپنے لئے کچھ لیں یا اس سے ذاتی جائیداد بنائیں یا ذاتی مفادات کے لئے بیت المال کو استعمال کریں سوائے روٹی کے چند لقموں یا پانی کے چند گھونٹ کے کہ جس سے آپ اپنی بھوک اور پیاس ختم کر سکیں، لیکن بیت المال سے ذخیرہ اندوزی اور حاتم بخشی کا کام نہ لیتے۔

”غیر ذی الناہل“ سوائے پیاس بجھانے کے کوئی اور استفادہ نہ کرتے بالکل اس پیاسے شخص کی مانند جو کسی نہر کے کنارے پہنچ جائے اور اپنی پیاس بجھا کر وہاں سے چلا جائے۔

”وشبۃ الکافل“ ”کافل“ یعنی یتیموں کی سرپرستی کرنے والا۔ فقہی اعتبار سے۔ کفیل صرف اثنا حق رکھتا ہے کہ اگر یتیم کے لئے کوئی کام کرے اور خود فقیر ہو اور بھوکا بھی ہو تو قوت لایموت کے طور پر قناعت کے ساتھ کچھ کھا سکتا ہے تاکہ بھوک اسے نہ ستائے۔ اس حملے کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح کھن شرائط میں یتیم کا کفیل یتیم کے مال سے کچھ کھا سکتا ہے اسی طرح امیر المؤمنین بھی بیت المال سے بھوک مٹانے کے لئے ٹھورا سا استفادہ فرماتے۔ یعنی اگر خلافت حضرت علی کو ملتی اور بیت المال آپ کے ہاتھ میں آتا تو آپ معاشرے کے دوسرے افراد کی طرح معمولی سی غذا کھاتے اور بس۔ مختلف حیلے بہانے بنا کر زر اندوزی اور مال و ثروت جمع کرنے اور اپنی جائیداد میں اضافے کے بارے میں آپ سوچ بھی نہیں سکتے ہیں اس طرح بیت المال اور ملت کے قومی سرمائے کو آپ اپنی ذات اور حکومت کے مفادات پر خرچ نہ کرتے بلکہ امت کی ترقی و تکامل پر صرف فرماتے (۱)۔

اقتدار کے بھوکے اور خدمت کے شیدائی

”۱۶“ ولبان لهم الزاهد من الراغب

۱۔ جس حکومت کا سربراہ علی جیسی ہستی ہو تو اگر اس حکومت کی تقویت کی راہ میں بیت المال خرچ کرتے تو بھی عرف اور شریعت کے رو سے اس میں کوئی اشکال نہ ہوتا لیکن آپ یہ چاہتے تھے کہ مادی امکانات سے استفادہ کرنے کے سلسلے میں فقیرانہ زندگی گزاریں تاکہ قیامت تک کی انسانیت کے لئے زندہ نمونہ اور رہبر و راہنما بن سکیں۔

(ا۔ اگر حضرت علیؑ کی حکومت ہوتی تو۔ لوگوں پر واضح ہوتا کہ دنیا کی رنگینیوں سے منہ پھیرنے والا کون ہے

اور اس کی طرف رغبت رکھنے والے کون)

حضرت زہراء (ع) کے اس کلام سے شاید یہ استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دور میں حکومت وقت کے اندر بیت المال کے بارے میں اسراف اور حاتم بخشی پائی جاتی تھی، جس کی وجہ سے آپؑ اس طرف اشارہ فرماتی ہیں۔ اگرچہ رحلت رسول خدا (ص) کو چند دن ہی گزرے تھے لیکن اس کے باوجود حکمران ٹولہ بیت المال سے۔ شخصی و گردہی مفادات کی راہ میں استفادہ اور۔ اسراف کر رہا تھا۔

”لبان لهم“ تو مسلمانوں پر واضح ہوتا کہ ”الزاهد من الراغب“ دنیا کے حریص کون ہیں اور دنیا سے بے رغبت کون۔

خلافت اور چند دن کی دنیوی حکومت اور ریاست کے لئے جو لوگ دختر رسول (ص) پر ظلم کریں اور ان پر اس طرح مظالم ڈھائیں تو یہ اس بات پر ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ یہ لوگ دنیا پرست ہیں اور مقام و منصب ان کے لئے ہر چیز سے زیادہ قیمت رکھتے ہیں۔

(۱۸) ”والصادق من الكاذب“

(اور سچے سے چھوٹے کو پہچان لیتے)

اس طرح مسلمانوں کو معلوم ہوتا کہ حقیقت میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ کون لوگ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مخلص ہیں اور کون مفاد پرست، کون دنیا کے حریص ہیں اور کون دنیا سے روگردان۔

ظلم اور کفر ان نعمت:

حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا قرآن کی اس آیہ شریفہ کو بطور شاہد پیش کرتی ہیں کہ:

”ولو ان اهل القرى آمنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء والارض (۱۱)“

(اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیز گار بنتے

تو ہم ان پر آسمان و زمین کی برکتوں (کے دروازے) کھول دیتے)

”ولكن كذبوا فاخذناهم بما كانوا يكسبون (۱)“

(لیکن۔ ایمان لانے کے بجائے۔ انہوں نے۔ ہمارے پیغمبروں کو۔ جھٹلایا

تو ہم نے ان کے غلط کاموں کے بدلے میں ان کو پکڑ لیا)

سورۃ ابراہیمؑ میں خداوند تعالیٰ اپنی نعمتوں کا ذکر فرماتا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرماتا ہے کہ: ”وَاتَّكُم مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ“ (اپنی ذاتی استعداد اور صلاحیتوں کے لحاظ سے انسان کو جس چیز کی ضرورت تھی خدا نے اسے عنایت فرمائی) ”وَان تَعْبُدُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تَحْصُوهَا“ (اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننے لگو تو شمار نہ کر سکو گے)۔

یہاں ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ: پھر انسان کی زندگی میں وسائل کی یہ قلت کیوں نظر آتی ہے؟ اس سوال کا جواب خود خداوند علیم وخبیر دیتا ہے کہ: ”ان الانسان لظَلُومٌ کَفَّارٌ (۲)“ انسان کے اندر دو بری صفات ہیں ایک تو وہ بہت زیادہ ظلم کرتا ہے اور دوسری یہ کہ وہ حد سے زیادہ کفرانِ نعمت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

کفرانِ نعمت یہ ہے کہ خدا کی نعمتوں سے بہتر اور مناسب طریقے سے انسان استفادہ نہ کریں۔ مثال کے طور پر پانی ہے لیکن اس سے صحیح استفادہ نہیں کرتے۔ نہر نکال کر، بند باندھ کر، زراعت اور بجلی گھر وغیرہ کے لئے استفادہ نہیں کرتے بلکہ پانی کو ضائع ہونے دیتے ہیں۔ زمین موجود ہے، معادن بھی ہیں لیکن ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔

”ظَلُومٌ“ یعنی کچھ لوگوں کا دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالنا اور ان کے خون پینے کی کمانی سے خود استفادہ کرنا۔ پس دنیا میں جو قلت دکھائی دیتی ہے اس کی دو وجوہ ہیں: ایک انسان کا اپنے ہمنوع پر ظلم کرنا اور دوسری کفرانِ نعمت۔ اسی لئے خداوند فرماتا ہے کہ: ”ان الانسان لظَلُومٌ کَفَّارٌ“ (کہ انسان بہت بڑا ظالم اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہے)۔

پس اگر کوئی یہ پوچھے کہ اگر خداوند متعال نے انسان کی تمام ضروریات کی پوری ہیں تو یہ قلت اور

فقر وفاقہ اور غربت کیوں ہے؟ تو خدا جواب دیتا ہے کہ اس فقر وفاقہ اور بے چارگی کی وجہ تم خود ہو کیونکہ تم انسان۔ ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہو اور دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہو اور میری نعمتوں سے نامناسب اور غیر شائستہ طریقے سے استفادہ کرتے ہو۔

حضرت زہراء (ع)۔ خلافت حق کی برکات اور غضب خلافت کی حقیقت اور غلط نتائج کے بارے میں۔ اس آیہ شریفہ سے استدلال کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ: ”ولو ان اهل القرى آمنوا واتقوا لفتحنا عليهم بركات من السماء ولا رضى ولكن كذبوا فاخذناهم بما كانوا يكسبون (۱)“ (اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان اور زمین کی نعمتوں کا دروازہ ان پر کھول دیتے، لیکن ان لوگوں نے جھٹلایا ہے تو ہم نے ان کے اس کام کے بدلے میں ان کو پکڑ لیا ہے)۔ آپ قرآن سے مزید تمسک کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ:

”والذين ظلموا من هؤلاء سيصيبهم سيئات ما كسبوا“

(اور ان لوگوں میں سے جنہوں نے ظلم کیا ہے عنقریب ان کو اپنے غلط کاموں کے برے نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا) یعنی مکہ میں رہنے والا۔ یا جو شخص بھی۔ ظلم کا ارتکاب کرے اسے اپنے کاموں کے برے نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا یعنی غلط کاموں کے فطری نتائج معاشرے میں برآمد ہوں گے اور جب آگ لگتی ہے تو خشک و تر سب کو جلا دیتی ہے۔

حضرت فاطمہؑ نے اس آیت کے مضمون کی تطبیق ان لوگوں پر فرمائی ہے کہ جنہوں نے اہل بیتؑ پر ظلم کیے تھے لیکن آیت کا معنی عام ہے اور کسی خاص فرد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

”وما هم بمعجزين (۲)“

(اور اس وقت وہ کچھ نہ کر سکیں گے)

یعنی نہ وہ قہر و غضب خداوندی کو روک سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے عذاب سے فرار یا نجات کا کوئی انہیں راستہ مل سکتا ہے۔

”الاهلن فاستمع“

(آئیں اور سنیں)

اگرچہ حضرت زہراء (ع) کے سامنے جو حاضر تھے وہ سب عورتیں تھیں لیکن یہ خطاب عام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ”ہلم“ مردوں کے لئے مخصوص ہے اور عورتوں کے لئے ”ہلمن“ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض دوسرے اہل لغت کہتے ہیں کہ ”ہلم“ سے مرد و زن دونوں کو خطاب کیا جاتا ہے۔

بہر صورت یہاں حضرت زہراء (ع) عام خطاب فرماتی ہیں اور آپ کے اس خطاب میں ”خواتین اور حضرات“ سب شامل ہیں۔ یعنی سب آئیں اور سنیں، جس طرح بعض مطالب کی ابتداء میں عربی اور فارسی کتابوں میں۔ ”اعلم“ یعنی جان لو، کا لفظ لایا جاتا ہے یا صرف میرا کی ابتداء میں ”بدان ایندک اللہ“ آیا ہے۔ تو یہاں لفظ ”اعلم“ اگرچہ مذکر ہے لیکن مقصود ہر وہ انسان ہے جو اس کتاب کو پڑھے۔ اسی طرح یہاں حضرت زہراء (ع) کا مقصد بھی اس وقت کے تمام مسلمان ہیں۔

”وماعشت اراک الدھر عجبا“

(جب تک تم زندہ رہو گے زمانہ تمہیں عجیب چیزیں دکھاتا رہے گا)

یہاں پر بھی تمام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ جس طرح تم نے ہمارے ساتھ عجیب سلوک کیا ہے زمانہ تمہیں بھی تعجب انگیز اور عجیب چیزیں دکھائے گا۔ کون یہ سوچ سکتا تھا کہ ایک دن اسلام کے نام پر پیغمبر اسلام (ص) کے اہل بیت اور اس کی بیٹی کو ان بے تحاشا مظالم کا نشانہ بنایا جائے گا۔

بعض نسخوں میں ”ماعشت اراک“ کے بجائے ”ماعشتن اراکن“ ذکر ہوا ہے لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”وان تعجب فعجب قولہم“

۱۔ صرف میری گرائمر کی ایک کتاب ہے جو عربی سیکھنے والے ابتدائی طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہے اور اس میں عربی الفاظ کی بناوٹ اور گردان کے قواعد بیان کئے گئے ہیں۔

(اگر تم تعجب کرتے ہو تو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ۔ ان کی باتیں عجیب ہیں)
یہ جملہ قرآن کریم سے ماخوذ ہے اور وہاں یہ جملہ قیامت اور حشر و نشر کے منکرین کے بارے میں
نازل ہوا ہے۔

”لِيتَ شَعْرِي اِلَى اَيِّ سِنَادٍ اَسْتَنْدُوا؟“

(اے کاش میں بھی جان لیتی کہ انہوں نے کس سند کا سہارا لیا ہے اور اس پر اعتماد کئے ہوئے ہیں؟)
لوگوں نے۔ اپنے دینی و دنیوی امور میں۔ کس پر اعتماد کیا ہے اور کس پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں؟
حالانکہ علیؑ کو گوشہ نشین کر دیا ہے! پیغمبر (ص) کی عترتؑ کے ساتھ یہ۔ غیر انسانی۔ سلوک روا رکھنے کے
بعد کیوں کر دوسروں کے پیچھے چلے گئے ہیں؟ یا یہ کہ آپؐ کا مقصد یہ ہو کہ حضرت علیؑ اور اہل بیتؑ
جیسے بھروسے کے مستحکم اور قوی مقام کو چھوڑ دیا ہے اور ان کی جگہ پر وہ کونے افراد ہیں جن کو اپنے
بھروسے اور اعتماد کے لئے انتخاب کیا ہے؟

”وَالِیْ اَيِّ عِمَادٍ اَعْتَمَدُوا؟“

(اور کس ستون پر ٹیک لگائے ہوئے ہیں؟)

یہ جملہ دوسرے معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے یعنی اہل بیتؑ پیغمبر (ص) کے بعد آخر وہ
کونسا ستون اور اعتماد کا مقام ہے کہ جو قابل اعتماد و بھروسہ ہو؟

”وَبَايَةَ عُرْوَةَ تَمْسُكُوا؟“

(اور کس رسی کو تم نے پکڑا ہوا ہے؟)

یعنی کسی بھی معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک صحیح اور قابل اعتماد بھروسے کا مقام
ہو۔ لیکن ان لوگوں نے جس حکومت کو اس مقصد کے لئے بنایا ہے وہ ظلم اور تجاوز کی فراوانی کا سبب
بنے گی اگرچہ فی الحال ابوبکر اور عمر کسی حد تک ظاہرداری سے کام لے رہے ہیں لیکن کچھ عرصہ بعد معاویہ
اور یزید جیسے حکمران آئیں گے۔ اور خون کا دریا بہائیں گے۔

”وَعَلَى اَيِّ ذَرِيَّةٍ اَقْدَمُوا وَاَحْتَنَكُوا؟“

(اور کس کی اولاد کے خلاف کاروائیاں کر رہے ہیں اور نابود کر رہے ہیں؟)

”احتک“ یعنی ہلاک کرنا، نابود کر دینا۔ قرآن میں بھی شیطان کی یہ بات نقل ہوئی ہے کہ:

”لاحتکن ذریۃ الاقلیۃ (۱)“ (سوائے چند افراد کے میں آدم کی اولاد کو ہلاک اور نابود کر دوں گا)۔

حضرت زہراء (ع) یہ سوال کرتی ہیں کہ: ”وعلی ایتہ ذریۃ اقدموا واحتنکوا؟“ (کس کی اولاد کے خلاف یہ اقدام ہو رہا ہے اور ان کی نابودی کے درپے ہیں؟) کیا لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ سقیفہ کی سازش کا ہدف یہ ہے کہ پیغمبر (ص) کے اہل بیتؑ نابود کر دئے جائیں؟ کیا انہیں اہل بیتؑ کے اہداف، کمالات اور خدا کے ہاں ان کے قرب و منزلت کا علم نہیں ہے؟

”ولبنس المولیٰ ولبنس العشیر (۲)“

(کس قدر برا ہے۔ اس معاشرہ۔ کا ”مولا“ اور کس قدر برا ہے اس کے مددگار اور اس کا تعاون کرنے والے)

”مولیٰ“ یا تو اپنے مشہور معنی۔ سربراہ و سرپرست۔ میں استعمال ہوا ہے یا دوست، مدد کرنے والے

اور محبت کرنے والے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ”عشیر“ بھی دوست اور تعاون کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ پس ”مولا“ اور ”عشیر“ دونوں تکیہ گاہ کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

یہ فقرہ بھی قرآن کریم سے ماخوذ ہے اور مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے لئے برے اور غلط بھروسے کا مقام انتخاب کیا ہے (۳)۔

”وبنس للظالمین بدلاً (۴)“

(ظالموں کے لئے یہ بھروسے کا مقام بہت ہی برا مقام ہے)

یہ فقرہ بھی قرآن سے اقتباس کیا گیا ہے اور حضرت زہراء (ع) کا مقصود، سقیفہ کی بغاوت۔ ہے کہ

جہاں چند مفاد پرست لوگوں نے حضرت علیؑ کے خلاف بغاوت کی۔ اور ابوبکر کو امام اور

۱۔ سورۃ اسراء / ۴۲۔ ۲۔ سورۃ حج / ۱۳۔

۳۔ ”مولیٰ“ کے کئی معانی ہیں، منجملہ: مالک، آقا، غلام و بندہ، احسان کرنے والا، نعمت دینے والا، جس کو نعمت دی جائے، دوست، ساتھی، محب اور ہم پیمان وغیرہ۔

۴۔ سورۃ کھف / ۵۰۔

”خليفة المسلمين“ کے عنوان سے پھنوا یا۔

سقیفہ کی کاروائی کی ایک جملک۔

”استبدلوا واللہ الذنابی بالقوادم“

(خدا کی قسم! ان لوگوں نے پرندے کے اگلے پروں کو چھوڑ کر پچھلے پروں کو پکڑا ہوا ہے)

”قوادم، قادمہ“ کی جمع اور پرندے کے اگلے پروں کو کہا جاتا ہے جبکہ ”ذنابی“ پرندے کی دم کے نزدیک والے پروں کو کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حضرت امیر المؤمنینؑ اور حضرت زہراءؑ کے کلام میں کثرت سے تشبیہ اور استعارہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ پرندوں کے اچھے اور اعلیٰ پر، اس کے اگلے حصے کے بڑے پر ہوتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ شاہین کے پروں کے اگلے حصے میں دس بڑے پر ہوتے ہیں، دوسرے پرندوں کے بھی اپنی جسامت کے حساب سے پر ہوتے ہیں۔ بہر صورت پرندے اپنے پروں کے ذریعے پرواز کرتے ہیں، ان کی قدرت و طاقت بھی انہی پروں میں ہوتی ہیں اور انہی پروں کے ذریعے اپنے دفاع بھی کرتے ہیں، لیکن دم پر موجود پر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

حضرت زہراء (ع) یہاں تشبیہ دیتی ہیں کہ کسی معاشرے کا پیشرو اور بانفوذ طبقہ اگر دلیر، عاقل، تجربہ کار اور سنجیدہ ہو تو یہ افراد معاشرے کی ترقی اور تکاملی پرواز میں پرندوں کے اگلے پروں کی حیثیت رکھتے ہیں اور معاشرے کے پست اور گٹھیا قسم کے افراد پرندے کی دم کے پروں کی مانند ہیں، اس طرح آپؑ فرماتی ہیں کہ: ان لوگوں نے اچھے اور بڑے پر کو جو قدرت، شجاعت اور پرواز کا ذریعہ ہیں۔ چھوڑ کر دم کے نزدیک والے بے خاصیت پروں سے استفادہ کیا ہے!

”استبدلوا واللہ“ خدا کی قسم ان لوگوں نے بدل دیا ”الذنابی“ دم کے پاس والے بالوں سے ”بالقوادم“ بازو کے بڑے پروں کو، البتہ دوسرے جانوروں میں دم کو ”ذنب“ اور پرندوں میں ”ذنابی“ کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اگلے بڑے پروں کو دے کر جو قدرت و پرواز کا وسیلہ ہیں دم کو لے لیا ہے جو کہ

کثافت اور گندگی کی جگہ ہے۔ پست اور گٹھیا افراد کو جو اپنا کوئی ارادہ نہیں رکھتے بلکہ دوسروں کے اشاروں پر ناچتے ہیں ”ذنبانی“ کہا جاتا ہے۔ سقیفہ میں جمع ہونے والوں کے بارے آپ کی یہ تشبیہ اس لئے ہے کہ۔ ان لوگوں نے ایسی عظیم ہستیوں کو خلافت سے دور رکھا ہے جو ہر اول دستہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ شجاع تھے اور معاشرے کی ترقی و تکامل اور بلندیوں کی طرف پرداز کا ذریعہ بن سکتے تھے جبکہ ان کی جگہ پر ایسے افراد کو آگے لایا گیا ہے کہ جو پست، گٹھیا اور کردار سے عاری تھے۔ تاریخ نے بھی یہ بات وضاحت سے بیان کی ہے کہ جنگ خیر سمیت دوسری بہت ساری جنگوں میں خلیفہ اول اور دوم ہمیشہ پیچھے پیچھے رہے اور دشمن کے مقابلے میں پیچھے ہٹتے رہے، وہ جنگ و جہاد کے آدمی نہیں تھے لیکن امیر المؤمنین تمام جنگوں اور حساس مواقع پر سب سے آگے آگے رہے، آگے بڑھتے گئے اور مسلمانوں کی فتح و کامیابی اور اسلام کی ترویج و پیشرفت کا باعث بنے۔

”والعجز بالکاهل“

(اور کوہان کو چھوڑ کر دم کو پکڑا ہوا ہے)

”کاهل“ کوہان کو کہا جاتا ہے۔ اور ”کاهل القدم“ سے کسی قوم یا قبیلہ کا وہ افراد مراد ہیں جو سختیوں اور مشکلات میں لوگوں کا ملجاء اور پناہگاہ ہوں۔ ”عجز“ دم اور بدن کے آخری حصہ کو کہا جاتا ہے۔ یعنی، ان لوگوں نے مشکلات و سختیوں میں جو ان کا ملجاء اور پناہگاہ ہے اور جو ان کے کمال کا سبب ہے کو چھوڑ دیا ہے اور دم کی طرح پست اور گٹھیا انسانوں کے ساتھ ہو گئے ہیں۔

”فرغماً لمعاطس قوم يحسبون انهم يحسنون صنعا“

(خاک پہ رگڑے اس قوم کی ناک کو۔ خدا ذلیل کرے اس قوم کو۔ جو۔ فتنہ برپا کرنے کے بعد۔

یہ گمان کرنے لگی ہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں)

”معاطس، معطس“ کی جمع ہے اور اسم مکان ہے۔ عطشہ، یعنی چھینک آنے کی جگہ اور اس سے ناک

مراد ہے۔ لفظی ترجمہ یہ ہے کہ خاک پہ رگڑے اس قوم کی ناک کو جو ”يحسبون انهم يحسنون صنعا“ یہ خیال کرتی ہے کہ کوئی اچھا قدم اٹھا رہی ہے، حالانکہ انہوں نے فتنہ و آشوب برپا کیا ہے اور لوگوں کو حق

سے منحرف کر کے تاریخ اسلام میں ظلم اور انحراف کی بنیاد رکھی ہے۔
آپ قرآن کی اس آیہ شریفہ سے استناد فرماتی ہیں کہ:

”الانهم هم المفسدون ولكن لا يشعرون (۱)“

(آگاہ رہو! یہی لوگ مفسد ہیں اور یہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ مصلح ہیں۔)

”ويحسم: (۲) افعمن يهدى الى الحق احق ان يتبع ام من لا يهدى الا ان يهدى“

(افسوس ہو ان پر! دوسروں کو حق کی جانب ہدایت کرنے والے پیروی کے زیادہ حقدار ہیں؟)

یاد رہے جو خود ہدایت کے محتاج ہیں؟

یہ آیہ کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص دین کے مبانی اور احکام سے زیادہ آگاہی رکھتا ہو اور معاشرے کی راہنمائی بہتر طریقے سے کر سکے اسے معاشرے کا سربراہ اور امام ہونا چاہئے لیکن وہ افراد جو ہدایت اور امور کو درک کرنے کے اعتبار سے کمتر درجہ رکھتے ہیں اور دوسروں کی مدد اور ہدایت کی طرف محتاج ہیں تو وہ اتباع اور پیروی کے لائق نہیں ہیں۔

”فما لكم كيف تحكمون؟ (۳)“

(پس تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم کس طرح فیصلہ کرتے ہو؟)

تم اپنے ضمیر کی طرف رجوع کر دو کہ یہ کیسا فیصلہ ہے جو تم کر رہے ہو؟ حضرت علیؑ علم اور آگاہی کے لحاظ سے سب سے آگے ہیں، تو کیوں وہ خانہ نشینی پر مجبور ہو جائیں؟ اور ان کے حقوق پامال ہوں؟

مستقبل کے انحرافات کی پیش گوئی:

”اما لعمرى لقد لقحت“

(آگاہ رہو! میری جان کی قسم کہ۔ یہ حکومت جو ان لوگوں نے بنائی ہے۔ تحقیق کہ حاملہ ہو چکی ہے)

۱۔ سورۃ بقرہ / ۴۲۔

۲۔ سورۃ یوسف / ۲۵۔

۳۔ سورۃ یونس / ۳۵۔

سقیفہ میں ان لوگوں نے جو نئی حکومت بنائی ہے وہ ابھی تازہ حاملہ ہو چکی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کا بچہ کیسا ہو گا اور کس طرح کا دودھ اس سے حاصل ہو گا۔

حضرت زہراءؑ یہاں مستقبل کی طرف اشارہ فرماتی ہیں کہ امامت اور حکومت میں انحراف کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کچھ مدت گزرنے کے بعد معاویہ، یزید، بنی امیہ اور بنی عباس جیسے حکمران برسرِ اقتدار آجائیں گے اور اسلامی تعلیمات اور خود اسلام کا مذاق اڑائیں گے۔ یہاں تک کہ "ولید (۱۱)" شراب کے حوض میں تیرے گا اور اپنی کنیز کے ساتھ ہمبستری کرے گا اور اس مست کنیز کے سر پر اپنا عمامہ رکھ دے گا تاکہ وہ جا کر مسلمانوں کو نماز جماعت پڑھائے !!! اس طرح اسلام کے نام پر اسلام کی توہین اور تحریف کی یہاں تک نوبت پہنچ جائے گی !!!

"اما لعمری لقد لقحت" اس حکومت کی۔ نئی نویلی دلہن۔ حاملہ ہو چکی ہے۔

"فنظرة ريثما تنتج"

(پس انتظار کریں اور دیکھیں کہ کیا نتیجہ حاصل ہوتا ہے)

"نظرة" ممکن ہے فعل مقدر کے لئے مفعول مطلق ہو تو نصب کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کا فعل

مقدر "انظروا" تقدیر میں ہو گا۔ "ريثما" مقدار اور وقت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

سقیفہ کے بعد لوگوں کی بد حالی کی پیش گوئی:

"ثم احتلبوا ملء القعب دماً عبيطاً"

(پھر اس سے بڑے برتنوں جتنا دودھ کے بجائے خالص خون دودھ لو)

"قعب" یعنی دودھ کا کونڈا، بڑا برتن۔ "ملء القعب" یعنی برتن کا بھر جانا۔ "احتلب" دودھ دھنا۔

"عبيط" خالص کے معنی میں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ تم نے جو خلافت بنائی ہے وہ حاملہ کی طرح اپنی حاملگی کے ایام گزار رہی ہے اور جب یہ نتیجہ پر پہنچے گی اور بچہ پیدا کرے گی تو دودھ کے بجائے تازہ اور خالص

۱۔ "ولید بن عبد الملک" بنی امیہ کا ایک بادشاہ جسے ۶۸ ہجری میں حکومت ملی تھی۔

خون تمہیں دودھنا ہو گا۔

”وَذَعَا فَاْمَبِيْدًا“

(اور۔ دودھ کی جگہ۔ زہر قاتل دودھ لو)

”ذعاف“ یعنی زہر ”بید“ یعنی مہلک۔ مقصد یہ ہے کہ تم نے جو حکومت بنائی ہے اس کا آخری نتیجہ

یہی ہو گا۔

حضرت زہراء (ع) نے اپنے اس فصیح و بلیغ کلام میں صراحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے اور پیش گوئی فرمائی ہے کہ مسلمانوں کے اس پوری تاریخ اسلام کے دور میں، اسلام کے نام پر غاصب حکومتیں ان تمام فتنوں اور مظالم کا ارتکاب کریں گی اور ان تمام فتنوں کی جڑ اور ام الفساد کو، فتنہ سقیفہ قرار دیا ہے۔

”هٰنَالِكَ يَخْسِرُ الْمَبْطُلُوْنَ“

(یہاں سے اہل باطل خسارے میں ہوں گے)

”وَيَعْرِفُ التَّالُوْنَ غَيْبَ مَا اسَّسَ الْاَوَّلُوْنَ“

(آنے والی نسلیں اس کے آخری اور برے انجام اور آثار کو جان لیں گی کہ جس کی بنیاد گزشتہ نسلوں نے رکھی تھی)

سقیفہ کے بعد رونما ہونے والے فتنوں کی خبر،

”ثُمَّ طَيَّبُوا عَنْ دُنْيَاكُمْ اَنْفُسًا“

(اب جب تم اپنے مقصد کو حاصل کر چکے ہو تو۔ اپنی دنیا کی رنگینیوں۔ پر خوش رہو)

”وَاطْمَئِنُّوْا لِلْفِتْنَةِ جَاشًا“

(آنے والے فتنوں کے بارے میں مطمئن رہو)

”جاش“ یعنی دل۔ مقصد یہ ہے کہ دل سے یقین کر لو کہ تم مستقبل میں فتنوں اور بلوؤں کا شکار ہو گے۔

”وَابْشُرُوا بِسَيْفٍ صَارِمٍ“

(اور تیز دھار دالی تلواروں کی تمہیں بشارت ہو)

تم نے جو کام کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مستقبل میں ایسے سرکش حکمران آئیں گے جو اپنی تنگی تلواروں سے بے گناہ مظلوموں کا خون بہائیں گے، کسی پر رحم نہیں کریں گے، ہاں ایسا ہی ہوا کہ صرف ”حجاج بن یوسف (۱)“ نے کوفہ۔ عراق۔ میں ایک لاکھ بیس ہزار انسانوں کا خون بہایا ہے۔!

”وسطوة معتد غاشم“

(تمہیں بشارت ہو۔ ایسی مجتاز طاقت کی کہ جو ظلم و تجاوز کو اپنی انتہا تک پہنچا دے گی)۔
 ”سطوة“ یعنی طاقت و قدرت۔ ”معتد غاشم“ وہ شخص جو بے نہایت ظلم کرے۔ میں تمہیں ایک ایسے طاقتور ظالم کی بشارت دیتی ہوں جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر تمہیں شدید ترین ظلم و ستم کا نشانہ بنائے گا۔

”وبہرج شامل“

(اور تمہیں ہمہ گیر فتنہ و فساد اور آشوب کی بشارت ہو۔)

”واستبداد من الظالمین، یدع فیئکم زہیندا“

(اور ظالموں کے جبر و استبداد کی بشارت دیتی ہوں۔ جو تمہارے لئے بیت المال سے بہت ہی کم چھوڑے گا کہ جس کے حقیر ہونے کی وجہ سے کوئی اس میں رغبت نہیں کرے گا)

”وجمعکم حصیدا“

(اور تمہاری جمعیت کو کاٹ ڈالیں گے۔ تمہارا قتل عام کر دیں گے۔)

”حصید“ کٹی ہوئی فصل کو کہتے ہیں۔

حضرت فاطمہ (ع) یہ اشارہ فرمانا چاہتی ہیں کہ: بنی امیہ، بنی عباس اور دوسرے خلفاء و امراء تمہارا قتل عام کریں گے اور تمہیں اس طرح کاٹ دیں گے کہ جس طرح کسان فصل کو کاٹ دیتے ہیں۔

”فیا حسرة لکم! وانسی بکم؟“

۱۔ ”حجاج بن یوسف“ بنی امیہ کا سفاک ترین والی رہا ہے۔ اسے ۴۵ ہجری کے بعد حکومت ملی، شہر واسطہ میں ایک معروف زندان بنایا جہاں ۳۳ ہزار زندانی تھے اور اپنی حکومت کے دوران اس نے ایک لاکھ بیس ہزار لوگوں کو ”مظلہ“ کر دیا۔

(پس تم پر افسوس ہو! اور تم کہاں بھٹک رہے ہو؟)

یعنی، تم مسلمانوں کے حال اور مستقبل پر افسوس اور حسرت کرنی چاہئے۔

”وقد عمیت علیکم، انلزمکموها وانتم لها کارہون!“

(حق کی راہ اور خدا کی رحمت کے مقابلے میں تم اندھے ہو چکے ہو۔)

کیا ہم تم کو جبراً صراطِ مستقیم پر گامزن کریں حالانکہ تم اسے پسند نہیں کرتے ہو!

یہ فقرہ حضرت نوح (ع) نے اپنی قوم سے فرمایا تھا اور خداوند تعالیٰ نے قرآن میں اسے نقل کیا ہے۔

حضرت زہراء (ع) نے قرآن سے اقتباس فرمایا ہے اور ”خدا کی رحمت“ سے آپؐ کا مقصد اہل بیتؑ کی

امامت کی نعمت ہے اور سقیفہ کی بغاوت کے نتیجے میں مسلمان اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہو گئے ہیں۔

درحقیقت اہل بیتؑ کا اس بات پر اصرار تھا کہ انسانیت اس نعمت سے محروم نہ ہو لیکن کچھ مسلمان

اس بات پر آمادہ نہ تھے لہذا وہ مسلمانوں کے درمیان فتنہ و فساد اور ان کے اس نعمت سے محروم ہو جانے

کا سبب بنے (۱)۔

بستر شہادت پر آپؐ کا یہ خطبہ یہاں پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

انصار و مہاجرین کی حضرت زہراء (ع) سے عذر خواہی،

کتاب احتجاج میں، خطبہ کے اختتام پر ذیل کے چند جملے بھی نقل ہوئے ہیں کہ:

”قال سوید بن غفلة، فاعادت النساء قولها علی رجالہن“

سوید بن غفلة۔ جو اس روایت کا راوی ہے۔ کہتا ہے کہ انصار و مہاجرین کی عورتوں نے حضرت

زہراءؑ کی باتوں کو اپنے مردوں تک پہنچایا۔

۱۔ آپؐ کے قوم نوحؑ سے مربوط آیت سے استفادہ فرمانے کی مناسبت اور شہادت یہ ہے کہ جس طرح سوائے چند افراد کے طوفان

اور عذابِ نوحؑ کی ساری قوم پر نازل ہوا تھا اسی طرح سقیفہ کی وجہ سے ہونے والے فتنوں نے بھی تمام مسلمانوں کو اپنی پلیٹ میں

لے لیا ہے۔

”وجاء اليها قوم من وجوه المهاجرين والانصار معتذرين“
(اور انصار و مہاجرین کے بزرگوں کا ایک گروہ عذر خواہی کے لئے آپؐ کے پاس آیا۔)

”فقالوا، يا سيدة النساء لو كان ابو الحسن ذكر لنا هذا الامر، قبل ان نبرم العهد ونحكم العقد، لماعد لنا الى غيرة!“

(اور کہنے لگے کہ: اے عورتوں کی سردار! ابوبکر کے ساتھ مضبوط عہد و پیمان باندھنے اور اس کی بیعت کرنے سے پہلے اگر ابوالحسن۔ علیؑ۔ اس سلسلے میں ہم سے بات کرتے تو ہم ان کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف ہرگز نہ جاتے!) یعنی وقت گزر چکا ہے۔ اور ہم آپؐ اور علیؑ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم نے ابوبکر کی بیعت کر لی ہے اور اس کے ساتھ عہد و پیمان باندھ چکے ہیں لہذا شرعی طور پر اب عہد اور بیعت کو نہیں توڑ سکتے! اور اے پامال نہیں کر سکتے لیکن علیؑ (ع) اگر پہلے ہمارے پاس آتے اور یہی باتیں بتاتے تو ہم ان کو ہرگز تنہا نہ چھوڑتے اور ابوبکر کی بیعت نہ کرتے!!

”فقلت، اليكم عنى، فلا عذر بعد تعذيركم ولا امر بعد تقصيركم“
(تو آپؐ نے فرمایا کہ: دور ہو جاؤ، تمہاری اس ریاکارانہ معذرت خواہی کے بعد کوئی عذر باقی نہیں رہ جاتا اور نہ ہی تمہاری اس کوتاہی۔ اور جرم۔ کے بعد کوئی کام بن سکتا ہے)

”تعذیر“ ریاکارانہ اور غیر صادقانہ عذر خواہی کو کہا جاتا ہے۔ یعنی۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ تم نے کوتاہی کی ہے، جرم کا ارتکاب کیا ہے، علیؑ کو خانہ نشینی پر مجبور کر دیا ہے۔ رسول خدا (ص) کے اہل بیتؑ کی شان میں گستاخی کی ہے، جس گھر میں جبرئیل بھی بغیر اجازت داخل نہیں ہوتا تھا، ابوبکر کی حکومت نے تمہاری پشت پناہی میں اے آگ لگائی ہے! ان تمام خیانتوں کے مرتکب ہونے اور حالات کے کنٹرول سے باہر ہو جانے کے بعد آئے ہو اور اب عذر خواہی کرتے ہو!! (۱)۔

۱۔ مہاجرین اور انصار کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ: اگرچہ بغرض محال وہ اپنے دعوے اور عذر خواہی میں بچے بھی ہوں اور جھوٹ کا ارادہ نہ رکھتے ہوں پھر بھی وہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے پر تیار نہ تھے بلکہ دہچاہتے تھے کہ ابوبکر کی حمایت کرنے پر اس کی ==

== توجیہ کریں اس طرح کہ علیؑ نے خلافت کے بارے میں ہم سے بات کرنے سے پہلے ہی ہم نے ابو بکر کی بیعت کی ہے اور مضبوط عہد و پیمان باندھا ہے اور اب ہم نقض بیعت نہیں کر سکتے لہذا۔۔۔ اگرچہ منطوق اور استدلال اور اصول و معیار کے اعتبار سے حضرت علیؑ خلافت کے حقدار ہیں لیکن چونکہ ہم نے ابو بکر کی بیعت کی ہے اور ابھی نقض بیعت نہیں کرنا چاہئے۔۔۔ ہم ابو بکر کا ساتھ دیں گے! حالانکہ ابو بکر کی بیعت ہی سرے سے باطل تھی کیونکہ عندیر غم میں رسول خدا (ص) نے علیؑ کی امامت اور خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور آپؐ کو امامت پر منصوب فرمایا تھا۔۔۔ نیز سب نے وہاں بیعت بھی کی تھی اسی لئے آپؐ فرماتی ہیں کہ تمہاری اس خیانت کے بعد خلافت اب واپس نہیں مل سکتی اور تمہاری یہ ریاکارانہ عذر خواہی قابل قبول نہیں ہے۔۔۔

وصلی اللہ علی محمد وآل محمد (ص)

حصہ سوئم:

⊖ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام

کی زبانی،

غصب فدک کی کہانی

پندرہواں درس:

- ✽ روایت کی سند
- ✽ صادق آل محمد (ع) فرماتے ہیں
- ✽ ابوبکر سے حضرت زہراء (ع) کا احتجاج
- ✽ فدک، امامت کی نشانی
- ✽ فدک اور امّ ایمن کی گواہی
- ✽ فدک اور حضرت علی (ع) کا ابوبکر کی سرزنش کرنا
- ✽ ابوبکر کے مقابلے میں حضرت علی (ع) کا استدلال

عَنْ حَمَادِ بْنِ عُمَانَ، عَنْ أَبِي عَبْدِ اللَّهِ عليه السلام، قَالَ:
لَمَّا بُويعَ أَبُو بَكْرٍ وَاسْتَقَامَ لَهُ الْأَمْرُ عَلَى جَمِيعِ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ، بَعَثَ
إِلَى قَدْكَ مَنْ أَخْرَجَ وَكَيْلَ فَاطِمَةَ بِنْتِ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وآله مِنْهَا؛ فَجَاءَتْ فَاطِمَةُ
الزَّهْرَاءُ عليها السلام إِلَى أَبِي بَكْرٍ، ثُمَّ قَالَتْ: لِمَ تَمْنَعُنِي مِيرَاثِي مِنْ أَبِي رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وآله وَ
أَخْرَجْتَ وَكَيْلِي مِنْ قَدْكَ وَقَدْ جَعَلَهَا لِي رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وآله بِأَمْرِ اللَّهِ تَعَالَى؟
فَقَالَ لَهَا: هَاتِي عَلَى ذَلِكَ بِشُهودٍ.

فَجَاءَتْ بِأَمِّ أَيْمَنَ؛ فَقَالَتْ لَهُ أُمُّ أَيْمَنَ: لَا أَشْهَدُ يَا أَبَا بَكْرٍ حَتَّى أُحْتَجَّ
عَلَيْكَ بِمَا قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وآله، أَنْشُدُكَ بِاللَّهِ، أَلَسْتُ تَعْلَمُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صلى الله عليه وآله قَالَ: «أُمُّ
أَيْمَنَ إِمْرَأَةٌ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ؟» فَقَالَ: بَلَى، قَالَتْ: «فَأَشْهَدُ أَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ أَوْحَى
إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وآله «فَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ» فَجَعَلَ قَدْكَ لِفَاطِمَةَ عليها السلام بِأَمْرِ اللَّهِ
تَعَالَى».

فَجَاءَ عَلِيُّ عليه السلام فَشَهِدَ بِمِثْلِ ذَلِكَ، فَكَتَبَ لَهَا كِتَابًا وَدَفَعَهُ إِلَيْهَا؛ فَدَخَلَ عُمَرُ
فَقَالَ: مَا هَذَا الْكِتَابُ؟ فَقَالَ: إِنَّ فَاطِمَةَ عليها السلام إِدْعَتْ فِي قَدْكَ، وَشَهِدَتْ لَهَا أُمُّ
أَيْمَنَ وَ عَلِيُّ عليه السلام، فَكَتَبْتُ لَهَا؛ فَأَخَذَ عُمَرُ الْكِتَابَ مِنْ فَاطِمَةَ عليها السلام فَتَفَلَّ فِيهِ وَمَرَّقَهُ!!
وَقَالَ: هَذَا فِي الْمُسْلِمِينَ؛ وَقَالَ: أَوْسُ بْنُ الْحَدَثَانِ وَغَايِشَةُ وَحَفْصَةُ يَشْهَدُونَ
عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وآله بِأَنَّهُ قَالَ: «إِنَّا مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ لَا نُورِثُ وَ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ»؛ فَإِنَّ
عَلِيًّا زَوْجَهَا يَجْرُ إِلَى نَفْسِهِ وَ أُمُّ أَيْمَنَ فَهِيَ إِمْرَأَةٌ ضَالِحَةٌ، لَوْ كَانَ مَعَهَا غَيْرُهَا
لَنَظَرْنَا فِيهِ.

فَخَرَجَتْ فَاطِمَةُ عليها السلام مِنْ عِنْدِهِمَا بَاكِةً حَزِينَةً وَ هِيَ تَقُولُ: مَرَّقَ اللَّهُ بَطْنَكَ
كَمَا مَرَّقْتَ كِتَابِي هَذَا.

فَلَمَّا كَانَ بَعْدَ ذَلِكَ جَاءَ عَلِيٌّ عليه السلام إِلَى أَبِي بَكْرٍ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ وَخَوْلَهُ
الْمُهَاجِرُونَ وَالْأَنْصَارُ، فَقَالَ: يَا أَبَا بَكْرٍ! لِمَ مَنَعْتَ فَاطِمَةَ مِيرَاثِهَا مِنْ
رَسُولِ اللَّهِ ﷺ؟ وَقَدْ مَلَكَتْهُ فِي حَيَاةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ.

فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: هَذَا فَنَاءٌ لِلْمُسْلِمِينَ، فَإِنْ أَقَامَتْ شُهوداً أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ
جَعَلَهَا لَهَا وَإِلَّا فَلَا حَقَّ لَهَا فِيهِ.

فَقَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عليه السلام: يَا أَبَا بَكْرٍ! أَتَحْكُمُ فِينَا بِخِلَافِ حُكْمِ اللَّهِ تَعَالَى
فِي الْمُسْلِمِينَ؟ قَالَ: لَا؛ قَالَ: فَإِنْ كَانَ فِي يَدِ الْمُسْلِمِينَ شَيْءٌ يَمْلِكُونَهُ، ثُمَّ ادَّعَيْتُ
أَنَا فِيهِ، مَنْ تَسْأَلُ الْبَيِّنَةَ؟ قَالَ: إِيَّاكَ كُنْتُ أَسْأَلُ الْبَيِّنَةَ، قَالَ: فَمَا بَالُ فَاطِمَةَ سَأَلْتُهَا
الْبَيِّنَةَ عَلَى مَا فِي يَدِهَا؟ وَقَدْ مَلَكَتْهُ فِي حَيَاةِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَبَعْدَهُ، وَلَمْ تَسْأَلِ
الْمُسْلِمِينَ بَيِّنَةً عَلَى مَا ادَّعَوْهُ شُهوداً، كَمَا سَأَلْتَنِي عَلَى مَا ادَّعَيْتُ عَلَيْهِمْ؟ فَسَكَتَ
أَبُو بَكْرٍ؛ فَقَالَ عُمَرُ: يَا عَلِيُّ! دَعْنَا مِنْ كَلَامِكَ، فَإِنَّا لَنَقْوَى عَلَى حُجَّتِكَ! فَإِنْ
أَتَيْتَ بِشُهَدٍ عُدُولٍ، وَإِلَّا فَهُوَ فَنَاءٌ لِلْمُسْلِمِينَ لِحَقِّ لَكَ وَلَا لِفَاطِمَةَ فِيهِ!!



بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

اب تک حضرت زہراء (ع) کے دو خطبہ ہم نے پڑھے ہیں کہ جنہیں آپؑ نے مسجد نبوی (ص) اور شہادت کے موقع پر بیان فرمایا تھا۔ اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ فدک کے بارے میں امام جعفر صادق (ع) سے معتبر کتابوں میں جو روایت نقل ہوئی ہے اسے برادران و خواہران کے سامنے پیش کر دوں تاکہ انشاء اللہ اس سے بہتر طور پر استفادہ کر سکیں۔

روایت کی سند:

آیہ شریفہ ”فَاتِذَا الْقُرْبَىٰ حَقُّهُ (۱)“ کی تفسیر میں ”علی بن ابراہیم قمی“ نے اپنے والد سے ایک روایت نقل کی ہے جو فدک اور حضرت زہراءؑ سے مربوط ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ”علی بن ابراہیم قمی“ راویوں کے آٹھویں طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور مرحوم کلینی کے اساتذہ میں سے ہیں اور مرحوم کلینی نویں طبقے سے شمار ہوتے ہیں (۲) اور کلینی نے علی بن

۱۔ سورہ روم / ۳۸۔

۲۔ علم رجال میں راویوں کو رسول خداؐ سے حدیث نقل کرنے اور خود ان کی اوسط عمر کے اعتبار سے مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا طبقہ، اصحاب رسولؐ، دوسرا طبقہ تابعین، تیسرا طبقہ تبع تابعین... اسی ترتیب سے ہر راوی اور حدیث نقل کرنے والا ایک خاص طبقے میں داخل ہوتا ہے اور اس سے تعلق رکھتا ہے۔

ابراہیم قمیؒ سے کافی روایات نقل کی ہیں۔ یہ بزرگوار امام حسن العسکری (ع) کے دور کے راویوں میں سے تھے اور وہ قم کے شیخان نامی قبرستان میں مدفون ہیں۔ شاہ کے دور میں ان کے مقبرے کو منہدم کرنا چاہتے تھے لیکن حضرت آیت اللہ العظمیٰ بروجردیؒ وہاں تشریف لے گئے اور فاتحہ پڑھا جس کی وجہ سے حکومت ڈر گئی اور اسے خراب نہ کیا۔

علی بن ابراہیمؒ نے اس روایت کو اپنے والد "ابراہیم بن ہاشم" سے نقل کیا ہے۔ ابراہیم بن ہاشم پہلے کوفہ میں رہتے تھے اور بعد میں وہ قم آگئے۔ وہ پہلا شخص ہے جو کوفہ میں شیعوں کے ہاں قابل قبول روایات قم میں لایا ہے اور اس کی تردید کی ہے۔ قم والوں نے بھی ان روایات کو عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

ابراہیم بن ہاشم نے جو طبقہ ہفتم کے راوی ہیں، "ابن ابی عمیر" سے یہ روایت کی ہے۔ ابن ابی عمیر طبقہ ششم کے راوی اور اصحاب اجماع کے بزرگوں میں سے ایک ہیں (۱) لہذا یہاں تک روایت کی سند درست ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیمؒ میں سند کو جاری رکھتے ہوئے اس طرح نقل کیا ہے کہ: "عن عثمان بن عیسیٰ وحماد بن عثمان..." عثمان بن عیسیٰ مذہب کے اعتبار سے واقفی اور طبقہ ششم کا راوی ہے جو ابن ابی عمیرؒ کے ساتھ راویوں کے طبقے میں شریک ہے۔ علم رجال کے علماء کا کہنا ہے کہ اس نے حضرت امام کاظم (ع) اور امام رضا (ع) سے روایات نقل کی ہیں اور یہ فرقہ واقفیہ کے بزرگوں میں سے تھے (۲)۔

۱۔ حدیث کے راویوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کے بارے میں علماء رجال کا کہنا ہے کہ اگر کسی حدیث کی سند ان اشخاص تک درست ہو تو ان کے بعد معصوم تک کے درمیان میں جتنے بھی راوی ہوں وہ قابل اعتماد ہیں۔ اگرچہ وہ راوی ہمارے لئے مجہول ہی کیوں نہ ہوں۔ اس قسم کے اشخاص کو علم رجال کی اصطلاح میں "اصحاب اجماع" کہا جاتا ہے البتہ بعض کا کہنا ہے کہ "اصحاب اجماع" کا مطلب یہ ہے کہ یہی افراد خود قابل اعتماد ہیں لیکن ان افراد اور معصوم کے درمیان جو وسائل ہیں ان کا بھی قابل اعتماد ہونا مقصود نہیں ہے۔ ہر صورت "اصحاب اجماع" ۱۸ افراد ہیں کہ علم رجال کی کتابوں میں ان کے نام موجود ہیں۔

۲۔ واقفیہ وہ لوگ ہیں جو امام موسیٰ کاظمؑ تک، اماموں کو ملتے ہیں اور ساتویں امام کے بعد ائمہ کی امامت کو قبول نہیں کرتے۔

اس کے باوجود علماء رجال کا کہنا ہے کہ عثمان بن عیسیٰ موثق (۱) ہے اور اس کی روایت قابل قبول ہے۔

(فرقہ واقفیہ کا پس منظر ۱)

علی بن ابی حمزہ بطنی، زیاد قندی اور عثمان بن عیسیٰ، حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام کے وکیل تھے جب امام کاظم علیہ السلام شہید ہوئے تو ان کے پاس امام سے مربوط کافی رقم موجود تھی، ان تینوں افراد نے چاہا کہ یہ بھاری رقم امام رضا علیہ السلام کے حوالے نہ کریں لہذا یہ کہنے لگے کہ حضرت امام کاظمؑ شہید نہیں ہوئے ہیں بلکہ وہ پردہ غیب میں موجود ہیں اور وہ دوبارہ ظہور کریں گے۔ اس طرح انہوں نے وہ رقم ہڑپ کر لی۔

یہاں جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ: صرف اسی ایک روایت کے علاوہ ایسی کوئی اور روایت دکھائی نہیں دیتی جو اس (عثمان بن عیسیٰ) نے امام صادقؑ سے نقل کی ہو۔ دراصل یہاں ایک مشکل ہے اور وہ یہ کہ: یہ شخص طبقہ ششم کا راوی ہے جبکہ امام صادقؑ سے روایت نقل کرنے والے راوی کو طبقہ پنجم کا راوی ہونا چاہیے۔ اگر عثمان بن عیسیٰ کے واقفی ہونے کو نظر انداز بھی کر دیں تو دوسری مشکل یہی ہے کہ وہ طبقہ ششم کے راوی ہیں جو امام صادقؑ کے ہم عصر نہیں، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ ہم عصر نہیں تو اس نے کس طرح امام سے یہ روایت نقل کی ہے؟۔

۔۔ اب آئیں۔۔ حماد بن عثمان کی طرف، چونکہ تفسیر علی بن ابراہیمؑ میں اس طرح منقول ہے کہ: "عن عثمان بن عیسیٰ وحماد بن عثمان..."۔۔ یہ شخص ذو طبقہ تین ہے یعنی اس کا شمار دونوں طبقہ کے راویوں میں سے ہوتا ہے اور یہ امام صادق اور امام کاظم علیہما السلام دونوں سے روایت نقل کر سکتا ہے۔ بہر صورت یہ احتمال درست نظر آتا ہے کہ اصل میں عبارت کچھ اس طرح ہو کہ: "عن عثمان بن

۱۔ موثق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے امور سے قطع نظر، حدیث نقل کرنے میں راوی امانت داری سے کام لیتا ہو اور جھوٹ نہ بولتا ہو۔

عیسیٰ عن حماد بن عثمان عن ابی عبد اللہؑ، یعنی، عثمان بن عیسیٰ نے حماد بن عثمان سے اور اس نے ابی عبد اللہ امام صادقؑ سے روایت نقل کی ہو۔ اگر ہم اس طرح کہیں تو سند درست ہوتی ہے کہ طبقہ ششم کے عثمان بن عیسیٰ نے روایت طبقہ پنجم کے راوی حماد بن عثمان سے سنی اور اس نے امام صادقؑ سے۔ لہذا متن میں جو آیا ہے کہ "عن عثمان بن عیسیٰ وحماد بن عثمان" یعنی عثمان بن عیسیٰ اور حماد بن عثمان دونوں نے امام صادقؑ سے یہ روایت نقل کی ہے، درست نظر نہیں آتا۔ بلکہ بات وہی درست ہے جو اس سلسلے میں ابھی ہم نے بیان کی ہے۔

بہر صورت روایت کی سند درست ہے، کیونکہ روایت کو علی ابن ابراہیمؑ نے اپنے والد ابراہیم بن ہاشمؑ سے اس نے ابن ابی عمیرؑ اس نے حماد بن عثمان اور اس نے امام صادقؑ سے نقل کی ہے۔ پس عثمان بن عیسیٰ، سند میں موجود ہو یا نہ ہو روایت کی سند میں کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ابن ابی عمیر طبقہ ششم کا راوی ہے اس نے طبقہ پنجم کے حماد بن عثمان سے بھی روایت نقل کی ہے۔ لہذا سند کو عثمان بن عیسیٰ کے ہونے یا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے۔

اس روایت کو معمولی سے فرق کے ساتھ "احتجاج طبرسی" اور "تفسیر علی بن ابراہیم قمی" دونوں نے نقل کیا ہے۔ ممکن ہے یہ روایت احتجاج طبرسی میں تفسیر علی بن ابراہیم سے نقل ہوئی ہو یا شاید کسی دوسری کتاب سے نقل کی ہو اور یہ معمولی سا فرق نسخوں کے باہمی اختلاف کا نتیجہ ہو، لیکن دونوں کتابوں میں روایت کے اکثر مطالب یکساں ہیں۔

صادق آل محمد علیہ السلام فرماتے ہیں،

"عن ابی عبد اللہؑ قال،

لما بویع ابو بکر واستقام له الامر علی جمیع المهاجرین والانصار"

(امام صادقؑ نے فرمایا کہ:

جب ابو بکر کی بیعت ہو چکی اور تمام مہاجرین و انصار پر اس کی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں)

”امر“ عموماً حکومت کے لئے بولا جاتا ہے۔ ذیل کی قرآنی آیت میں بھی ”امر“ سے حکومت مراد ہے کہ: ”وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۱)“ اور حضرت علیؓ کے اس کلام میں بھی ”امر“ سے مراد حکومت ہے کہ: ”فَلَمَّا نَهَضَتْ بِالْأَمْرِ نَكْثَتْ طَائِفَةٌ وَمَرَقَتْ آخَرُی (۲)“ (جب میں نے حکومت سنبھالی تو ایک گروہ نے بیعت توڑی تو دوسرا دین سے خارج ہو گیا)۔

امام صادقؑ بھی یہاں فرماتے ہیں کہ: جب ابوبکرؓ کی بیعت ہو چکی اور ”امر“ یعنی حکومتی امور اس کے لئے مستحکم ہو گئے اور جب تمام مسلمانوں پر اس کی حکومت قائم ہو گئی تو:

”بَعَثَ إِلَى فِدْكَ مِنْ أَخْرَجَ وَكَیْلَ فَاطِمَةَ بِنْتَ رَسُولِ اللَّهِ (ص) مِنْهَا“

(اس نے ایک شخص کو فدک روانہ کیا تاکہ وہ حضرت فاطمہؑ (ع) کے نمائندے کو وہاں سے نکال دے) اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فدک میں حضرت فاطمہؑ کی طرف سے نمائندے متعین تھے اور اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ رسول مقبول (ص) کی حیات طیبہ سے ہی فدک حضرت فاطمہؑ کے اختیار میں تھا۔ ورنہ یہ بعید ہے کہ رسول خدا (ص) کی وفات کے بعد ان بحرانی شرائط اور مشکل حالات میں اتنی جلدی۔ دس دن کے اندر اندر۔ وہاں کوئی وکیل یا نمائندہ بھیجا گیا ہو (۳)۔

فدک حجاز میں ایک باغ اور بستی کا نام ہے جو مدینہ سے تین روز کے فاصلے یعنی تین منزل۔ تقریباً ۲۴ فرسخ۔ کی مسافت پر واقع تھا۔ البتہ بعض روایت کے مطابق وہاں ایک چشمہ بھی تھا جہاں سے پانی نکلتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ: ابوبکر جو خلیفہ مسلمین بن چکا ہے اور بظاہر تمام امور اس کے کنٹرول میں ہیں

۱۔ سورۃ آل عمران / ۱۵۹ (یعنی ۱۔ اے ہمارے حبیب۔ حکومت کے امور میں ان سے مشورہ کیا کر)۔

۲۔ نَجِّ الْبَلَاءِ خطبہ ۳ خطبہ شقیہ۔

۳۔ اسی روایت میں دو مورد پر حضرت امیر المؤمنینؑ فدک کے بارے میں ابوبکرؓ سے احتجاج کرتے ہوئے تصریح فرماتے ہیں کہ پیغمبر خداؐ نے اپنی زندگی میں فدک کو حضرت زہراءؑ کی ملکیت قرار دیا تھا اسی طرح حضرت زہراءؑ نے ابوبکرؓ کے ساتھ اپنی گفتگو میں بھی فرمایا تھا کہ: ”وَقَدْ جَعَلَنِي رَسُولُ اللَّهِ (ص)“ اس جملے کا مطلب بھی یہی ہے کہ رسول خداؐ نے اپنی زندگی میں فدک آپؐ کو بخشا تھا۔ مسجد میں آپؐ کے خطبہ میں بھی ”نَحْلَةُ أَبِي“ کا لفظ مذکور ہے کہ جس کا معنی ”میرے بابا کی بخشش اور ہبہ“ ہے۔

اچانک اس نے یہ کیے سوچا کہ حضرت زہراءؑ سے فدک کو غصب کر لیا جائے؟ البتہ اس سوال کا جواب واضح ہے کہ: حضرت علیؑ اور امامت کے گھرانے کے لئے فدک درآمد کا ایک اہم ترین ذریعہ تھا اور جب تک ان کے ہاتھ میں درآمد کا یہ ذریعہ ہوگا، بعض لوگ ان بے وابستہ رہیں گے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کے لئے خطرہ بن جائے۔ ابوبکر اور عمر بھی یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؑ اور حضرت زہراءؑ کے مقام کو معاشرے میں ممکنہ حد تک کم کر دیا جائے اور ان کو کمزور کر دیا جائے تاکہ وہ کبھی بھی حکومت کے خلاف مبارزہ کرنے کی طاقت اور قدرت پیدا نہ کریں۔ یہ وہ سبب تھا کہ جس کی بنا پر ابوبکر خلافت پر قابض ہونے۔ اور مدینے میں بیعت مہم کو سر کرنے۔ کے بعد فوراً فدک کی طرف اپنے ہر کارے بھیج دیتا ہے تاکہ فدک سے حضرت زہراءؑ کے اہل کاروں کو نکال دیا جائے۔ ”بعث الی فدک من اخدج وکیل فاطمة بنت رسول اللہ (ص) منہا“۔

”منہا“ میں ”ہاء“ مؤنث کی ضمیر ہے یہاں یہ ضمیر اس لئے ذکر ہوئی ہے کہ اس کا مرجع قریہ ہے۔ یعنی فدک کی بستی۔ قریہ چونکہ عربی میں مؤنث مجازی ہے اس لئے ضمیر بھی مؤنث ہی کی لائی گئی ہے۔

ابوبکر سے حضرت زہراءؑ (ع) کا احتجاج،

”فجاءت فاطمة الزہراء (ع) الی ابی بکر“

(پس حضرت فاطمہ زہراء (ع) ابوبکر کے پاس آئیں)

”ثم قالت، لم تمنعنی میراثی من ابی رسول اللہ (ص) واخرجت وکیلی من فدک؟“

(اور فرمایا کہ: اے ابوبکر! مجھے میرے باپ رسول خدا (ص) کی میراث سے کیوں محروم کیا ہے اور فدک سے میرے

نمائندے کو کیوں نکال باہر کیا ہے؟)

حضرت فاطمہؑ بیان فرماتی ہیں ”میراثی“ اور فدک کو میراث سے تعبیر فرماتی ہیں جبکہ بعد والے

فقرے میں فرماتی ہیں کہ: ”وقد جعلها لى رسول اللہ (ص) بامر اللہ تعالیٰ“ یعنی خداوند کے حکم سے

رسول اکرم (ع) نے فدک کو میری ملکیت قرار دیا تھا۔ اس طرح ان دو فقروں میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے۔

کیونکہ رسول خدا (ص) کی رحلت کے بعد ملنے والی چیز ارث ہے جبکہ آپؐ فرماتی ہیں کہ: رسول خدا (ص) کی زندگی میں ہی خدا کے حکم سے مجھے فدک دیا گیا تھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ: یہاں میراث سے اصطلاحی میراث مراد نہیں جو کسی کی وفات کے بعد اس کے ورثہ کو منتقل ہوتی ہے، بلکہ یہاں میراث اپنے کلی اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتی ہے جس کے مطابق ہر اس چیز کو میراث کہا جاتا ہے جو باپ، دادا سے انسان کو ملے، چاہے ان کی زندگی میں یا وفات کے بعد، اور اسی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ فلاں کو ہوشیاری اور ذہانت اپنے باپ سے وراثت میں ملی ہے، حالانکہ یہ وراثت اس کو باپ کی زندگی میں ہی ملی ہے۔

”وقد جعلها لى رسول الله (ص) بامر الله تعالى“

(حالانکہ رسول خدا (ص) نے خدائے بزرگ و برتر کے حکم سے فدک کو میری ملکیت قرار دیا تھا)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ارث سے اصطلاحی ارث مراد نہیں کیونکہ حضرت زہراءؑ کوئی العیاذ باللہ غلط اور بیسودہ بات نہیں فرما سکتیں بنا بریں اگرچہ والد گرامی کی زندگی میں ہی کیوں نہ ملا ہو۔ اسے ارث کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت فاطمہؑ نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ: دراصل خدا کے حکم اور رحمت للعالمین (ص) کے توسط سے فدک مجھے دیا جا چکا تھا۔ فریقین نے بہت ساری روایات نقل کی ہیں کہ جب ”فآت ذا القربىٰ حقہ“ والی آیت نازل ہوئی تو رسول مقبول (ص) نے جبریل سے وضاحت چاہی کہ ”ذا القربىٰ“ سے مراد کون ہیں؟ اور جبریل نے جواب میں کہا کہ اس سے مراد حضرت زہراءؑ ہیں اور آنحضرت (ص) نے حضرت فاطمہؑ کو بلا کر فدک ان کے حوالے کر دیا (۱)۔

۱۔ تفسیر در المنثور میں آیا ہے کہ، ”بزاز، ابو یعلیٰ، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابی سعید خدری سے نقل کیا ہے کہ، ”جب سورہ اسراء کی آیت ۲۶ نازل ہوئی تو رسول خداؐ نے فدک حضرت زہراءؑ کو بخشا“۔ اسی واقعے کو ابن مردویہ نے ابن عباس سے بھی نقل کیا ہے۔ مذکورہ آیت کے بارے میں جبریل سے وضاحت طلب کرنے کا واقعہ، کتاب وسائل الشیعہ میں انفال باب ۱ حدیث ۵، کافی ج ۱ ص ۵۳۳ حدیث ۵ میں بھی مذکور ہے۔ بحار الانوار طبع قدیم ج ۸ ص ۹۳ میں بھی اس آیہ شریفہ کی تفسیر میں متعدد سندوں کے ذریعے بہت ساری روایات نقل ہوئی ہیں۔

فدک، امامت کی نشانی:

آپ بارہا مجھ سے یہ سن چکے ہیں کہ کمیونسٹ اور بعض دوسرے لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ فدک کی بڑی آمدنی تھی اور پیغمبر اکرم (ص) مسلمانوں کے بیت المال میں بڑی احتیاط سے تصرف فرماتے تھے اور بارہا اپنے اہل بیت کو سادہ زیستی کی سفارش فرماتی تھی، تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ رسول خدا (ص) فدک جیسی کثیر آمدنی والی بستی، حضرت زہراءؑ کو دے دیں جبکہ مہاجرین اور انصار کی اکثریت اور اصحاب صفہ اور دوسروں کی معاشی حالت بہت ہی خراب تھی؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فدک کا امامت کے مسئلے کے ساتھ گہرا ربط تھا، اس طرح کہ جب رسول خدا (ص) نے مولا علیؑ کو اپنا جانشین بنایا تو آپ (ص) یہ بھی چاہتے تھے کہ خاندان امامت کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ بھی ہونا چاہئے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اگر فدک جیسے آمدنی کے ذریعے کو حضرت علیؑ کے حوالے کر دیں تو ان سے بہ آسانی غصب کیا جاسکتا تھا لیکن اگر اسے فاطمہؑ کو دے دیں تو پیغمبر (ص) کی اکلوتی بیٹی سے چھینتے ہوئے انہیں شرم آئے گی! اگر بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھین بھی لیں تو ان کی حقیقت کا پول کھل جائے گا کہ کس طرح ان لوگوں نے یادگار رسالت (ص) کے حق میں جسارت کی ہے اور ان کا پاس نہیں رکھا ہے! پس رسول خدا (ص) کی یہ پالیسی تھی کہ فدک، حضرت زہراءؑ کو دیں اور اس طرح آپ (ص) چاہتے تھے کہ حضرت علیؑ اور حضرت زہراءؑ خالی ہاتھ نہ رہیں اور امامت کا گھرانہ محتاج نہ رہے۔ دراصل حضرت فاطمہؑ امامت و ولایت کے محور کے طور پر ایسے مقام پر تھیں کہ ان کو فدک بخشنے کا مطلب یہ تھا کہ گویا یہ امامت و ولایت کو بخشا گیا ہے۔ ہمارے اس موقف کی (فدک کے امامت کے ساتھ گہرے ربط ہونے کی) تائید میں بہت سی صحیح اور معتبر روایات موجود ہیں، منجملہ یہ روایت کہ: "ایک دن ہارون الرشید نے امام موسیٰ کاظمؑ سے عرض کیا کہ: آپ فدک کے حدود اربعہ کو معین کریں تاکہ اسے واپس کیا جائے! آپؑ نے پہلے اس بات کو قبول نہیں فرمایا چونکہ آپؑ جانتے تھے کہ اگر فدک کے حدود اربعہ کا تعین کریں تو وہ اسے واپس نہیں کرے گا، لیکن ہارون الرشید نے کافی اصرار کیا تو آپؑ نے اس وقت کی اسلامی ریاست کے حدود اربعہ کو فدک

کے حدود اربعہ کے عنوان سے معین فرمایا، تو بارون کھنے لگا کہ: واہ! معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ فدک کے عنوان سے۔ خلافت طلب کر رہے ہیں (۱)۔

خلاصہ یہ کہ یہ سارے قرائن اس بات پر گواہ ہیں کہ فدک کا مسئلہ صرف ایک مالی اور معاشی مسئلہ نہیں تھا بلکہ ایک اہم اور سیاسی مسئلہ تھا جو امامت اور حضرت امیر المؤمنینؑ کی خلافت کے ساتھ گہرا ربط رکھتا تھا (۲)۔

۱۔ مناقب ج ۳ ص ۴۳۵۔

۲۔ چند ضروری نکات کی یاد دہانی۔

۱۔ کتاب شریف سفینۃ البحار میں ج ۲ ص ۳۵۱ پر فدک کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے کہ: ”ایک روایت کے مطابق فدک کی سالانہ آمدنی ۲۴ ہزار دینار اور دوسری روایت کے مطابق ۶۰ ہزار دینار تھی۔“

۲۔ مجمع البحرین میں بھی فدک کے حدود اربعہ کے بارے میں حضرت علیؑ سے ایک روایت نقل ہوئی ہے جہاں فدک کا حدود اربعہ اس طرح معین ہوا ہے: ایک طرف احد کی پہاڑی، دوسری حد، عریش مصر ہے کہ جو احتملاً سینا کے علاقے میں مصر کے ایک شہر کا نام تھا، تیسری حد سیف البحر، بحر احمر یا بحر خزر اور آرمنیا ہے، چوتھی حد دوسرہ الجندل ہے کہ احتملاً جو کوڑہ اور شام کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے جہاں حکمت کا واقعہ بھی رونما ہوا تھا۔

۳۔ علامہ مجلسیؒ: بحار الانوار میں طبع قدیم ج ۸ ص ۴۸ پر اس اشکال کا جواب دیتے ہیں کہ: ”حضرت زہراءؑ اتنے زہد اور دنیا سے بے رغبتی کے باوجود آخر فدک کے بارے میں اس قدر اصرار کیوں فرماتی تھیں؟ یہاں تک کہ آپؑ مسجد میں ایک بھرے مجمع سے خطاب بھی فرماتی ہیں۔ یعنی آپؑ کے زہد اور اس اقدام میں تضاد ہے اگر تضاد نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ علامہ مجلسیؒ اس سوال کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ: فدک صرف حضرت زہراءؑ کی ملکیت نہیں تھا بلکہ ان کی اولاد ائمہ اطہارؑ سے متعلق تھا اور یقیناً ایک ایسی چیز میں کوتاہی اور سہل انگاری جو تمام اہل بیتؑ سے مربوط ہو جائز نہ تھی، کیونکہ اگر سہل انگاری اور کوتاہی فرمائیں تو ان کے حقوق پامال ہوتے۔۔۔“

۴۔ ابن ابی الحدید نے بھی ”علی بن تقیؑ“ نامی ایک شیعہ عالم دین سے یہ کلام نقل کیا ہے کہ: ”حضرت فاطمہؑ سے فدک غصب کرنے کی صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ ہے کہ ابوبکر اور عمرؓ نہیں چاہتے تھے کہ حضرت علیؑ فدک کی آمدنی کو ان کی خلافت و حاکمیت کے خلاف جہاد و مبارزہ میں خرچ کریں“ (احتجاج، مطبع نشر مرتضیٰ ج ۱ ص ۹۱)۔

اسی سلسلے میں شہید صدرؒ نے اپنی کتاب فدک ص ۴۷ پر ابن ابی الحدید سے اس کی شرح نہج البلاغہ ج ۴ ص ۸۰ سے یہ بات نقل کی ہے کہ: ”اگرچہ حضرت زہراءؑ نے ابوبکر کو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ فدک کی آمدنی کو ہم تمام مسلمین کی مصلحت اور منفعت عامہ پر خرچ کریں گے لیکن ابوبکر مطمئن نہیں تھا اور ڈرتا تھا کہ کہیں فدک کی آمدنی ان کی حکومت کے خلاف استعمال نہ ہو۔“

= اسی طرح ابن ابی الحدید نج السبلانہ پر اپنی شرح کی ج ۱۲ ص ۲۸۴ پر رقمطراز ہے کہ: "بغداد کے مدرسہ عربیہ کے ایک معلم اور خود میرے اپنے استاد "علی بن الفارقی" سے میں نے پوچھا کہ: آپ کے نزدیک فدک کے بارے میں حضرت فاطمہؑ کا دعویٰ صحیح تھا یا نہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ: ہاں فاطمہؑ اپنے دعویٰ میں سچی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ: پھر ابو بکرؓ نے فدک کو انہیں واپس کیوں نہیں کیا؟ میرے جواب میں مسکراتے ہوئے انہوں نے ایک باریک نکتہ بتایا کہ: اگر اس دن ابو بکرؓ فدک کو واپس دے دیتا تو دوسرے دن حضرت زہراءؑ آئیں اور خلافت کے واپس کرنے کا دعویٰ بھی کر عیں تو اس صورت میں ابو بکرؓ کے پاس کوئی عذر اور دلیل نہ ہوتی۔ کہ خلافت سے دست بردار نہ ہو۔ کیونکہ فدک کے بارے میں وہ حضرت زہراءؑ کی صداقت و سچائی کو قبول کر چکے ہوتے۔ لہذا خلافت کے مسئلے میں بھی ان کی بات حجت ہوتی اور انہیں ماننا پڑتا تھا۔

ابن ابی الحدید کہتا ہے کہ استاد کی یہ بات درست اور حقیقت پر مبنی ہے اگرچہ انہوں نے اسے مزاحیہ انداز میں بتایا تھا۔ ۱۵۔ اس بارے میں کہ فدک کا مسئلہ ایک اہم سیاسی مسئلہ تھا، شہید صدر طاب ثراہ اپنی کتاب "فدک" کے صفحہ ۴۹ پر لکھتے ہیں کہ: "حضرت زہراءؑ کا فدک کے مسئلے کو اہمیت دے کر اس بارے میں جدوجہد کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ دراصل فدک کا مسئلہ، اسلام اور کفر، ایمان اور منافقت، نیز نص اور شوریٰ کے درمیان محاذ آرائی کا کرشمہ تھا۔"

اور اسی کتاب کے صفحہ ۴۳ اور ۴۸ پر انہوں نے "فدک کو ایک عظیم مقصد اور ہمہ گیر انقلاب کی علامت اور رمز کے طور پر متعارف کرایا ہے اور ایسا ہمہ گیر انقلاب اور وہ بھی ایسی حکومت کے خلاف جس کی بنیاد سقیفہ میں ابو بکرؓ، عمر اور ابو عبیدہ جراح کی تین نفری پارٹی نے رکھی تھی اور صفحہ ۵۰ پر فرماتے ہیں کہ "اگر حضرت زہراءؑ کا مقصد یہ ہوتا کہ میراث یا سبہ کے عنوان سے زمین کے ایک ٹکڑے کو حاصل کیا جائے تو گواہی کے نصاب کو مکمل کرنے کے لئے آپؑ حضرت علیؑ کے طرفدار اور شیعوں میں سے مطلوبہ افراد پیدا کر سکتے تھے لیکن آپؑ کا مقصد کچھ اور تھا۔"

اسی بنا پر آپؑ نے اپنی کتاب کے ص ۸۷ پر تاکید کی ہے کہ "حضرت فاطمہؑ نے حکومت کے خلاف جو تحریک چلائی، وہ چھ مرحلوں پر مشتمل تھی:

۱۔ ابو بکرؓ کے پاس اپنا نمائندہ بھیجنا تاکہ فدک سمیت اپنی میراث کا مطالبہ کریں اور سبہ کے طور پر دعویٰ دائر کرنے سے قبل ارث کے عنوان سے مطالبہ فرمایا۔

۲۔ آپؑ کا اس مسئلے میں خود بلا واسطہ دخالت کرنا اور ابو بکرؓ کے ساتھ سخت لہجے سے بات کرنا۔

۳۔ رسول خداؐ کی رحلت کے دسویں دن مسجد نبویؐ میں معروف خطبہ دینا۔

۴۔ انصار اور مہاجرین کی عورتوں سے خطاب کرنا۔

۵۔ بستر شہادت پر ابو بکرؓ اور عمرؓ سے غضبناک لہجہ میں گفتگو کرنا۔ جب وہ آپؑ کی عیادت اور آپؑ سے عذر خواہی کے لئے آئے تھے

تو آپؑ نے اپنی ناراضگی اور غم اور غصہ سے انہیں آگاہ فرمایا۔ =

۱۶۔ آپ کی یہ وصیت کہ شہادت کے بعد تجہیز و تکفین و تدفین میں مخالفین کو شرکت کی اجازت نہ دینا اور یہ کہ آپ ان کی شرکت کرنے پر راضی نہیں ہیں۔

اس تحریک کا آغاز حضرت علیؑ کے بجائے حضرت زہراءؑ نے فرمایا۔ اس امر کی علت بیان کرتے ہوئے شہید صدرؒ اپنی کتاب "فدک" کے ص ۸۶ پر یوں فرماتے ہیں کہ: "حضرت زہراءؑ نے جو اس قیام کا آغاز فرمایا اس کے بنیادی طور پر دو مثبت اور اہم عنصر تھے، ایک اس تحریک کے احساسات اور جذبات سے مربوط عنصر تھا کیونکہ آپؑ پیغمبرؐ کی یادگار اور اکلوتی بیٹی ہونے کے لحاظ سے لوگوں کے احساسات و جذبات کو بہتر اور بیشتر بیدار کر سکتی تھیں اور ذہنوں میں رسول خداؐ کے دور کی یاد تازہ کرنے میں بڑا کردار ادا کر سکتی تھیں اور دوسرا عنصر، اس واقعے کا سیاسی پہلو تھا کیونکہ اگر حضرت زہراءؑ کے بجائے حضرت علیؑ سلمے آتے اور تحریک چلاتے تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ مسلمان خانہ جنگی کا شکار ہو جائیں اور حکومت وقت سے مقابلہ کرنے میں مسلمانہ جہاد شروع ہو جائے اس طرح داخلی خلفشار کا شکار ہو کر مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے۔"

حضرت علیؑ نے مسند خلافت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد فدک کے مسئلے کو نہیں چھیڑا، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ فدک کے نام پر جو تحریک چلی تھی وہ اس لئے تھی کہ حکومت اور اقتدار کو اس کے صحیح حقدار تک منتقل کیا جائے جب اقتدار اور حکومت اپنی حقیقی منزل پر پہنچ جائیں تو اس سلسلے میں مزید تحریک چلانا بے معنی نظر آتا ہے۔

۱۶۔ ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ جب امیر المؤمنینؑ کو خلافت ملی تو آپؑ نے فدک اہل بیتؑ کو واپس کیوں نہیں کیا حالانکہ عمر بن عبد العزیز اور مامون جیسے خلفاء نے فدک بنی ہاشم کو واپس کر دیا تھا؟ اس سوال کے کئی جواب دئے گئے ہیں:

۱۔ قاضی القضاۃ نے "کتاب مغنی" میں کہا ہے کہ "حضرت علیؑ کے اپنے دور حکومت میں فدک کو واپس نہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ نے ابوبکر کے سلمے حضرت فاطمہؑ کے احتجاج میں گواہی نہیں دی تھی۔ اگر وہاں پر گواہی دی ہوتی تو آپؑ پر لازم ہوتا کہ اپنے علم پر عمل کرتے ہوئے بعد میں فدک کو واپس لیں۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱۲ ص ۱۲۷۰)۔

لیکن شیعہ اور سنی منہاج و ماخذ کے مطابق قاضی القضاۃ کا یہ دعویٰ باطل ہے کیونکہ ان منہاج و ماخذ میں حضرت علیؑ اور ام ایمن کی گواہی کا ذکر موجود ہے جو انہوں نے حضرت زہراءؑ کے حق میں دی تھی اور یہ قابل انکار نہیں ہے۔

۲۔ علامہ مجلسیؑ نے بحار الانوار طبع قدیم ج ۸ ص ۱۳۱ پر ایک مستقل باب میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے اور اس باب کی ابتداء میں ایسی روایات کو نقل کیا ہے کہ جو امیر المؤمنینؑ کے دور حکومت میں فدک دوبارہ واپس نہ لینے کی وجوہات بیان کرتی ہیں۔ بعض روایات میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ "چونکہ خدا نے ظالم اور مظلوم کو اپنے اعمال کا بدلہ دیا ہے لہذا حضرت علیؑ نے فدک کے بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہا..."

بعض دوسری روایات میں آیا ہے کہ "ائمہ طاہرینؑ، عوام کے حقوق کے لئے قیام فرماتے ہیں لیکن اپنے ذاتی حقوق کے لئے کوشش نہیں فرماتے" اس کے بعد علامہ مجلسیؑ قاضی القضاۃ کا یہ کلام نقل فرماتے ہیں کہ "شیعوں کے نزدیک امیر المؤمنینؑ کے فدک واپس نہ لینے کی وجہ شاید تقیہ ہو" اور پھر اس نے تقیہ اور اس مقام پر تقیہ کے امکان پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

فدک اور ام ایمن کی گواہی۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا ہے کہ حضرت زہراء (ع) نے ابو بکر سے فرمایا کہ: "خدا کے حکم سے میرے بابا نے مجھے جو چیز بخشی تھی اسے تم نے مجھ سے کیوں چھینا ہے؟"

حضرت زہراء (ع) کے اس اعتراض کے جواب میں ابو بکر کہنے لگا کہ:

لیکن اس مورد میں تقیہ کا احتمال بہت بعید ہے، کیونکہ امیر المؤمنینؑ کے دور حکومت میں معاویہ کے علاوہ کوئی قابل توجہ طاقت موجود نہ تھی سوائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ چونکہ ابو بکر اور عمر کا فدک کے غصب میں ہاتھ تھا اور آپؑ اسی میں مصطوب دیکھتے تھے کہ ابو بکر اور عمر نے جو امور طے کئے تھے ان میں سے بعض میں ان کی مخالفت نہ کی جائے، اسی بنا پر آپؑ نے ان کے بہت سارے احکام اور پالیسیوں کو نہیں بدلا۔ کتب "شافی" میں مرحوم سید مرتضیٰؒ نے فدک واپس نہ لینے کی علت، اسی امر کو قرار دیا ہے۔

۳۱۔ غیر احتمال یہ ہے جو شہید صدرؒ اور علامہ مجلسیؒ اور استاد معظم (آیت اللہ منتظری مدظلہ) کے فدک کے بارے میں نظریے سے معلوم ہوتا ہے کہ فدک اہل بیتؑ سے مربوط تھا اور رسول خداؐ نے حضرت زہراءؑ کو فدک اس لئے عنایت فرمایا تھا کہ اہل بیتؑ خالی ہاتھ نہ رہیں اور خلافت و امامت کے مسئلے میں اہل بیتؑ کی معاشی حالت مستحکم ہو جائے اور فدک کی آمدنی کے ذریعے سے اہل بیتؑ اپنے حق کو حاصل کرنے کی راہ میں پائیداری کے ساتھ مقاومت کر سکیں۔ بنا بریں جب حضرت امیر المؤمنینؑ کے ہاتھوں خلافت آگئی تو فدک کے مسئلے کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہ تھی۔ پہلے فدک کے مسئلے کو اس لئے اٹھایا تھا کہ اس کے ذریعے امامت و خلافت کو بھی اپنے اصل مقام تک لایا جائے اور جب خلافت اور قیادت آپؑ کی چوکھٹ پر آگئی تو فدک کا مسئلہ اٹھانے کی کوئی وجہ ہی نہیں رہی تھی۔

۳۲۔ خلاصہ یہ کہ امیر المؤمنینؑ نے اپنے دور حکومت میں فدک کو واپس کیوں نہ نہیں لیا؟ اس سوال کے جواب میں ذیل کی چند وجوہات بیان کی گئی ہیں:

۱۔ قاضی القضاۃ نے کہا کہ فدک اہل بیتؑ کا حق نہ تھا بلکہ ابو بکر کا موقف صحیح تھا۔

۲۔ ظلم و ستم کے ذریعے چھینا گیا تھا لہذا اس کا حسب خدا پر چھوڑ دیا گیا ہے اور حضرت علیؑ نے مداخلت نہ کی۔

۳۔ تقیہ کی وجہ سے واپس نہ لیا۔

۴۔ بعض مصنفین کی بنا پر فدک کے مسئلے میں ابو بکر کے فیصلے کو برقرار رکھا جیسا کہ اسی بنا پر خلفاء کے بعض دوسرے امور بھی برقرار رہے۔

۵۔ فدک اپنی کوئی ذاتی حیثیت نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ خلافت اور قیادت کے مسئلے میں احقاق حق کا ایک ذریعہ تھا اور اہل بیتؑ کے حق رہبری کا ایک حصہ تھا جب خلافت و حکومت حضرت علیؑ کے ہاتھ آگئی تو فدک کا اختیار بھی آپؑ کے ہاتھ میں تھا اور واپس کرنے کا کوئی معنی نہ تھا کیونکہ اگر واپس بھی کرتے تو بھی آپؑ کے اختیار میں ہوتا۔

” فقال لها ابو بكر، هات علي ذلك بشهود“

(تو ابو بکر نے آپؐ سے کہا کہ: اپنے اس دعوے پر گواہ لائیں)

اگر فدک، ترکہ پیغمبر (م) ہوتا تو یہاں گواہی طلب کرنا ایک نامعقول سی بات تھی، جبکہ یہاں حضرت زہراءؑ نے گواہ پیش کئے۔ اور یہ نہیں فرمایا کہ ارث میں گواہ کی ضرورت نہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ارث سے یہاں اس کا اصطلاحی معنی مراد نہیں ہے۔

” فجاءت بام ايمن“

(آپ (ع) نے ام ایمن کو گواہ کے طور پر پیش کیا)

ام ایمن، ایک کنیز تھی جو پیغمبر (م) کو ملی تھی اور آپ (م) نے خدا کی راہ میں اسے آزاد فرمایا تھا۔ یہ خاتون رسول خدا (م) سے بہت عقیدت رکھتی تھی اور رسول خدا (م) بھی اس پر بہت مہربان تھے، اس کا اصلی نام ”برکہ“ اور اس کی ماں کا نام ”سلمہ“ تھا۔ واقعاً ام ایمن بابرکت خاتون تھیں۔

”برکہ“ (ام ایمن) نے بعد میں ”عبید خزرجی“ سے شادی کی اور اس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ”ایمن“ رکھا گیا۔ اسی مناسبت سے ”برکہ“ کو ”ام ایمن“ کہا جانے لگا۔ کچھ مدت کے بعد اس کا شوہر مر گیا اور ایک دن پیغمبر اکرم (م) نے فرمایا کہ جو شخص ایک ایسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے کہ جو سو فیصد اہل بہشت ہو تو وہ ”ام ایمن“ سے شادی کر لے۔ اس وقت ”زید بن حارثہ“ نے ”ام ایمن“ سے شادی کی اور اس شادی سے ”اسامہ بن زید“ پیدا ہوا۔

”ام ایمن“ ایک وفا شعار خاتون تھیں۔ اسے قرآن کی کافی آیات حفظ تھیں اور وہ جنگوں میں شرکت کرنے کا شوق رکھتی تھیں اسی لئے وہ جنگ بدر اور احد میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور مجاہدین کو پانی پلاتی تھیں۔

مختصر یہ کہ انہوں نے اسلام کی کافی خدمت کی اور رسول خدا (م) کے بعد حضرت امیر المؤمنینؑ اور حضرت زہراءؑ کے وفادار عقیدت مندوں میں سے شمار ہوتی تھیں۔

حضرت زہراء (ع) نے اس عظیم خاتون کو گواہ کے لئے پیش فرمایا:

” فقالت له ام ايمن، لا اشهد يا ابابكر حتى احتج عليك بما قال رسول الله (ص)“

(ام ايمن نے ابوبکر سے کہا کہ: اے ابوبکر میں تیرے سامنے اس وقت تک گواہی نہیں دوں گی

جب تک کہ میں اپنے بارے میں رسول خدا (ع) کے فرمان سے احتجاج نہ کروں)

” انشدك بالله، الست تعلم ان رسول الله (ص) قال: ام ايمن امراة من اهل الجنة؟“

(اے ابوبکر تجھے خدا کی قسم! کیا تو نہیں جانتا کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا کہ:

ام ايمن اہل بہشت خواتین میں سے ہے؟)

” فقال: بلى“

(تو اس نے کہا کہ: ہاں۔ جانتا ہوں۔)

دراصل ام ايمن یہ بتانا چاہتی تھیں۔ اور ساتھ ہی ابوبکر سے اس حقیقت کا اقرار لینا چاہتی تھیں۔

کہ جو شخص اہل بہشت سے ہو وہ ہرگز جھوٹ نہیں بولتا اور ابھی جو گواہی دے رہی ہوں وہ سچ اور عین حقیقت بات ہے۔

” قالت، فاشهد ان الله عز وجل اوحى الى رسول الله (ص)، ”فأت ذا القربى حقہ (۱)“

فجعل فداً لفاطمة (ع) بأمر الله تعالى“

(ام ايمن نے کہا کہ: پس میں گواہی دیتی ہوں کہ بے شک خداوند بزرگ و برتر نے اپنے رسول پر وحی نازل کی کہ:

”قربى رشتہ داروں کے حق کو ادا کر“

۔ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ تو رسول خدا (ص) نے خدا کے حکم سے فدک کو فاطمہ (ع) کی ملکیت قرار دیا)

” فجاء على (ع) فشهد بمثل ذلك“

(اس کے بعد حضرت علی (ع) تشریف لائے اور ام ايمن کی طرح گواہی دی)

یعنی، حضرت علی نے بھی ام ايمن کی طرح یہ گواہی دی کہ آیہ ”فأت ذا القربى حقہ“ نازل ہوئی تو

رسول خدا (ص) نے فدک حضرت زہراءؑ کو بخشا۔

”فكتب لها كتاباً ودفعه اليها“

(اس گواہی کے نتیجے میں ابوبکر نے حضرت زہراء (ع) کے لئے ایک تحریر لکھی اور فدک کو واپس کر دیا) مختصر یہ کہ: جب ابوبکر نے دیکھا کہ علیؑ اور ام ایمن جیسے دو عادل گواہوں نے گواہی دے دی ہے تو وہ مان گیا اور سند لکھ کر فدک کو حضرت زہراءؑ کے حوالہ کر دیا۔

”فدخل عمر، فقال: ما هذا الكتاب؟“

(اچانک عمر داخل ہوا اور کہا کہ: یہ تحریر کیا ہے؟)

”فقال: ان فاطمة (ع) اذعت في فدك وشهدت لها ام ايمن وعلی (ع) فكتبته لها“

(ابوبکر نے جواب میں کہا کہ: فاطمہؑ نے فدک پر دعویٰ کیا ہے اور ام ایمنؑ اور علیؑ نے گواہی دی ہے لہذا میں نے یہ سند ان کے لئے لکھی ہے۔ اور فدک کو انہیں واپس دے دیا ہے۔)

”فاخذ عمر الكتاب من فاطمة (ع) فتفل فيه ومزقه“ وقال هذا فيء للمسلمين“

(تو عمر نے وہ تحریر حضرت فاطمہؑ سے چھین لی اور اس پر تھوکا اور اسے پھاڑ دیا!!!)

اور کہا کہ: یہ فدک۔ فئی مسلمان ہے!! (۱۱)

”وقال: اوس بن الحدثان وعائشة وحفصة يشهدون على رسول الله (ص) بانه قال:

انا معاشر الانبياء لا نورث وما تركناه صدقة (۲)“

اور اس نے کہا کہ: اوس بن حدثان، عائشہ اور حفصہ گواہی دیتے ہیں کہ رسول خدا (ص) نے فرمایا:

”ہم گردہ انبیاء ارث نہیں چھوڑتے اور جو کچھ ہم چھوڑ کے جاتے ہیں وہ صدقہ ہے“

”فان علياً زوجها يجر الى نفسه وام ايمن امرأة سالحة، لو كان معها غيرها لنظرنا فيه“ (۳)

۱۔ فئی کا معنی صفحہ ۳۵۲ پر بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ گزشتہ دروس میں ثابت ہو چکا کہ یہ روایت جعلی اور من گھڑت ہے۔

۳۔ ”وقال هذا فيء للمسلمين“ کی عبارت سے لے کر یہاں تک احتجاج میں ذکر نہیں ہوا ہے بلکہ روایت کا یہ حصہ تفسیر علی بن ابراہیمؒ میں ج ۲ ص ۱۵۵ پر مذکور ہے نیز بعد والا جملہ ”فخرجت فاطمة من عندهما باكية حزينة“ میں ”عندهما“ اور ”حزينة“ کے دو الفاظ احتجاج طبری میں ذکر نہیں ہوئے ہیں۔

(بے شک علیؑ فاطمہؑ کا شوہر ہے وہ اپنے مفاد میں گواہی دے رہا ہے جبکہ ام ایمن ایک نیک عورت ہے اگر اس کے

ساتھ کوئی دوسرا شخص گواہی دے تو ہم اس بارے میں سوچتے !!!)

”فخرجت من عندھما بکیۃ حزینۃ“

(تو آپ (ع) ابوبکر اور عمر کے یہاں سے گریہ اور حزن کی حالت میں واپس ہوئیں)

”وہی تقول، مرق اللہ بطنک کما مرق کتابی ہذا“

(آپ (ع) اس گریہ اور حزن کی حالت میں عمر سے یہ فرماتے ہوئے نکلیں کہ: جس طرح تم نے میری اس تحریر کو

پھاڑا، خدا تمہارے شکم کو پھاڑے)

کئی سالوں کے بعد آپؑ کی یہ دعا مستجاب ہوئی، اس سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ ضروری نہیں

دعا فوراً مستجاب ہو جائے کیونکہ کبھی مصلحت اسی میں ہوتی ہے کہ کسی خاص وقت میں دعا مستجاب

ہو جائے۔

فدک اور حضرت علی (ع) کا ابوبکر کی سرزنش کرنا،

”فلما کان بعد ذلک، جاء علی (ع) الی ابوبکر و هو فی المسجد و حوالہ المهاجروں والانصار“

(اس واقعہ کے بعد)

جب حضرت علیؑ ابوبکر کے پاس آئے، حالانکہ ابوبکر مسجد میں انصار و مہاجرین کے حلقے میں بیٹھا ہوا تھا)

”فقال، یا ابابکر!“

لم منعت فاطمة میراثہا من رسول اللہ (ص) وقد ملکته فی حیاۃ رسول اللہ (ص)؟“

(تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ: اے ابوبکر!

رسول خدا (ص) کی میراث سے فاطمہ (ع) کو کیوں روکا، حالانکہ خود رسول خدا (ص) کی زندگی میں وہ اس کی مالک تھیں؟)

یہاں حضرت علیؑ پہلے ارث کی بات کرتے ہیں لیکن بلافاصلہ فرماتے ہیں کہ رسول خدا (ص) کی

زندگی میں ہی حضرت فاطمہؑ فدک کی مالک تھیں، آپؑ کے اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ارث کا معنی

صرف ارث اصطلاحی نہیں بلکہ ہر وہ چیز ہے جو باپ کی طرف سے اولاد کو ملے خواہ وہ باپ کی زندگی میں ہی کیوں نہ ہو اور فدک اسی قسم کا ارث ہے یعنی رسول خدا (س) نے خدا کے حکم سے اپنی زندگی میں حضرت زہراءؑ کو عنایت فرمایا۔ اسی لئے بعض لوگوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ حضرت فاطمہؑ نے ارث کا ذکر مجادلہ کے طور پر فرمایا ہے کہ اگر تم فدک کے بہہ ہونے کو تسلیم نہیں کرتے ہو تو میرا ارث کے عنوان سے بھی میرا حق بتانا ہے، کیونکہ ارث کا جو معنی ہم نے ابھی ذکر کیا ہے، بہہ اور عطاء کے منافی نہیں ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو جب ہم مسجد میں آپؑ کے خطبہ کو پڑھ رہے تھے تو وہاں ہم نے دیکھا کہ آپؑ نے ارث کے مسئلے کو کافی اہمیت دی اور اس پر زور دیا تھا اور جب واپس آئیں تو حضرت علیؑ سے فرمایا کہ: ”نحلة ابی وبلغه ابنی“ (یعنی میرے بابا کی بخشش اور بہہ اور میرے بچوں کا وسیلہ معاش یہ لوگ ہم سے چھین رہے ہیں) اس طرح یہاں پر فدک کو بہہ اور ”نحلة“ سے تعبیر فرمایا۔ یہاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زہراءؑ کے نزدیک بھی ارث ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو باپ کی طرف سے اولاد کو ملے اگرچہ ان کی زندگی میں ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دراصل ارث کا معنی یہ ہے کہ: ”ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہونے والی چیز، اگرچہ وہ پہلی نسل کی زندگی میں ہی کیوں نہ ملے۔“

”فقال ابو بکر، هذا فیء للمسلمین“

(تو ابو بکر نے جواب دیا کہ: فدک فئی مسلمان ہے!)

یہاں ابو بکر وہی بات کر رہا ہے جو عمر نے اسے سکھائی تھی اسی لئے وہ بھی اب کہتا ہے کہ فدک فئی مسلمان ہے ورنہ ابو بکر نے تو خود پہلے سند لکھ دی تھی اور دستخط بھی کر دیے تھے کہ فدک حضرت زہراءؑ کا حق ہے، لیکن جب عمر نے آکر کہا کہ فدک فئی مسلمان ہے تو اس کے بعد اب ابو بکر بھی یہی کہتا ہے!!!۔

حقیقت یہ تھی کہ ابو بکر کو عمر چلاتا تھا سقیفہ میں بھی عمر نے ہی ابو بکر کو خلیفہ بنایا تھا چونکہ وہاں خود عمر کے لئے خلافت کی راہ ہموار نہ تھی لہذا ملی بھگت کے ذریعے پہلے سقیفہ میں ابو بکر کا انتخاب عمل میں

لایا گیا، اسی لئے ابوبکر نے بعد میں عمر کو خلیفہ بنایا۔ اسی لئے حضرت امیر المؤمنینؓ خطبہ فقہیہ میں فرماتے ہیں کہ: ”لشد ما تشظراً ضرعیہا (۱)“ (ان دونوں نے حکومت کے دو تھنوں کو اپنے درمیان تقسیم کر لیا تھا)۔

بہر صورت ابوبکر ابھی یہ بتا رہا ہے کہ فدک فنی مسلمین ہے۔ ”فنی“ لغت میں رجوع کرنے اور پلٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب ”ولایت الفقہ“ میں بھی بتایا ہے کہ فنی اس لئے کہا جاتا ہے کہ روی زمین کی نعمتوں کو خدا نے اپنے نیک بندوں کے لئے پیدا کیا ہے لیکن ناجائز طریقوں سے کفار کے ہاتھوں لگی ہوئی ہیں اب اگر جنگ کے ذریعے یا کفار اپنے اختیار سے وہ نعمتیں مسلمانوں کو لوٹا دیں تو گویا حق، حقدار کو مل گیا ہے اور اپنے صحیح مقام پر پلٹ آیا ہے اور قرآن میں بھی خداوند اسی معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے کہ: ”وما افاء اللہ علیٰ رسولہ من اهل القریٰ (۲)“ (وہ اموال جنہیں خدا نے بستی والوں کے مال سے اپنے رسول (ص) کی طرف لوٹایا ہے)۔ اس آیت میں بھی یہی مقصود ہے کہ کفار و مشرکین کے پاس جو مال ہے وہ گویا ان کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا ہے۔ اب جنگی غنائم یا صلح کے نتیجے میں جو مال رسول خدا (ص) کے ہاتھ لگے وہ دراصل اپنا مال تھا جو لوٹا دیا گیا ہے۔

”فان اقامت شہود ان رسول اللہ جعلہ لہا والا فلاح حق لہافیہ“

(۱) ابوبکر نے کہا کہ یہ فنی مسلمین ہے۔

اگر فاطمہ (ع) گواہ پیش کریں کہ رسول خدا (ص) نے فدک ان کو بخشا ہے۔ تو فدک واپس کریں گے۔

ورنہ فدک پر فاطمہ (ع) کا کوئی حق نہیں!!

گویا ابوبکر یہ کہنا چاہتا ہے کہ حضرت زہراء (ع) نے جو گواہ پیش کئے تھے وہ کافی نہیں ہیں یہاں پر حضرت علیؓ ابوبکر کی اس باطل سوچ کا دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

ابوبکر کے مقابلے میں حضرت علی (ع) کا استدلال،

”فقال امیر المؤمنین (ع) یا ابابکر! اتحکم فینا بخلاف حکم اللہ تعالیٰ فی المسلمین؟“

(اس وقت حضرت امیر المؤمنین (ع) نے ابوبکر سے فرمایا کہ:

اے ابوبکر! مسلمانوں کے درمیان خدا کے حکم کے برعکس تم ہمارے بارے میں حکم کرتے ہو؟)

”فقال لا“ (تو اس نے کہا کہ: نہیں)

”قال فان کان فی ید المسلمین شیء یملکونہ ثم اذ عیت انا فیہ، من تسال البینۃ؟“

(حضرت امیر المؤمنین (ع) نے پوچھا کہ:

اگر کسی مسلمان کے قبضے میں کوئی چیز ہو جس کا وہ مالک ہو اور میں اس پر دعویٰ کروں،

تو تم کس سے گواہی طلب کرو گے؟)

”قال، ایاک کنت اسئل البینۃ“

(ابوبکر نے کہا کہ: میں تو صرف آپ سے گواہی اور دلیل طلب کروں گا۔ چونکہ آپ مدعی ہیں۔)

”قال، فما بال فاطمة (ع) سالتہا البینۃ علی ما فی یدیہا؟“

(حضرت علی (ع) نے پوچھا کہ:

تو پھر کیا وجہ ہے تم فاطمہ (ع) سے ایسی چیز کے بارے میں گواہی طلب کر رہے ہو جو ان کے قبضے میں ہے؟)

”وقد ملکته فی حیاۃ رسول اللہ (ص) وبعدہ، ولم تسال المسلمین بینۃ علی ما اذ عولہ شہوداً،

کما سالتنی علی ما اذ عیت علیہم؟“

(حالانکہ پیغمبر خدا (ص) کی زندگی میں اور اس کے بعد، حضرت فاطمہ (ع) ہی فدک کی مالک تھیں اور مسلمانوں سے

اپنی دعویٰ کے صحیح ہونے پر کیوں گواہ طلب نہیں کرتے ہو، جیسا کہ۔ جو مثال میں نے دی تھی اس کے تحت۔

تم مجھ سے میرے دعویٰ کی صداقت پر گواہی اور دلیل طلب کر رہے ہو؟)

حضرت امیر المؤمنین کے اشکال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے گھر میں بیٹھا ہو اور میں باہر سے

جا کر یہ دعویٰ کروں کہ وہ گھر میرا ہے تو تم کس سے گواہی اور دلیل طلب کرو گے؟ اس شخص سے جو ابھی

گھر میں بیٹھا ہوا ہے اور ”ذوالید“ ہے۔ یعنی مکان کا قبضہ اس کے پاس ہے۔ یا اس شخص سے گواہی طلب کرو گے کہ جس نے باہر سے آکر گھر پر دعویٰ کیا ہے؟ اور یہ ایک واضح سی بات ہے کہ دلیل اور گواہ مدعی سے طلب کیا جاتا ہے کیونکہ رسول خدا (س) کا فرمان ہے کہ: ”البینۃ علی المدعی والحلف علی من انکر“ (مدعی گواہ پیش کرے اور مدعی علیہ قسم کھائے) یعنی مدعی پر لازم ہے کہ وہ گواہ لائے اور دلیل قائم کرے اگر وہ گواہ لائے تو اس کی بات قبول کی جاتی ہے ورنہ مدعی علیہ پر لازم نہیں کہ وہ دلیل و گواہ پیش کرے بلکہ وہ مدعی کے دعوے کو رد کرنے کے لئے قسم کھائے تو بھی کافی ہے۔ اوپر کی مثال میں منکر وہ ہے جو گھر میں قیام پذیر ہے اور مدعی وہ شخص ہے جو اس گھر پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کر رہا ہے لہذا تم مدعی ہو اور اپنے دعوے کے اثبات کے لئے دلیل اور گواہ پیش کرو۔

ہمارے اس مسئلے میں فدک حضرت زہراءؑ کی ملکیت میں تھا اور پیغمبر خدا (س) کی حیات طیبہ اور آپ (س) کی رحلت کے بعد فدک حضرت فاطمہ (ع) کے قبضے میں تھا۔ ابھی تم آکر یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ فدک مسلمانوں کی ملکیت ہے تو پس تم مدعی ہو اور اسلام کے عدالتی قانون کے تحت۔ تم پر گواہ پیش کرنا واجب ہے نہ کہ حضرت فاطمہ (ع) پر کہ جو ”ذوالید“ ہیں اور ان کے نمائندے وہاں۔ فدک میں۔ تھے۔ جنہیں تم نے جبراً نکال دیا ہے۔ پس تم یہ جو گھر کے مالک اور ”ذوالید“ سے گواہ طلب کر رہے ہو تو تمہاری یہ حرکت حکم خدا کے مخالف ہے!!

یہاں پہنچ کر ابو بکر شکست کھا گیا اور حضرت علی (ع) کو کوئی جواب نہ دے سکا (۱)۔

۱۔ ابن ابی الحدید شرح نہج البلاغہ میں ج ۱۲ ص ۲۸۵ پر قاضی القضاۃ سے ایک مطلب نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: ”اگر فدک حضرت زہراءؑ کے تصرف میں تھا تو ابو بکر کے پاس آپؑ نے ”دلیل ید“ سے استدلال کیوں نہیں فرمایا اور۔ ”دلیل ید“ جیسی ٹھوس اور ناقابلِ خدشہ دلیل کو چھوڑ کر۔ ارث کا دعویٰ فرمایا؟ اگر آپؑ ”قاعدہ ید“۔ جو ملکیت کے ثبوت کے لئے ایک محکم دلیل ہے۔ سے ابو بکر کے سامنے استدلال فرمائیں تو ابو بکر پیغمبرؐ سے غصب اس روایت کو نقل نہیں کر سکتا تھا تاکہ یہ کہا جائے کہ قرآن کے ارث سے مربوط دلائل کی عموم خبر واحد کے ذریعے سے تخصیص ہوئی ہے۔

اس اشکال کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ: حضرت زہراءؑ نے فدک کے مہر اور بخشش ہونے کا دعویٰ فرمایا تو درحقیقت آپؑ نے یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ فدک میرے تصرف اور قبضے میں تھا لہذا میں ذوالید ہوں۔

”فسکت ابو بکر“

(۔ جب یہ استدلال سنا تو۔ ابو بکر خاموش ہو گیا !!!)

”فقال عمر، یا علی! دعنا من کلامک فاننا لا نقویٰ علی حجتک“

فان اتیت بشہود عادل، والا فهو فیء للمسلمین لاحق لک ولا لفاطمة فیہ !!!

(اس وقت عمر نے حضرت علیؑ سے کہا کہ،

اے علی! ان باتوں کو چھوڑ دو، کیونکہ ہم آپؑ کے دلائل کا جواب نہیں دے سکتے اور آپؑ سے بحث نہیں کر سکتے !!!
اگر عادل گواہ لے آئے۔ تو فدک حضرت فاطمہؑ کو ملے گا۔

ورنہ یہ مسلمانوں کی ملکیت ہے اس پر تیرا یا فاطمہؑ کا کوئی حق نہیں !!!)

جب عمر نے محسوس کیا کہ حضرت علیؑ کے دلائل کا کوئی جواب نہیں۔ اور نہ ہمارے پاس کوئی شرعی دلیل ہے۔ اور اس طرح جب اس نے استدلال کے میدان میں شکست کھائی تو بغیر دلیل والے اپنے دعوے کا تکرار کیا اور بڑے متکبرانہ انداز میں کہا کہ: یا علی! آپؑ کا یہ استدلال ہم نہیں سمجھتے لہذا

= ابن ابی الحدید اس جواب پر اشکال کرتا ہے کہ پیغمبرؐ کی طرف سے حضرت زہراءؑ کو فدک کا بخشا جانا اگرچہ مسلم اور قطعی ہے لیکن ممکن ہے حضرت فاطمہؑ نے اس پر قبضہ اور تصرف نہ کیا ہو! پس صرف یہ کہنا قابض ہونے کی دلیل نہیں کیونکہ ”اعطاء“ کا معنی دینا ہے۔ قبضہ اور بغیر قبضہ ہر قسم کے ہبہ اور بخشش کو اعطاء کہا جاتا ہے۔۔

ابن ابی الحدید کے جواب میں یہ کہنا چاہئے کہ، شیعہ منابع و مآخذ کے علاوہ اہل سنت کے بھی اکثر مآخذ کے مطابق یہ ایک قطعی اور مسلم امر ہے کہ رسول خداؐ کی زندگی میں فدک حضرت زہراءؑ کو بخشا گیا اور آپؑ کے حوالے کر دیا گیا تھا اور حضرت زہراءؑ نے وہاں اپنا نمائندہ مقرر فرمایا تھا۔ عثمان بن حنیف کے نام حضرت علیؑ کے مکتوب میں آپؑ صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ”بلی کانت فی ایدینا فدک...“ (یعنی فدک ہمارے قبضے میں تھا...) اور لغت میں بھی لفظ ”اعطاء“ کے معنی میں قبضہ اور تصرف بھی شامل ہے بنا بریں خود ابن ابی الحدید کی مورد قبول روایات جو فدک کے ہبہ ہونے پر دلالت رکھتی ہیں، ہمارے دعوے کی بنیاد ہیں۔
پس فدک کو محلہ اور ہبہ قرار دینا اس کے علاوہ کوئی اور مضموم نہیں رکھتا کہ فدک پیغمبرؐ نے بخشا اور حضرت زہراءؑ کے تصرف اور قبضے میں تھا اور ”قاعدہ ہبہ“ کے بجائے ہبہ اور بخشش کے عنوان کو انتخاب کرنے کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ آپؑ ابو بکر کو یہ سمجھانا چاہتی تھیں کہ تمہارا یہ اقدام رسول خداؐ کی سیرت طیبہ کے سلفیہ مخالف ہے کیونکہ پیغمبرؐ نے مجھے فدک بخشا اور تم نے مجھ سے چھین لیا۔ اس مقصود کو سمجھانے کے لئے ”ہبہ“ کے مقابلے میں یہ تعبیر زیادہ مناسب ہے۔

آپؐ کے سامنے دو راستے ہیں، ایک یہ کہ کوئی "عادل" گواہ لائیں (۱) یا یہ کہ فدک سے محروم رہیں!!
 اگرچہ عمر نے مولا علیؑ کے ساتھ استدلال اور منطقی گفتگو میں اپنی ناتوانی کا اعتراف کیا ہے لیکن
 مسجد میں سب کے سامنے خدا اور رسول خدا (س) کے حکم کی مخالفت بھی کی ہے!!
 یہاں حضرت علیؑ ابو بکر کی مذمت کرنے کے لئے ایک دوسری روش سے استفادہ فرماتے ہیں۔
 انشاء اللہ اگلے درس میں اس پر بحث ہوگی۔

وصلی اللہ علی محمد وآل محمد (ص)

۱۔ جیسا کہ متن میں گزرا ہے کہ جب ابو بکر نے فدک کی سند لکھی تو عمر نے اسے پھاڑ دیا اور حضرت علیؑ پر مظلوم پرستی کا الزام لگاتے ہوئے آپؐ کی گواہی کو مسترد کر دیا، یہاں پر وہ گواہ کے لئے "عادل ہونا" شرط قرار دیتا ہے کہ اگر کوئی اور گواہ اور شاہد لائیں بھی تو اس پر کوئی نہ کوئی الزام لگائیں اور اسے عدالت سے ساقط کر دیں اور اس کی گواہی کو بھی مسترد کر دیں!۔

سولہواں درس:

- ✽ گزشتہ درس پر ایک نظر
- ✽ حضرت امیر المؤمنین (ع) کی ابوبکر سے وضاحت طلبی
- ✽ لوگوں میں فکری اعتبار سے تبدیلی
- ✽ حضرت فاطمۃ الزہراء (ع) کا اپنے بابا (ص) کے مزار پر سوز اور گریہ
- ✽ حضرت امیر المؤمنین (ع) کے قتل کی سازش
- ✽ سازش قتل کا انکشاف
- ✽ نماز کی حالت میں ابوبکر کا تردد اور پشیمانی
- ✽ حضرت امیر المؤمنین (ع) کی عمر کو دھمکی

فَقَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عليه السلام: يَا أَبَا بَكْرٍ تَقْرَأُ كِتَابَ اللَّهِ؟ قَالَ: نَعَمْ؛ قَالَ: أَخْبِرْنِي عَنْ قَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيراً﴾ فِيمَنْ نَزَلَتْ، فِينَا أَمْ فِي غَيْرِنَا؟ قَالَ: بَلْ فِيكُمْ، قَالَ: فَلَوْ أَنَّ شُهُوداً شَهِدُوا عَلَى فَاطِمَةَ بِنْتِ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وآله بِفَاحِشَةٍ، مَا كُنْتَ ضَانِعاً بِهَا؟ قَالَ: كُنْتُ أَقِيمُ عَلَيْهَا الْحَدَّ كَمَا أَقِيمُهُ عَلَى نِسَاءِ الْمُسْلِمِينَ؛ قَالَ: إِذَنْ كُنْتَ عِنْدَ اللَّهِ مِنَ الْكَافِرِينَ؟ قَالَ: وَلِمَ؟ قَالَ: لِأَنَّكَ رَدَدْتَ شَهَادَةَ اللَّهِ بِالطَّهَارَةِ وَقَبِلْتَ شَهَادَةَ النَّاسِ عَلَيْهَا، كَمَا رَدَدْتَ حُكْمَ اللَّهِ وَحُكْمَ رَسُولِهِ، أَنْ جَعَلَ لَهَا فِدْكَاً وَقَدْ قَبَضْتَهُ فِي حَيَاتِهِ، ثُمَّ قَبِلْتَ شَهَادَةَ أَغْرَابِيٍّ بَائِلٍ عَلَى عَقْبِيهِ عَلَيْهَا وَأَخَذْتَ مِنْهَا فِدْكَاً، وَزَعَمْتَ أَنَّهُ فَنَاءٌ لِلْمُسْلِمِينَ، وَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صلى الله عليه وآله: «الْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعَى، وَالْيَمِينُ عَلَى الْمُدَّعَى عَلَيْهِ»؛ فَرَدَدْتَ قَوْلَ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وآله: «الْبَيِّنَةُ عَلَى مَنْ ادَّعَى، وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ ادَّعَى عَلَيْهِ».

قَالَ: فَدَمَدَمَ النَّاسُ وَانْكَرُوا، وَنَظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ وَقَالُوا: «صَدَقَ وَاللَّهِ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ عليه السلام»؛ وَرَجَعَ عَلِيُّ عليه السلام إِلَى مَنْزِلِهِ.

قَالَ: وَدَخَلَتْ فَاطِمَةُ عليها السلام الْمَسْجِدَ وَطَافَتْ بِقَبْرِ أَبِيهَا وَهِيَ تَبْكِي تَقُولُ:
 إِنَّا فَقَدْنَاكَ فَقَدْ الْأَرْضَ وَابِلَهَا وَ اخْتَلَّ قَوْمُكَ فَاشْهَدْهُمْ وَ لَا تَغِبْ
 قَدْ كَانَ بَعْدَكَ أَنْبَاءٌ وَ هَنْبَةٌ لَوْ كُنْتُ شَاهِدَهَا لَمْ تَكْثِرِ الْخُطْبَ
 قَدْ كَانَ جِبْرِيلُ بِالْآيَاتِ يُؤْنِسُنَا فَغَابَ عَنَّا فَكُلُّ الْخَيْرِ مُخْتَجِبْ
 وَ كُنْتَ بَذْراً وَ نَوْراً يُسْتَضَاءُ بِهِ عَلَيْكَ تَنْزَلُ مِنْ ذِي الْعِزَّةِ الْكُتُبْ
 تَجْهَمْتُنَا رِجَالٌ وَ اسْتَحَفُّوا بِنَا إِذْ غَبَّتْ عَنَّا فَتَحَرُّوا الْيَوْمَ نَغْتَصِبْ
 فَسَوْفَ تَبْكِيكَ مَا عَشْنَا وَ مَا بَقِيت مِنَّا الْعُيُونُ بِتَهْمَالٍ لَهَا سَكْبْ

قَالَ: فَرَجَعَ أَبُو بَكْرٍ وَ عُمَرُ إِلَى مَنْزِلِهِمَا، وَ بَعَثَ أَبُو بَكْرٍ إِلَى عُمَرَ فَقَدَا، ثُمَّ قَالَ لَهُ: أَمَا رَأَيْتَ مَجْلِسَ عَلِيٍّ مِنَّا فِي هَذَا الْيَوْمِ، وَاللَّهِ لَئِنْ قَعَدَ مَقْعِداً آخَرَ مِثْلَهُ

لَيُفْسِدَنَّ عَلَيْنَا أَمْرُنَا، فَمَا الرَّأْيُ؟ فَقَالَ: عُمَرُ: الرَّأْيُ أَنْ تَأْمُرَ بِقَتْلِهِ، قَالَ: فَمَنْ يَقْتُلُهُ؟ قَالَ: «خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ».

فَبَعَثْنَا إِلَى خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ فَأَتَاهُمَا، فَقَالَا لَهُ: نُرِيدُ أَنْ نَحْمِلَكَ عَلَى أَمْرٍ عَظِيمٍ، قَالَ: إِحْمِلَانِي عَلَى مَا شِئْتُمَا، وَلَوْ عَلَى قَتْلِ عَلِيٍّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، قَالَا: فَهُوَ ذَاكَ، فَقَالَ خَالِدٌ: مَتَى أَقْتُلُهُ؟ قَالَ أَبُو بَكْرٍ: احْضُرِ الْمَسْجِدَ وَ قُمْ بِجَنْبِهِ فِي الصَّلَاةِ، فَإِذَا سَلَّمْتَ فَقُمْ إِلَيْهِ وَ اضْرِبْ عُنُقَهُ، قَالَ: نَعَمْ.

فَسَمِعَتْ أَسْمَاءُ بِنْتُ عُمَيْسٍ وَ كَانَتْ تَحْتَ أَبِي بَكْرٍ؛ فَقَالَتْ لِجَارِيَتَيْهَا: إِذْهَبِي إِلَى مَنْزِلِ عَلِيٍّ وَ فَاطِمَةَ (عليهما السلام) وَ اقْرئيهما السلام وَ قُولِي لِعليٍّ عليه السلام: «إِنَّ الْمَلَائِكَةَ يَأْتِمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ» فَبَجَاءَتْ، فَقَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عليه السلام: قُولِي لَهَا: «إِنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يُرِيدُونَ».

ثُمَّ قَامَ وَ تَهَيَّأَ لِلصَّلَاةِ، وَ حَضَرَ الْمَسْجِدَ، وَ صَلَّى خَلْفَ أَبِي بَكْرٍ؛ وَ خَالِدُ بْنُ الْوَلِيدِ يُصَلِّي بِجَنْبِهِ، وَ مَعَهُ السَّيْفُ؛ فَلَمَّا جَلَسَ أَبُو بَكْرٍ فِي التَّشَهُّدِ، نَدِمَ عَلَى مَا قَالَ وَ خَافَ الْفِتْنَةَ، وَ عَرَفَ شِدَّةَ عَلِيٍّ عليه السلام وَ بَأْسَهُ، فَلَمْ يَزَلْ مُتَفَكِّرًا لَا يَجْسِرُ أَنْ يُسَلِّمَ، حَتَّى ظَنَّ النَّاسُ أَنَّهُ قَدْ سَهَا.

ثُمَّ التَّفَتَ إِلَى خَالِدٍ، فَقَالَ: «يَا خَالِدُ! لَا تَفْعَلَنَّ مَا أَمَرْتُكَ، وَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللَّهِ وَ بَرَكَاتُهُ»! فَقَالَ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عليه السلام: يَا خَالِدُ! مَا الَّذِي أَمَرَكَ بِهِ؟ فَقَالَ: أَمَرَنِي بِضَرْبِ عُنُقِكَ. قَالَ: أَوْ كُنْتَ فَاعِلًا؟ قَالَ: إِي وَ اللَّهِ، لَوْ لَا أَنَّهُ قَالَ لِي لَا تَقْتُلْهُ قَبْلَ التَّسْلِيمِ، لَقَتَلْتُكَ.

قَالَ: فَأَخَذَهُ عَلِيٌّ عليه السلام فَجَلَدَ بِهِ الْأَرْضَ، فَاجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَيْهِ، فَقَالَ عُمَرُ: يَقْتُلُهُ وَ رَبُّ الْكَعْبَةِ، فَقَالَ النَّاسُ: يَا أَبَا الْحَسَنِ! اللَّهُ اللَّهُ، بِحَقِّ صَاحِبِ الْقَبْرِ، فَخَلَّى عَنْهُ، ثُمَّ التَّفَتَ إِلَى عُمَرَ، فَأَخَذَ بِتَلَابِيهِهِ وَ قَالَ: يَا بَنَ صَهَاك، وَ اللَّهِ لَوْ لَا عَهْدٌ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صلى الله عليه وآله، وَ كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ، لَعَلِمْتُ أَتَيْنَا أَوْ ضَعُفَ نَاصِرًا وَ أَقْلُ عَدَدًا؛ وَ دَخَلَ مَنْزِلَهُ.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وبہ نستعین

گزشتہ درس پر ایک نظر:

گزشتہ دروس میں ہم نے فدک کے بارے میں حضرت زہراء (ع) کے خطبے کے بارے میں گفتگو کی اور ابھی اسی موضوع سے مربوط حضرت امام جعفر صادق (ع) کی اس روایت پر بحث ہو رہی ہے جو سند کے لحاظ سے معتبر اور درست ہے اور فدک کے بارے میں روان، آسان اور عمدہ مطالب پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے درس میں روایت کے ایک حصہ کو ہم نے پڑھا اور کہا ہے کہ: جب فدک، ابو بکر نے حضرت فاطمہ (ع) سے چھین لیا تو آپ اس کے پاس گئیں اور احتجاج فرمایا، ابو بکر کے گواہی طلب کرنے پر آپ نے حضرت علیؑ اور ام ایمن کو بطور گواہ پیش کیا کہ فدک رسول خدا (س) نے اپنی زندگی میں حضرت زہراء (ع) کو بخش دیا تھا۔

ابو بکر نے اس گواہی کی بنا پر ایک تحریر لکھی کہ فدک حضرت زہراء (ع) کو واپس کر دیا جائے لیکن اسی دوران عمر آگیا اور تحریر کو پھاڑ دیا اور کہا کہ اس بارے میں علیؑ کی گواہی قابل قبول ہی نہیں ہے اور ام ایمن کی گواہی کافی نہیں ہے!۔

پھر امیر المؤمنینؑ نے مسجد میں ابو بکر پر اعتراض کیا اور حضرت زہراء (ع) کے حق میں استدلال فرمایا حالانکہ ابو بکر مہاجرین اور انصار کے کچھ لوگوں کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں حضرت علیؑ نے ابو بکر سے

وضاحت طلب فرمائی اور اس سے فرمایا کہ گواہ اور دلیل تمہیں لانے چاہئیں، کیونکہ فدک حضرت زہراء (ع) کے تصرف اور قبضے میں تھا اور تم اس قبضے کے خلاف دعویٰ کر رہے ہو اور مدعی ہو کہ فدک تمام مسلمانوں کا ہے۔ لہذا خدا اور اس کے پیغمبر (س) کے حکم کے مطابق تجھ پر گواہ پیش کرنا ضروری ہے۔ یہاں پر ابوبکر خاموش رہا۔ چونکہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اور عمر نے مداخلت کرتے ہوئے مولا علیؑ سے کہا کہ: ہمیں آپ کی ان دلیلوں سے کوئی سروکار نہیں! یا آپؑ عادل گواہ لائیں یا آپؑ اور فاطمہؑ فدک سے محروم رہیں!!!

جب حضرت امیر المؤمنینؑ کو عمر کے ضدی پنے اور ہٹ دھرمی کا سامنا کرنا پڑا تو آپؑ نے استدلال کا رخ بدل دیا۔
اب آئیے آگے بڑھتے ہیں۔

حضرت امیر المؤمنین (ع) کی ابوبکر سے وضاحت طلبی،

”فقال امیر المؤمنین (ع) یا ابابکر! تقرأ کتاب اللہ؟“

(اس کے بعد امیر المؤمنین (ع) نے ابوبکر سے فرمایا کہ: اے ابوبکر! کیا قرآن پڑھتے ہو؟)

”قال نعم“ (اس نے کہا کہ: ہاں)

”قال علیہ السلام، اخبرنی عن قول اللہ عزوجل، ”انما یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس اهل

البیت ویطہرکم تطہیراً“ (۱) فیمن نزلت، فینا ام فی غیرنا؟“

(حضرت امیر المؤمنینؑ نے فرمایا کہ: مجھے خدا کے اس فرمان کے بارے میں بتاؤ کہ:

”بتقین خدا یہ ارادہ رکھتا ہے کہ ہر قسم کی آلودگی اور پلیدی کو آپ اہل بیتؑ سے دور رکھے اور آپ کو پاک و معزز

رکھے“ یہ آیہ شریفہ کس کے حق میں نازل ہوئی ہے، ہمارے بارے میں یا کسی اور کے حق میں؟)

”قال بل فیکم“

(ابوبکر نے کہا کہ: چھینا یہ آیت آپ۔ اہل بیت۔ کے حق میں نازل ہوئی ہے)

”قال عليه السلام۔“

يا ابا بکر: فلو ان شهوداً شهدوا علي فاطمة بنت رسول الله (ص) بفاحشة ما كنت صانعاً بها؟“

(حضرت ۴، (ع) نے فرمایا کہ:

اے ابوبکر!۔ فرض کریں۔ کہ چند گواہ اگر حضرت فاطمہ (ع) کے خلاف یہ گواہی دیں کہ انہوں نے کوئی برا کام انجام دیا

ہے تو تم فاطمہ (ع) کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟)

”قال: كنت اقيم عليها الحد كما اقيمه علي نساء المسلمين“

(ابوبکر نے کہا کہ: میں ان پر حد جاری کرتا جس طرح دوسری مسلمان عورتوں پر حد جاری کرتا ہوں)

”قال عليه السلام: اذن كنت عند الله من الكافرين“

(حضرت امیر المؤمنین (ع) نے فرمایا کہ: اس صورت میں تم خدا کے نزدیک کافروں میں سے شمار ہوتے)

”قال: ولم“

(اس نے کہا: کیوں؟)

”قال (ع): لانك رددت شهادة الله بالطهارة وقبلت شهادة الناس عليها“

(حضرت علیؑ نے فرمایا:

اس لئے کہ خدا نے ان کی پاکیزگی اور عصمت کی گواہی دی ہے اور تم نے اس کو ٹھکرا کر لوگوں کی گواہی کو قبول کیا!)
یعنی: خداوند قدوس قرآن میں گواہی دیتا ہے کہ اہل بیت اور حضرت زہراءؑ پاک اور طاہر ہیں اور
خدا نے ارادہ فرمایا ہے ہر ناپاکی اور آلودگی کو ان سے دور کرے اور تم آکر۔ اس قرآنی گواہی کے خلاف۔
چند لوگوں کی گواہی کو ترجیح دیتے ہو؟)

”كما رددت حكم الله وحكم رسوله ان جعل لها فداً“

(جیسا کہ خدا اور اس کے پیغمبر (ص) کے حکم کو بھی تم نے ٹھکرا دیا ہے۔ اور وہ حکم یہ تھا کہ

انہوں نے فداک حضرت فاطمہؑ کو بخشا تھا)

یہاں آپؐ آیہ شریفہ ”فَاتِذَا الْقَرْبُ حَقُّهُ (۱)“ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں، جس کے بارے میں گزشتہ درس میں بحث ہو چکی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول خدا (س) نے جبرئیل سے ”ذَا الْقَرْبُ“ کے بارے میں پوچھا اور خدا کے حکم سے فدک، حضرت زہراء (ع) کے حوالے کر دیا۔ اس حقیقت کو فریقین نے اپنی حدیث کی کتابوں میں نقل کیا ہے (۲)۔

”وَقَدْ قَبَضَتْهُ فِي حَيَاتِهِ“

(حالانکہ حضرت زہراء (ع) رسول خدا (س) کی زندگی میں ہی فدک پر قابض تھیں)

دراصل آپؐ اس عبارت کے ذریعے اس حقیقت کی تائید فرما رہے ہیں کہ اس مسئلہ میں میراث سے مراد اصطلاحی میراث نہیں بلکہ اس سے وسیع تر مفہوم مراد ہے جو ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو باپ کی طرف سے اولاد کو ملے چاہے وہ باپ کی زندگی میں ہی کیوں نہ ہو۔ بنیادی طور پر فدک ”نخلہ یا نخیلہ“ یعنی ہبہ یا عطیہ تھا جو رسول خدا (س) کی طرف سے حضرت فاطمہ (ع) کو عطا ہوا تھا۔

”ثُمَّ قَبِلَتْ شَهَادَةَ اَعْرَابِيٍّ بَائِلٍ عَلَىٰ عَقْبِيهِ عَلَيْهَا وَاَخَذَتْ مِنْهَا فِدْكَ“

”وَزَعَمَتْ اَنَّهُ فِی الْمُسْلِمِينَ“

(پھر تم نے فاطمہؑ کے خلاف ایک ایسے بادیہ نشین کی گواہی قبول کی ہے کہ جو اپنے پاؤں پر پیشاب کرتا ہے، اس طرح تم

نے حضرت فاطمہؑ سے فدک چھین لیا اور اپنے تئیں یہ سوچا کہ یہ مسلمانوں کی ملکیت ہے!)

یہاں آپؐ اس حدیث کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جسے عمر نے نقل کرتے ہوئے کہا کہ اوس بن حدثان، عائشہ اور حفصہ گواہی دے رہے ہیں کہ: ”رسول خدا (س) نے فرمایا کہ: ”فَنَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُورِثُ وَمَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ“ (یعنی ہم گروہ انبیاء ارث نہیں چھوڑتے اور جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہے۔)

اہل سنت بھی اس حدیث پر بہت زور دیتے ہیں۔ حضرت علیؑ کے اس جملے ”بَائِلٌ عَلَىٰ عَقْبِيهِ“

۱۔ سورۃ روم / ۳۸۔

۲۔ بحار الانوار طبع قدیم ج ۱۸ باب نزول الایات فی امر فدک۔

کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اوس بن حدثان کی طرف اشارہ ہے۔

مختصر یہ کہ: آپؐ فرماتے ہیں کہ تم نے خدا اور رسول (ص) کا حکم مسترد کیا اور اسے پامال کر دیا اور ایک بادیہ نشین اور عائشہ و حفصہ کی گواہی قبول کر کے ان کی گواہی کو حکم خدا پر مقدم رکھا، کیونکہ فدا کے حکم سے پیغمبر اکرم (ص) نے حضرت فاطمہؑ کو عنایت فرمایا تھا لیکن تم رسول خدا (ص) کے اس عطیہ کو غضب کر کے یہ سوچ رہے ہو کہ یہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے۔

”وقد قال رسول الله، البينة على المدعى واليمين على المدعى عليه“

(حالانکہ رسول خدا (ص) نے فرمایا تھا کہ: مدعی پر گواہی اور دلیل پیش کرنا ضروری ہے جبکہ مدعی علیہ پر قسم) اور یہ واضح ہے کہ یہاں تم مدعی ہو کیونکہ فدا کے حکم حضرت زہراءؑ کے تصرف میں تھا اور ان کا اس پر قبضہ تھا لہذا حضرت زہراءؑ ”ذوالید“ تھیں اب تم یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ فدا تمام مسلمانوں کا مال ہے تو رسول خدا (ص) کے حکم کے مطابق۔ تم پر لازم تھا کہ گواہ لاتے اور دلیل پیش کرتے اور تمہارے پاس گواہ نہ ہونے کی صورت میں۔ حضرت زہراءؑ قسم کھاتیں اور معاملہ ختم ہو جاتا۔ یہاں رسول خدا (ص) کے اس صریح حکم اور اسلامی عدالتی سسٹم کے مسلمہ اصول کے خلاف ان لوگوں نے حضرت زہراءؑ سے گواہی طلب کی اور۔ آپؐ نے دو گواہ، ایک حضرت علیؑ اور دوسرا ام ایمن پیش کیے لیکن انہیں مسترد کر دیا گیا۔

”فرددت قول رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم“

(بنابریں تم نے رسول خدا (ص) کے فرمان کو رد کر دیا ہے)

یعنی تم نے مدعی علیہ اور ذوالید سے گواہی طلب کر کے دراصل رسول خدا (ص) کے حکم کے خلاف عمل کیا ہے اور آنحضرت (ص) کے فرمان کو پامال کر دیا ہے !

لوگوں میں فکری اعتبار سے تبدیلی،

”قال عليه السلام، فدمدم الناس وانكروا“

(امام صادق (ع) فرماتے ہیں کہ:

ابوبکر کی اس حرکت سے۔ لوگ ناراض ہوئے اور شور مچایا اور۔ ابوبکر کے اس اقدام کو۔ برا مانا۔
غصے کی حالت میں انسان جو شور مچاتا ہے اس کو "ددم" کہا جاتا ہے۔ یعنی لوگ اس بات پر
ناراض ہوئے کہ ابوبکر نے حضرت علیؓ اور حضرت زہراءؓ کے بارے میں یہ ناروا سلوک کیوں روا
رکھا اور ان کے حقوق کو کیوں پامال کیا؟

"ونظر بعضهم الى بعض وقالوا صدق واللہ علی بن ابی طالب (ع)"

(لوگوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کہنے لگے کہ: خدا کی قسم! علی بن ابی طالب درست فرما رہے ہیں)
کیونکہ وہ جانتے تھے کہ رسول خدا (ص) نے اپنی زندگی میں فدک حضرت زہراءؓ کو عنایت فرمایا تھا
اور تا بحال ان کے قبضے میں تھا اور وہاں آپؐ کے نمائندے اور اہل کار کام کر رہے تھے۔ اس طرح
چونکہ آپؐ "ذوالبید" تھیں آپؐ پر لازم نہ تھا کہ گواہی لائیں، بلکہ مدعی ہونے کے اعتبار سے ابوبکر اور
عمر پر ضروری تھا کہ وہ گواہ پیش کرتے یا دلیل قائم کرتے۔ اسی لئے جب لوگوں نے امیر المؤمنینؑ کی باتیں
سنیں تو آپؐ کی تصدیق کی اور ابوبکر و عمر کے اقدام سے ناراض ہوئے۔

"ورجع علی علیہ السلام الی منزله"

(اور حضرت علیؓ اپنے گھر واپس آ گئے)

حضرت فاطمۃ الزہراء (ع) کا اپنے بابا (ص) کے مزار پر سوز اور گریہ،

"قال (ع) ودخلت فاطمۃ علیہا السلام المسجد وطافت بقبر ابیہا وہی تبکی وتقول:"

(امام صادق (ع) فرماتے ہیں کہ: اس کے بعد حضرت فاطمہؓ مسجد میں داخل ہوئیں اور بابا کی قبر کے گرد۔ پروانے کی

طرح۔ چکر لگایا، حالانکہ آپؓ گریہ کر رہی تھیں اور۔ ذیل کے یہ اشعار۔ کہہ رہی تھیں (۱۱)

۱۔ یہ وہی اشعار ہیں جسے آپؓ نے مسجد میں اپنے خطبہ کے بعد مطہر اکرمؑ کی منبر پر پڑھا تھا شاید آپؓ نے ان اشعار کو بار بار پڑھا ہو۔

”انا فقدناك فقد الارض وابلها واختل قومك فاشهدهم ولا تغب“

(اے رسول خدا! ہم نے آپ کو اس طرح کھودیا جس طرح زمین مفید اور سرشار بارش کو کھودیتی ہے، جبکہ

آپ (س) کی قوم مغرب ہو گئی ہے آپ ان پر گواہ رہنا اور ہم سے غائب نہ رہنا)

”فقد الارض“ مفعول مطلق نوعی ہے۔ یعنی فعل کی نوعیت کو بیان کرتا ہے۔ یعنی آپ (س) ہم سے

بچھڑ گئے اور ہماری حالت اس زمین کی سی ہو گئی ہے جس نے اپنے اوپر برسنے والی مفید اور سرشار بارش کو کھودیا ہو۔ ”دابل“ یعنی بڑے قطروں والی بارش، جب بارش برسنے کا سلسلہ ختم ہو جائے تو زمین نہ صرف اپنی شادابی کھودیتی ہے بلکہ۔ بنجر بھی بن جاتی ہے۔

”قد كان بعدك انباء وهنبة لو كنت شاهد هالم تكثر الخطب“

(تحقیق آپ (س) کے بعد ایسی خبریں اور ایسے سخت حوادث رونما ہوئے ہیں کہ اگر آپ (س) حاضر ہوتے اور دیکھتے

تو کبھی بھی یہ مصیبتیں اتنی بڑی نہ ہوتیں)

سخت حوادث، شور و غل اور ہنگامہ آرائی کو ”ہنبتہ“ کہا جاتا ہے۔ یعنی آپ (س) کی وفات کے بعد ایسی سخت مصیبتیں اور ہنگامہ آرائیاں رونما ہوئیں کہ اگر آپ (س) زندہ ہوتے اور ان حالات کو دیکھ رہے ہوتے تو یہ حادثات کبھی بھی رونما نہ ہوتے۔ یعنی آپ (س) کے ہوتے ہوئے یہ لوگ اہل بیتؑ پر اتنے مظالم ڈھانے کی جرات نہ کرتے اور حریم اہل بیتؑ کی شان میں گستاخی نہ کرتے ”کان“ یہاں تامہ ہے اور اس کو اسم و خبر کی ضرورت نہیں ہے۔

”قد كان جبريل بالآيات يؤنسنا فغاب عنا فكل الخير محتجب“

(۔ اس وقت۔ جبریل آیات قرآنی کے ذریعے ہمارے سکون اور انس کا باعث بنتا تھا لیکن ابھی وہ بھی ہم سے چھپ

چکا ہے اس طرح تمام خوبیاں ہم سے پوشیدہ ہو گئی ہیں)

بعض لوگ جو ان اشعار کو ”ہند بن اثاثہ“ کی طرف منسوب کرتے ہیں تو ممکن ہے پہلے دو بیت اس کے ہوں وگرنہ کم از کم یہ بیت تو یقیناً حضرت زہراءؑ کا ہے کیونکہ جبریل کے ساتھ گفتگو اور اس کا مؤنس ہونا صرف اہل بیتؑ کے ساتھ مخصوص تھا۔

”و كنت بدراً ونوراً يستضاء به عليك تنزل من ذي العزة الكتب“

(آپ (س) بدر کا لہو تھے اور ایسے نور تھے کہ جس کے ذریعے روشنی پیدا ہوتی تھی، خداوند متعال کی طرف سے

آپ (س) پر آسمانی کتابیں نازل ہوتی تھیں)

”تجهمتنا (۱) الرجال واستخف بنا اذ غبت عنا فنحن اليوم نفتصب“

(بعض لوگوں نے ہمیں اپنے وحشیانہ حملے کا نشانہ بنایا، موڈ بگاڑ کر ہمارے ساتھ سخت برتاؤ روا رکھا اور آج ہمیں

غارت کیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ آپ (س) ہماری آنکھوں سے غائب ہیں)

”فسوف نبكيك ماعشنا وما بقيت منا العيون بتهمال لهاسكب“

(جب تک ہم زندہ ہیں اور ہماری آنکھوں میں آنسو ہیں تو ہم آپ (س) کے غم میں روتے رہیں گے)

”تمہال“ تعداد کی طرح نفعال کے وزن پر ہے اور اس کی اصل ”ہمل“ ہے جس کا معنی ”جاری ہونا

ہیں۔ شد و تیز طریقے سے بہنے کو ”سکب“ کہا جاتا ہے۔۔ جیسے سیلاب یا موسلا دھار بارش۔۔

آپ (س) کا مقصد یہ ہے کہ: اے میرے والد بزرگوار! ہم آپ (س) کے لئے روتے رہیں گے جب تک

کہ ہم زندہ ہیں اور ہماری آنکھوں سے آپ (س) کی جدائی میں آنسوؤں کا سیلاب جاری رہے گا (۲)۔

حضرت امیر المؤمنین (ع) کے قتل کی سازش

”قال عليه السلام، فرجع ابوبكر وعمر الى منزلهما“

(امام صادق (ع) فرماتے ہیں کہ: ابوبکر اور عمر بھی اپنے گھروں کی طرف چلے گئے)

”وبعث ابوبكر الى عمر فدعا، ثم قال له، امارايت مجلس علي منافي هذا اليوم“

(پھر ابوبکر نے عمر کو بلا بھیجا۔ جب وہ آیا تو۔ اس سے کہا کہ: کیا تم نے علیؑ کو نہیں دیکھا کہ اس نے آج ہمارے ساتھ

کیا سلوک کیا ہے؟)

۱۔ تجہمت کسی کے ساتھ موڈ بگاڑ کر سخت رویے کے ساتھ پیش آنے کو کہتے ہیں۔

۲۔ احتجاج کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ: تفسیر قمی میں اور بھی اشعار نقل ہوئے ہیں۔

یعنی، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ لوگوں کے سامنے علیؑ نے ہمیں رسوا کیا ہے؟

”واللہ لئن قعد مقعداً آخر لیفسدن علینا امرنا“

(خدا کی قسم! اگر اس قسم کی کسی دوسری نشست میں وہ بیٹھ جائے تو یقیناً ہماری حکومت کا مسئلہ خراب کر دے گا)
”امر“ یعنی، حکومت۔ حکومت ابھی تازہ ابو بکر کے ہاتھ لگی تھی دوسری طرف، بعض لوگوں میں زمانہ رسول خدا (ص) کی خصوصیات پائی جاتی تھیں اسی لئے ابو بکر خوفزدہ تھا کہ اگر کسی دوسری جگہ پر حضرت علیؑ نے اس کے ساتھ مناظرہ کیا تو اسے حکومت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اسی لئے وہ عمر کو بلاتا ہے اور اس سے مشورہ کرتا ہے !!

”فما الرای؟“

(پس تیری کیا رائے ہے؟)

”فقال عمر، الرای ان قامر بقتله !!!“

(عمر نے کہا کہ، میری رائے یہ ہے کہ تو اس کے قتل کیے جائے کا حکم دے !!!)

”قال، فمن یقتله؟“

(ابو بکر نے کہا کہ، اسے کون قتل کر سکتا ہے؟)

”قال، خالد بن الولید!“

(عمر نے کہا کہ، خالد بن ولید !!)

چونکہ عمر جانتا تھا کہ خالد بن ولید حضرت علیؑ کی بہ نسبت بہت بغض و عداوت رکھتا ہے اسی لئے فوراً اس کا نام لیا۔

”فبعث الی خالد بن الولید، فاتاہما“

(اس طرح انہوں نے کسی کو بھیج کر خالد بن ولید کو بلا بھیجا اور وہ ان کے پاس آگیا)

”فقالا لہ، نرید ان نحملک علی امر عظیم“

(ابو بکر اور عمر نے اس سے کہا کہ، ہم ایک بہت عظیم کام تمہارے سپرد کرنا چاہتے ہیں)

” قال، احملانی علی ما شئتما ولو علی قتل علی بن ابی طالب۔“

(خالد نے کہا: مجھ سے جو کام لینا چاہتے تو لے لو، اگرچہ علی بن ابی طالب کا قتل ہی کیوں نہ ہو!!)
معلوم ہوتا ہے کہ خالد بھی جانتا تھا کہ اس کے دوست کس فکر میں ہیں!۔

” قالا، هو ذاك۔“

(ابوبکر اور عمر نے کہا کہ: ہم بھی یہی چاہتے ہیں!!)

” فقال خالد متی اقتله؟“

(خالد نے پوچھا کہ: اسے کب قتل کروں؟)

” قال ابوبکر، احضر المسجد وقم بجانبه فی الصلوة۔“

(ابوبکر نے کہا کہ: مسجد میں آجاؤ اور نماز کے وقت علیؑ کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ!!)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ مسجد میں تشریف لے جاتے تھے اور ابوبکر کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اس کی علت تقیہ بھی ہو سکتی ہے اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کا تحفظ بھی۔

” فاذا سلمت فقم الیہ واضرب عنقه۔“

(اور جب میں سلام پھیر دوں تو تم اس کی طرف اٹھو اور اس کی گردن اڑا دو!!)

” قال، نعم!“ (خالد نے کہا کہ: بہت اچھا!)

سازش قتل کا انکشاف،

” فسمعت اسماء بنت عمیس وکانت تحت ابی بکر۔“

(اس گفتگو کو ”اسماء بنت عمیس“ نے بھی سنا کہ جو ابوبکر کی بیوی تھی)

اسماء بنت عمیس، خاندان عصمت و طہارت سے محبت رکھنے والوں میں سے تھیں یہ خاتون پہلے حضرت علیؑ کے بھائی جعفر بن ابی طالبؑ کے عقد میں تھیں جب حضرت جعفرؑ طیار رضون اللہ علیہ شہید ہوئے تو اسماء بنت عمیس ابوبکر کے عقد میں آئیں اور ابوبکر کی اہلیہ ہوتے ہوئے بھی آپ کا شمار

حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کے وفادار عقیدت مندوں میں سے ہوتا ہے۔

”فَقَالَتْ لَجَارِيتِهَا، اِذْهَبِي اِلَى مَنْزِلِ عَلِيٍّ وَفَاطِمَةَ وَاقْرِئِيهِمَا السَّلَامَ وَقُولِي لِعَلِيِّ“

ان الملا ياتمرون بك ليقتلوک، فاخرج انسى لك من الناصحين (۱)“

(اسماء نے اپنی کنیز سے کہا کہ: علی اور فاطمہ (علیہما السلام) کے گھر جاؤ

اور انہیں میری طرف سے سلام کہو اور علیؑ کو۔ یہ آیت پڑھ کر سناؤ اور کہو کہ: ”یہ گروہ بے شک تمہارے قتل کی

سازش تیار کر رہے ہیں، لہذا شہر سے نکل جاؤ، یقیناً میں تمہارا خیر خواہ اور نصیحت کرنے والا ہوں۔“)

۔ اسماء بنت عمیس نے پیغام رسانی کے لئے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ۔ قرآن سے ماخوذ ہیں اور

حضرت موسیٰؑ کی داستان کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ: فرعون کی حکومت میں موجود ایک مؤمن نے

حضرت موسیٰؑ کو پیغام بھیجا کہ فرعون اور اس کے درباری تیرے قتل کے بارے میں صلاح و مشورہ

کر رہے ہیں اور قتل کا نقشہ تیار ہو چکا ہے، لہذا اے موسیٰؑ مصر سے باہر نکل جا، میں تمہاری بھلائی چاہتا

ہوں اور تجھے نصیحت کر رہا ہوں۔

اسماء بنت عمیس اس آیت شریفہ کے ذریعے حضرت علیؑ کو یہ سمجھانا چاہتی تھیں کہ ابو بکر اور عمر

آپ کے قتل کا منصوبہ تیار کر چکے ہیں لہذا بہتر ہے کہ آپؑ مدینہ سے چلے جائیں۔

”فَجَاءَتْ، فَقَالَ امِيرُ الْمُؤْمِنِينَ، قَوْلِي لَهَا“ ”ان الله يحول بينهم وبين ما يريدون“

(کنیز آئی۔ اور پیغام پہنچایا۔ تو حضرت امیر المؤمنینؑ نے اس سے فرمایا کہ: اسماء سے جا کے کہو کہ:

خدا ان کو اپنے ہدف سے دور رکھے گا اور ان کی سازش کی راہ میں مانع ہوگا)

حضرت علیؑ اس حملے کے ذریعے اسماء کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خداوند ان کی سازش کو ناکام بنائے گا

اور ان کو اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دے گا (۲)۔

”ثم قام وتھيأ للصلاة“ (پھر آپؑ اٹھے اور نماز کے لئے آمادہ ہوئے)

۱۔ سورہ قصص / ۲۰۔

۲۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں یہ واقعہ زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے جبکہ احتجاج طبری میں اسی مقدار پر اکتفا کیا گیا ہے۔

”وحضر المسجد وصلی خلف ابی بکر“

(اور مسجد میں حاضر ہو کر ابو بکر کے پیچھے نماز پڑھی)

”وخالد بن الولید یصلی بجانبه، ومعه السیف“

(اور خالد بن ولید تلوار کے ساتھ نماز میں حضرت امیر المؤمنین (ع) کے ایک طرف کھڑا ہو گیا)

نماز کی حالت میں ابو بکر کا تردد اور پشیمانی

”فلما جلس ابو بکر فی التشهد، ندم علی ما قال وخاف الفتنة، وعرف شدة علی وباسه“

(جب ابو بکر تشہد کے لئے بیٹھا تو وہ خالد کو کبھی ہوئی اپنی بات پر پشیمان ہوا اور اسے خوف ہوا کہ کہیں فتنہ و آشوب

برپا نہ ہو جائے، نیز حضرت علیؓ کی شجاعت اور ناقابل شکست شخصیت بھی اسے یاد آئی)

ابو بکر تشہد کی حالت میں یہ سوچنے لگا کہ ممکن ہے کہ علیؓ اپنی شجاعت اور بہادری کی بنا پر غالب آجائیں اور خالد مغلوب ہو جائے، اگر خالد اپنے مشن میں کامیاب بھی ہو جائے تو ممکن ہے عوام خصوصاً شیعیان علیؓ کے جذبات قابو سے باہر ہو جائیں اور نتیجتاً اس کی حکومت کے خلاف آشوب برپا نہ ہو جائے۔ خالد کی شکست یا حضرت علیؓ کی خونخواہی میں اٹھنے والی تنگی تلواروں کا تصور ابو بکر کو نماز میں پریشان کرتا رہا اور وہ تشہد کی حالت میں اسی مسئلے پر سوچتا رہا۔

”فلم یزل متفکراً لایجسر ان یسلم، حتی ظن الناس انه قد سبا“

(اسی لئے نماز میں وہ سوچتا ہی رہ گیا اور سلام پھیرنے کی جرات نہیں کر سکا،

یہاں تک کہ لوگوں نے یہ سوچا کہ ابو بکر کو نماز میں اشتباہ ہو گیا ہے)

”ثم التفت الی خالد، فقال،

”یا خالد، لا تفعلن ما امرتک، والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ“

(بالآخرہ ابو بکر۔ نماز کی حالت میں۔ خالد کی طرف متوجہ ہوا، اور کہا کہ: ”اے خالد! جو حکم میں نے تجھے دیا ہے اس پر

عمل نہ کرنا! والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ“۔ اور سلام پھیرا۔ !!)

” فقال امير المؤمنين يا خالد ما الذي امرك به ؟“

(امير المؤمنين (ع) نے خالد سے پوچھا کہ: اے خالد! اس نے تجھے کیا حکم دیا تھا؟)

” فقال امرني بضرب عنقك“

(خالد نے کہا کہ: اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ کی گردن اڑا دوں !!!)

” قال (ع) او كنت فاعلاً“

(آپ نے فرمایا کہ: کیا تم یہ کام کر گزرتے؟)

” قال اى والله، لولا انه قال لى لا تقتله قبل التسليم، لقتلتك !!!“

(خالد نے کہا:

ہاں! خدا کی قسم! اگر سلام پھیرنے سے قبل وہ یہ نہ کہتا کہ اے قتل نہ کرنا تو میں یقیناً آپ کو قتل کر دیتا !!!)

” قال (ع) فاخذ علي (ع) فجلد به الارض“

(۔ اس روایت کے راوی۔ امام صادقؑ فرماتے ہیں کہ:۔ جب یہ بات سنی تو۔

حضرت علیؑ نے خالد کو اٹھا کر زمین پر پٹھساڑ دیا)

” فاجتمع الناس عليه، فقال عمر، يقتله ورب الكعبة“

(پس لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور عمرؓ نے کہنے لگا کہ: رب کعبہ کی قسم علیؑ اس کو قتل کر دے گا)

” فقال الناس يا ابا الحسن، الله الله بحق صاحب القبر، فخلى عنه“

(پس لوگوں نے امیر المؤمنینؑ سے کہا کہ:

یا ابا الحسن! خدا کا واسطہ! خدا کا واسطہ اور۔ رسول خدا (ص) کی ضرب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ اس قبر والے کی

حرمت کا واسطہ۔ اسے قتل نہ کریں اور اسے چھوڑ دیں۔ تو آپؑ نے خالد کو چھوڑ دیا)

حضرت امیر المؤمنین (ع) کی عمر کو دھمکی:

” ثم التفت الى عمر، فاخذ بتلابيبه“

(اس کے بعد آپؐ عمر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا گریبان پکڑ لیا)
 ”تلایب“ یعنی گریبان، لباس کا وہ حصہ جو گردن کے ارد گرد ہو اس کا مفرد ”تلبیب“ ہے۔
 ”وقال علیه السلام، یا بن صہاک، واللہ لولا عہد من رسول اللہ، و کتاب من اللہ سبق،
 لعلمت اینا اضعف ناصراً و اقل عدداً، و دخل منزله“

(اور عمر کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اے صہاک کے بیٹے! خدا کی قسم، اگر رسول خدا (ص) کی طرف سے عہد نہ ہوتا۔ کہ طاقت کا استعمال نہ کروں۔ اور خدا کی طرف سے اس سے قبل کوئی حکم نہ ہوتا تو تجھے پتہ چل جاتا کہ ہم میں سے کون بے یار و مددگار ہے؟ کس کے پاس افرادی قوت کی کمی ہے؟۔ اس کے بعد۔ آپؐ اپنے گھر تشریف لے گئے)
 حضرت علیؑ جانتے تھے کہ یہ جو ڈرامہ رچایا جا رہا ہے اس کا اصلی کردار عمر ہی ہے اور دراصل یہ عمر ہی تو تھا کہ جس نے ابوبکر کو مشورہ دیا ہے کہ خالد بن ولید کو قتل کی سازش تیار کرے اسی نے آپؐ نے۔ ابوبکر کے بجائے۔ عمر کا گریبان پکڑا اور اس کو عتاب کا نشانہ بنایا (۱)۔

اللہم العن اول ظالم ظلم حق محمد وآل محمد و آخر تابع له علی ذلک
 والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

۱۔ علامہ مجلسیؒ بحار الانوار میں طبع قدیم ج ۸ ص ۹۶ پر لکھتے ہیں کہ، ”ابن ابی الحدید نے ”نقیب“ نامی ایک سنی عالم دین سے پوچھا کہ، لوگ حضرت علیؑ سے کافی دشمنی اور عداوت رکھتے تھے لیکن وہ کونسا سبب تھا کہ جس کی وجہ سے آپؑ کئی سالوں تک ان کے قاتلانہ حملے سے محفوظ رہے اور اپنے گھر میں زندگی گزارتے رہے؟
 ”نقیب“ نے جواب میں کہا کہ، اس کی علت یہ تھی کہ جب اقتدار اس پارٹی کے ہاتھوں چلا گیا تو علیؑ نے سیاست اور اقتدار کی فکر کو اپنی ذہن سے نکال دیا اور ہمیشہ عبادت، نماز اور قرآن کی جمع آوری میں مشغول رہے اور کبھی بعض کاموں میں حکمرانوں کے ساتھ تعاون بھی فرماتے تھے اس طرح جب حکمرانوں نے حضرت علیؑ کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تو انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا ورنہ وہ حضرت علیؑ کو قتل کر دیتے۔۔۔“

